

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فقر القرآن

حدود و تعزیرات
اور قصاص

مؤلف
مولانا عمر احمد عثمانی

ادارۃ فیکس اسلام آباد

کاشانہ حقیقہ ۲۳۰، امیر داس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی - ۲

طبع اول : مارچ ۱۹۸۳ء

طبع دوم : مارچ ۱۹۸۳ء / اپریل ۲۰۰۳ء

مطبع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر : ادارہ فکر اسلامی

کاشانہ حفیظ نمبر ۲۴۰

کارڈن ایسٹ، ایسرداس اسٹریٹ، کراچی

﴿نوٹ از ناشر﴾

پہلی اشاعت میں موجودہ کتاب ”حدود و تعزیرات اور قصاص“ کو فقہ القرآن کی جلد چہارم کے طور پر شائع کیا گیا تھا لیکن اب چونکہ ہم ہر حصے اور ہر جلد کو مستقل عنوان کے تحت شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام جس عنوان سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ متعلقہ کتاب خرید سکیں۔ اور ذہن پر بوجھ نہ رہے کہ جب تک ہم تمام جلدیں نہ خریدیں، تسلسل باقی نہیں رہے گا، لہذا اب یہ کتاب جلد اول نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اپنے عنوان ”حدود و تعزیرات اور قصاص“ کے تحت دستیاب ہوگی۔

ڈاکٹر حبیب الرحمن خان

(صدر ادارہ فکر اسلامی)

دفہرست مشمولات

۶۳	اسلامی حکومت	۸	سرنامہ
۶۸	حد زنا	۹	انتساب
۷۱	پہلی آیت زنا	۱۰	تشکر
۷۱	دوسری آیت زنا	۱۱	عرض ناشر
۷۲	تیسری آیت زنا	۱۲	عرض مولف
۷۳	محضنت کے معنے		حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق علماء دیوبند کی رقم کتاب ۱۶
۷۴	عذاب کے معنے		تعارف کتاب از جناب خالد اسلمی علیہ السلام ۲۳
۷۴	چوتھی آیت زنا	۲۹	کتاب الحدود
۷۷	پانچویں آیت زنا	۳۳	دو سوال اور ان کا جواب
۸۰	باب حد القذف	۳۳	جہالت اور لاعلمی
۸۲	گالی گلوچ	۳۸	پشیمانی اور ندامت
۸۳	تعزیر		جرائم حدود کی شہادت نہ دینا
۸۳	افسانہ افک	۴۴	افضل ہے۔
۸۴	جھوٹی تہمتیں دھرنا	۴۸	حد کا مجرم عادی ہونا چاہیے
۸۹	افک کے معنے	۴۹	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۹۲	شان نزول کی روایات	۵۱	مجبوری کے ماتحت حرام
۹۳	اس سلسلہ میں شان نزول کی تفصیلات	۵۲	مجرم کی ذہنی و جسمانی حالت
۱۰۶	تفہیم حدیث (قرع اندازی)	۵۵	ناگوار فریضہ
۱۱۵	مشرکانہ فال گیری		صحابہ کی طرف سے پردہ پوشی کی
۱۱۶	توہمانہ فال گیری	۵۸	تلقین
	مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں قرعہ	۵۹	مجرم کو انکار کی تلقین
۱۲۳	اندازی کا کوئی اعتبار نہیں	۶۳	ہمارا رجحان

۱۶۹	روایت کا درایتی تجربہ نمبر (۲۴)	۱۲۳	قسطانی اور ابن حجر کا بیان
۱۷۰	نمبر (۲۵) " "	۱۲۸	محمد بن مسلم بن شہاب زہری کی تحقیق
۱۷۲	نمبر (۲۶) " "	۱۲۹	شیعہ اسماء رجال سے
۱۷۵	نمبر (۲۷) " "	۱۳۵	روایت کا درایتی تجربہ نمبر (۱)
۱۸۳	نمبر (۲۸) " "	۱۳۷	نمبر (۲) " "
۱۸۶	نمبر (۲۹) " "	۱۳۹	نمبر (۳) " "
۱۸۸	نمبر (۳۰) " "	۱۴۰	نمبر (۴) " "
۱۹۰	نمبر (۳۱) " "	۱۴۱	نمبر (۵) " "
۱۹۲	شان نزول کی دوسری روایت	۱۴۱	نمبر (۶) " "
۱۹۹	حاکم کی اس روایت پر پہلا اعتراض	۱۴۳	نمبر (۷) " "
۱۹۹	دوسرا اعتراض	۱۴۴	نمبر (۸) " "
۲۰۰	تیسرا اعتراض	۱۴۵	نمبر (۹) " "
۲۰۲	کتاب السرقہ	۱۴۶	نمبر (۱۰) " "
۲۰۷	قطع ید	۱۴۷	نمبر (۱۱) " "
۲۰۷	قطع کے معنی	۱۴۹	نمبر (۱۲) " "
۲۱۰	ید کے معنی	۱۴۹	نمبر (۱۳) " "
۲۱۲	قطع ید کی صورتیں	۱۵۰	نمبر (۱۴) " "
۲۱۴	مختلف روایات	۱۵۱	نمبر (۱۵) " "
۲۱۹	دو قابل غور نکتے	۱۵۳	نمبر (۱۶) " "
۲۲۲	اگر چور گرفتاری سے پہلے تو بکرے	۱۵۵	نمبر (۱۷) " "
۲۲۳	سارق کے لئے معافی کیوں نہیں؟	۱۵۶	نمبر (۱۸) " "
۲۲۳	استثنائ کی مثالیں	۱۵۸	نمبر (۱۹) " "
۲۲۸	دوسری چوری میں بایاں پاؤں کاٹا جائے	۱۶۰	نمبر (۲۰) " "
۲۳۳	باب قطع الطريق	۱۶۲	نمبر (۲۱) " "
۲۳۹	باب القصاص والجنایات	۱۶۵	نمبر (۲۲) " "
		۱۶۶	نمبر (۲۳) " "

۳۰۸	اگر آنکھ نکال دی جائے	۲۴۴	قصاص ام سابعہ میں
۳۱۱	دانت توڑ دینا	۲۵۲	دیت زمانہ قبل از اسلام میں
۳۱۳	ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں	۲۵۷	دیت کی مقدار
۳۱۵	مادون النفس میں شبہ عمدہ نہیں	۲۵۸	دیت کی موجودہ صورت
۳۱۵	عورت اور مرد، آزاد اور غلام،	۲۶۱	القصاص
۳۱۵	اور دو غلاموں میں قصاص	۲۶۹	قتل عمدہ
۳۱۸	کافر اور مسلم میں قصاص	۲۷۱	آزاد آدمی غلام کے بدلے میں
۳۱۸	نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینا	۲۷۲	ذمی کے بدلے میں مسلم
۳۱۸	یا زخم جائفہ پہنچانا	۲۷۳	مستامی کے بدلے میں
۳۱۹	کسی لونچے یا ناقص الیدنے اچھے	۲۷۹	قصاص میں کوئی امتیاز نہیں
۳۱۹	آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا	۲۸۰	بیٹے کے بدلے میں باپ
۳۲۰	قتل عمدہ میں قصاص حق حکومت ہے	۲۸۳	احادیث کا شان نزول
۳۲۳	ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكَ وَرَحْمَةٌ	۲۸۶	اپنے غلام مدبر اور مکاتب کے
۳۲۳	حضرت ابن عباسؓ کی روایت	۲۸۶	بدلے میں
۳۳۱	ورثہ میں سے اگر کوئی معاف کرے	۲۸۹	دوسرے کے غلام کے بدلے میں
۳۳۲	جماعت کسی کو قتل کر دے	۲۹۰	اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو
۳۳۳	کسی فرد نے جماعت کو قتل کر دیا	۲۹۱	مقتول کے ورثہ اگر نابالغ ہوں
۳۳۴	قاتل اگر اپنی موت سے مر جائے	۲۹۲	پانی میں ڈبو کر مار ڈالنا
۳۳۵	دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا	۲۹۳	قصاص میں سزائے موت کا طریقہ
۳۳۶	کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ	۲۹۸	کسی نے ہل مار کے قتل کر دیا
۳۳۶	کسی دوسرے کو بھی گولی لگ گئی	۳۰۰	مختلف اسباب سے موت کا وقوع
۳۳۸	قصاص حضرت عثمان ذی النورینؓ	۳۰۱	جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہو جائے
۳۳۸	رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۳۰۱	کوئی مسلمان پر تلوار سونت لے
۳۳۸	قانون کی بالاتر	۳۰۳	قصاص فیما دون النفس
۳۳۳	قانون کی عملداری احادیث نبویؐ	۳۰۷	پھونچے، کہنی یا بغل سے ہاتھ
۳۳۳	کی روشنی میں	۳۰۷	کاٹ دینا

۳۴۶	حضرت عثمانؓ کے لافانی مناقب	۲۰۲	اصول کافی شیعہ عقائد کی بنیاد پر صحیح ترین کتاب
۳۴۷	بیعت الرضوان کا واقعہ	۲۰۳	امامت کے متعلق شیعوں کے عقائد
۳۵۱	سفارت کیلئے حضرت عثمانؓ کا انتخاب	۲۰۵	امام قائم الزمان آل داؤد کی شریعت کے مطابق حکومت کرے گا
۳۵۳	شان ید اللہ	۲۰۶	یہودی عہد نبوی میں
۳۵۶	قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی	۲۰۷	یہودی اور خلافت صدیق اکبرؓ
۳۵۹	دوسری پیشین گوئیاں	۲۰۷	یہودی اور شہادت عمرؓ
۳۶۲	مزید شہادت	۲۰۸	یہودی اور شہادت عثمانؓ
۳۶۵	حضرت علیؓ کی پوزیشن	۲۰۹	قاتلین عثمانؓ
۳۷۳	حضرت فاطمہؓ کا مطالبہ وراثت	۲۱۳	اندرونی عوامل جو یہودی سازش کے ممد و معاون ہوئے
۳۷۳	مال فتنے رسول اللہؐ کی تحویل میں	۲۲۳	تحریک ابن سبا اور القوت الخفیة
۳۷۴	مملکت کی ملکیت تھا	۲۳۳	کتاب الدیات
۳۷۵	انبیاء کرام قوم سے احمد یا صلے	۲۴۲	شبہ عمد کی دیت کیا ہے
۳۷۵	کے طلبگار نہیں ہوتے	۲۴۲	قتل خطار میں دیت
۳۷۷	ایک سنہری اصول	۲۴۳	دیت عاقلہ پر
۳۸۰	سبائی تحریک	۲۴۸	اجماع کی بحث
۳۸۲	شہادت فاروق اعظمؓ	۲۵۲	دیت کی مقدار
۳۸۳	عہد عثمانی	۲۶۴	اسلامی درہم کا وزن
۳۸۵	عثمانی فتوحات کی وسعت	۲۶۹	عورت کی دیت
۳۸۶	خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت	۲۷۲	کافر کی دیت
۳۸۹	حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک	۲۷۴	اعضا میں دیت
۳۹۰	یہودیوں کی خفیہ تنظیم	۲۷۶	زخموں کے بارے میں
۳۹۷	اسلام کے خلاف یہودی تحریک	۲۷۶	حمل ساقط کر دینا
۳۹۸	ابن سبا کا کردار	۲۷۷	اگر حمل قسط ہو تو ساتھ ہی ماں بھی مر گئی
۳۹۹	ابن سبا کی بدعتیں اور گراہیاں	۳۰۰	شیعی عقائد
۴۰۰	شیعی عقائد	۴۰۲	وصایت کا عقیدہ یہودی کے ماخوذ ہے

۵۹۱	قتل مرتد کا نظریہ کیسے پیدا ہوا	۴۸۰	باب البغاة
۵۹۴	ابتداء اسلام میں ارتداد کے ساتھ بغاوت	۴۸۸	ایک ضروری توضیح
۵۹۶	سادات عقیقہ کی تصریحات	۴۹۰	خلیفہ کی ممانعت کے باوجود
۵۹۷	قتل ارتداد کی نہیں بلکہ بغاوت کی سزا ہے	۵۰۱	مفسدین سے قتال
۶۱۲	مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ كَيْفَ مَعْنَى	۵۰۲	باغیوں کی تحصیل و وصول
۶۱۳	روایات نبویہ میں محاربہ کی شرط	۵۰۲	باب الخوارج
۶۱۹	شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا استدلال	۵۰۲	عہد نبوی اور خلفائے راشدین
۶۲۱	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا استدلال	۵۱۵	کے باغیوں کی تفصیل
۶۳۲	باب الوجه	۵۳۲	خوارج صدیق اکبرؓ
۶۳۲	رحم اصل حد ہے یا تعزیر	۵۳۹	خوارج فاروق اعظمؓ
۶۳۳	النَّوَائِیْةُ وَالزَّانِیَةُ متفقہ طور پر عام ہے	۵۴۰	خوارج عثمان ذوالنورینؓ
۶۳۳	عام کی تخصیص جائز نہیں	۵۴۰	خوارج کون تھے؟
۶۳۷	خبر مشہور سے عام کی تخصیص	۵۴۰	خوارج علیؓ
۶۴۰	خبر مشہور خبر واحد ہی ہوتی ہے	۵۴۷	کتاب التعزیر
۶۴۲	سورۃ نور کا سال نزول	۵۵۱	شراب کی تعزیر
۶۴۳	علامہ محمد سلام مدکور پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی کی تائید	۵۵۳	شراب کا حکم
		۵۵۵	کیا شراب حرام ہے؟
		۵۵۹	شراب نوشی پر حد
		۵۶۲	تعزیر کا مقصد
		۵۶۷	حد نہیں بلکہ تعزیر ہے
		۵۶۹	احکام موقتہ میں
		۵۸۰	لَا اِکْرَآةَ فِی الدِّیْنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سرنامہ

فقہ القرآن کی اس جلد میں حد قذف بیان کرتے ہوئے اقل نامی افسانے کی تردید کی گئی ہے، اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ام المؤمنین سیدہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دامن پر گراتے ہوئے چھینٹوں کو صاف کیا گیا ہے۔ نیز قصاص کی بحث میں خلیفہ مظلوم شہید اعظم خلیفہ ثالث امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے المناک قتل کے قصاص نہ لئے جانے اور تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ قانون کی بالائری برقرار نہ رہنے پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اس لئے ناچیز مؤلف فقہ القرآن کی اس جلد کو حضرت سیدہ کائنات اور حضرت ذی النورینؓ کے حضور بطور نذرانہ عقیدت و اخلاص پیش کرتا ہے۔

عمر احمد عثمانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انتساب

میں قرآن کریم کی اس خدمت کو جو میری نسبت سے نہایت ہی عظیم المرتبت ہے۔ حسب سابق فقہ القرآن کی اس جلد کو بھی اپنے جد امجد حضرت حکیم الامتہ مجدد الملتہ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نیز محدث العصر حضرت الاستاذ الشیخ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شارح موطا و بخاری کے اسماء گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جن کی دعاؤں اور توجہاتِ عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

پر تقصیر و ناکارہ
عبد من عبادہ عمر احمد عثمانی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(تشریح)

من لا یشکر الناس لا یشکر الله

(ترمذی)

میں صمیم قلب کے ساتھ ادارہ فکر اسلامی کراچی کے تمام اراکین خصوصاً ادارہ کے چیرمین اور صدر جناب محترم ڈاکٹر حبیب الرحمن خاں صاحب (ایس۔ ایس۔ ایم۔ ڈی۔ ایف۔ سی سی پی امریکہ) اور ادارہ کے سکریٹری جنرل مولانا قاری طاہر الملکی (ناظم جامعہ مدینۃ العلوم کراچی) کی خدمت میں ہدیہ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں کہ اول الذکر موصوف کی مالی جدوجہد اور ثانی الذکر کے علمی تعاون اور زرین مشوروں سے فقہ القرآن جلد چہارم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

فجزاھما اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

آمین

عمر احمد عثمانی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

(عرض ناشر)

هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ

(یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے سامنے حق بات ہی بیان کرے گی)
فقہ القرآن جلد سوم کو ہدیہ ناظرین کئے ہوئے ایک سال
 ہوا ہے۔ اور اب میں نہایت ہی مسرت اور فخر کے ساتھ چوتھی جلد
 پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جس پر میں حق تعالیٰ کا بقنا
 شکر بھی ادا کروں کم ہے۔ فقہ القرآن کی یہ جلد اسلامی تعزیری قوانین
 پر مشتمل ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ نظام اسلامی کی جدوجہد میں جو آج کل
 ہماری حکومت اور عوام کے پیش نظر ہے ان تعزیری قوانین کی
 بڑی اہمیت ہے۔ ان میں سے کچھ قوانین حکومت نافذ کر چکی ہے
 اور کچھ قوانین زیر ترتیب ہیں۔ اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ یہ جلد
 بھی وقت کی پکار کا موزوں ترین جواب ہے تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔
 اس جلد میں مولانا عمر احمد عثمانی نے اسلامی تعزیریاتی
 قوانین سے بحث کی ہے۔ اس میں سرفہرست وہ قوانین ہیں جو
 اسلامی حدود کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تعزیرات
 سے بحث فرمائی ہے اور حسب سابق اس جلد میں بھی مولانا نے

یہ التزام فرمایا ہے کہ جہاں کہیں انہیں فقہ حنفی سے اختلاف کرنا پڑے وہ فقہائے اسلام میں سے کسی نہ کسی مسلمہ مکتب فکر کی تائید و توثیق سے اپنی رائے اور اپنے استنباط کی صحت کا ثبوت پیش کر دیں تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مولانا موصوف نے کسی تجدد پسندی کا سہارا لیا ہے۔

حسب سابق ضمناً اس جلد میں بھی دو مباحث ایسے آگئے ہیں جو نہایت ہی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور جن کی وجہ سے ملت میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک تو حد قدف کے سلسلہ میں یہ بات مشہور چلی آرہی ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ سیدہ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ منافقتیں اور ان کے زیر اثر کچھ صادق الایمان مسلمانوں نے بھی نشانہ تہمت بنایا تھا جس پر حق تعالیٰ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت میں سورۃ نور میں پورا ایک رکوع نازل فرمانا پڑا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر کسی آدمی کی ماں کے متعلق سچ مچ اس قسم کی تہمت لگادی جائے تو کوئی شریف آدمی اس کا تذکرہ اشارۃً بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس کو کتابوں کی زینت بنا دیا جائے اور اس کا یوں کھلے عام چرچا کیا جائے۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو کیا ہو گیا کہ حضرت ام المؤمنین سیدہ کائنات رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق اس بے اصل اور بے بنیاد بیہودگی کا چرچا ہماری صحاح کی کتابوں میں

بھی خوب شرح و بسط سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں نہ حضرت ام المؤمنین کا اشارہ بھی نام لیا ہے اور نہ کسی اور مسلمان کا۔

مولانا عمر احمد عثمانی نے بخاری کی اس مشہور زمانہ روایت پر درایت و روایت کے نقطہ نظر سے بڑی تفصیل سے بحث فرما کر ثابت کیا ہے کہ یہ روایت قطعاً اس قابل نہیں کہ اس پر ذرا سی توجہ بھی کی جائے۔ جب بخاری جیسی اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کی روایت کا یہ حال ہے تو دوسری کتابوں کی روایات کا آپ خود ہی اندازہ فرمائیں۔

دوسری بحث قصاص کے ضمن میں حضرت امیر المؤمنین خلیفہ ثالث شہید اعظم ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے واقعہ فاجعہ پر فرمائی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں عرصہ دراز سے پھیلانی جا رہی ہیں ان کے جواب کے ساتھ صحیح صورت حال پیش کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں مباحث اس جلد کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین ان دونوں مباحث کو کما حقہ پورے غور و خوض سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

آخر میں میں اپنے پریس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نے فقہ القرآن کی سابقہ تینوں مجلدات کا بڑی عمدہ آرا سے استقبالیہ کیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ حسب معمول جلد چہارم کا بھی اسی طرح خیر مقدم فرمائے گا۔

والسلام مخلص
(ڈاکٹر) حبیب الرحمن خاں۔

(عرض مؤلف)

ایک حقیر و نا کارہ ضعیف البنیان خاکپائے صاحبان علم و عرفان اس رب ذوالمنن کی بارگاہ میں سپاس گزاری کے لئے پیرایہ بیان کہاں سے لائے جس نے اس ذرۂ ناچیز کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ اس کے دین خفیف کی خدمت کے لئے فقہ القرآن جیسی کتاب کی چوہتی جلد ہدیہ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل نسیم صبح تیری مہربانی یہ حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہی تو ہے جس کا میں کسی طرح بھی شکر ادا نہیں کر سکتا کہ اس نے فقہ القرآن کو وہ مقبولیت عطا فرمائی جو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں بھتی کہ لوگوں کا اصرار یہیم ہے کہ فقہ القرآن کی مجلدات کا عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ کتنے ہی لوگوں نے زبانی اور تحریری اعتراف کیا کہ ہم فقہ القرآن کو پڑھنے کے بعد نئے سرے سے مسلمان ہوئے ورنہ اس سے پہلے تاریخ و سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے ہمارا ایمان بالکل ہی متزلزل ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ زبان و قلم سے اظہار کی جرأت نہیں بھتی لیکن قلبی شکوک و شبہات کی وجہ سے معاذ اللہ

معاذ اللہ یوں نظر آتا تھا کہ خدا نخواستہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے دنیا دار فاتحین سے کچھ مختلف نہیں تھے جنہوں نے دوسرے انقلابیوں کی طرح (خاکم بدہن) جزیرہ نمائے عرب میں ایک انقلاب کی دغ بیل ڈالی اور اس انقلاب میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو دوسرے دنیا دار کرتے ہیں۔ یعنی وہ بھی دادِ عیش دینے کے لئے زمانہ کے ایک خاص وقت میں جزیرہ عرب میں پیدا ہو گئے تھے۔ فقہ القرآن نے ان شکوک و شبہات کے سیاہ بادلوں کو یوں صاف کر دیا کہ ہم دولتِ ایمان سے از سر نو مشرف ہوئے۔

ایک عالم و فاضل بزرگ اور شیخ طریقت نے یوں دادِ تحسین و آفرین دی کہ ”عثمانی صاحب آپ نے تو اپنی مغفرت کا پورا سامان کر لیا۔ آپ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی سیرتوں خصوصاً سیدۃ کائنات ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ام المؤمنین سیدہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرتوں سے اس گرد و غبار کو بالکل صاف کر دیا جو معاندین اسلام نے ان کے خلاف ایک منظم سازش کے ماتحت اڑایا تھا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزار۔“

یہ بھی حق تعالیٰ کا کرم ہے یا یہ تو ہے کہ فقہ القرآن کی اشاعت کے بعد بہت سے محققین علمائے حق کو یہ جرأت و جسارت ہونے لگی ہے کہ وہ بھی کھل کر سامنے آنے لگے ہیں اور اسی نہج پر دادِ تحقیق دینے لگے ہیں۔ فقہ القرآن جلد دوم میں میں نے نکاح اور

رخصتی کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر کے متعلق سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس پر جہاں ہمارے کچھ علماء کرام نے ناک بھوں چڑھائی تو وہیں بے شمار اہل علم بزرگوں نے میری ہمت افزائی بھی فرمائی چنانچہ اس بحث کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کچھ درد مند دوستوں نے فرمائش کی کہ اس حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ایک دوست اس کا ترجمہ فرما رہے ہیں جو عنقریب ہدیہ ناظرین کیا جاسکے گا۔

اس سلسلہ میں بڑی اہم اور مسرور کن خبر یہ بھی ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیا زاہد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی یانی پتی سرگودھا (فاضل دیوبند) اور مولانا عظمت اللہ صاحب تفتہمی (فاضل دیوبند) مہتمم مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتم بالشان کتاب سامنے آئی یہ حضرات شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی اس کتاب کا نام ”کشف الغمہ عن عمر اُمّ المؤمنہ“ ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے جن سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صغر سنی پر استدلال کیا جاتا تھا محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی ہے اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا ہے کہ ۱۲۳ھ تک بخاری شریف کی ہشام بن عروہ والی اس روا کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پاگتی ہے۔
 محترم مولانا حکیم نیاز احمد اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ بہ
 ”پہلے خیال تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے کیونکہ اس سے
 احادیث کی صحت پر حرف آئے گا اور منکرین حدیث کو
 تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلہ خیال کیا گیا اکثر
 کی رائے یہی تھی۔ لہذا کتاب کے مسودے میں بار بار ترمیم
 کرنی پڑی۔“

روایت کو پرکھنے کا راستہ بھی خود ہی پیدا کیا۔ منقول ذخائر
 میں اس کے لئے مواد بہت ہی کم ملا۔ جن ہم عصر علماء سے
 مشورہ لیا ان میں سے بعض نے فرمایا کہ جب سابق علماء
 نے کچھ نہیں لکھا تو آپ کو کچھ گڑے مردے نکالنے کی کیا ضرورت
 وغیرہ وغیرہ۔

----- شروع میں تو اپنے اطمینان قلب کے لئے اس تاریخی
 روایت کو دیکھا اور پرکھا۔ مگر اب جب اس روایت پر محنت
 کر کے دیکھا اور شرح صدر ہو گیا تو ارادہ کر لیا کہ اہل علم
 کے سامنے اپنی اس کاوش کو پیش کیا جائے۔ عندالامتحان
 یکر المجل اذ یہاں الخ۔

بہر حال اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے اس عظیم دور کا یہ بڑا ہی
 خوش آئند موڑ ہے جو علمی میدان میں نمودار ہوا ہے کہ اب قدیم انجیل
 علمائے کرام بھی تحقیق کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ یہ احساس کس قدر
 خوش آئند و خوش گوار ہے کہ اس تحقیق کی وادی پر خار و پرخطر میں

یہ فقیر اب تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ہم نفس اور ہم نوا اور بھی اچھے
اچھے لوگ ہیں۔ اللہم زد و فزد۔

فقہ القرآن کی تیسری جلد حقوق و فرائض سے متعلق تھی جس میں
حقوق نسواں کی بحث بھی آئی تھی۔ اس جلد کے شائع ہونے پر
قانون داں پڑھے لکھے طبقوں نے اس کا جہاں شائد طریقہ پر
خیر مقدم کیا وہیں بعض علمائے کرام اور مفتیان عظام نے
سخت اختلاف و مزاحمت کا اظہار کیا اخبارات میں موافق و مخالف
بیانات سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ علمائے کرام کی طرف سے دلیل
کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے حسب عادت سب و شتم اور
فتنہ وی کا بازار گرم ہو گیا۔ طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور طرح
طرح کے القابات سے نوازا گیا۔

متانت و سنجیدگی سے فرو تر غوغا آرائی کا جواب دینا نہ میرے
بس کی بات تھی نہ یہ اہل علم کے طریقہ سے کوئی مناسبت رکھتا تھا۔
البتہ ایک پروفیسر صاحب کے مضمون کا نوٹس لینا پڑا جو روزنامہ
جسارت کراچی کی چودہ قسطوں میں شائع ہوا تھا کیونکہ ان کے
مضمون کا انداز بیان کسی حد تک گوارا تھا۔ الحمد للہ ہمارا جوابی
مضمون بھی اسی روزنامہ جسارت کراچی کی اشاعتوں میں شائع
ہوا۔ اور توفیق الہی شامل حال رہی تو کتابی صورت میں بھی انشاء
شائع ہو گا۔

بحیثیت مجموعی اس جلد نے علمی حلقوں میں بہت اچھا اثر چھوڑا
حتیٰ کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اجلاسوں میں بھی فقہ القرآن کی صدا

بازگشت بار بار سنی گئی اور جا بجا اس کے حوالے دیئے گئے۔ چنانچہ انصار
برنی ایڈوکیٹ کراچی کی پیٹیشن میں کم از کم پانچ مرتبہ فقہ القرآن کا نام
لیا گیا اور اس کے حوالے دیئے گئے۔ اسی پیٹیشن میں جہاں میرے
والد ماجد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز
تصنیف اعلام السنن کے حوالے دیئے گئے وہیں پانچ مرتبہ اس ناچیز
کی کتاب کا نام بھی لیا گیا۔ یہ فخر و سعادت میرے لئے کچھ کم نہیں۔
(ملاحظہ ہو پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۳ء فیڈل شریعت کورٹ ۷۳)

بلبل ہمیں کہ فاقیہ گل شود بس است

کتاب کی یہ مقبولیت حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہے جس کا میں
حقیقۃً شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اللھما سیغ علینا نعمایک ظاہرۃ وباطنۃ وتب
علینا انھ انت التواب الرحیم۔ وتقبل منا انک
انت السميع العلیم

ہمارے علمائے کرام اور مفتیان عظام عورتوں کو ان کے
جائز حقوق دینے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ میں نے
عورتوں کو سروس کرنے کی کھلی چھٹی دیدی ہے۔ حالانکہ یہ چھٹی میں
نے نہیں دی بلکہ خالق کائنات نے خود ہی دی ہوئی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ
مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔ (۴/۳۲)

ترجمہ مردوں کا حصہ اس میں ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں
کا اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

اگر اکتسابِ رزق کی عورتوں کو اجازت ہی نہیں تو اپنی کمائی میں عورتوں کا حصہ کہاں سے ہو گا۔

ہم اپنے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ عورتوں کو زیادہ پڑھانا لکھانا نہیں چاہیے۔ انہیں صرف قرآن شریف پڑھا دو یا بہت سے بہت ہمشتی زیور پڑھا دو۔ لیکن انہیں ہرگز اتنا نہ پڑھاؤ کہ وہ خط لکھ سکیں۔

یقیناً ہمارے یہ بزرگ ہم سے زیادہ سمجھ دار تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر عورتیں لکھ پڑھ گتیں تو پھر انہیں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہو جائے گا اور ہم انہیں دبا کر نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے رؤساء اور جاگیر دار اپنی ریاستوں میں کالج تو بڑی چیز ہے اسکول تک کھولنے کے روادار نہیں تھے کہ رعایا پڑھ لکھ کر ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اور وہ پھر اپنے حقوق مانگنے لگے گی۔ لہذا یہی بہتر ہے کہ انہیں جاہل رکھا جائے۔

لیکن دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی ہم نے یہ غلطی تو کر لی کہ عورتوں کو تعلیم دلوانی لڑکیوں کے اسکول اور کالج کھول لئے اور اب تو عورتوں کی الگ یونیورسٹیاں تک قائم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں عورتوں کو لکھا پڑھا کر ان کا شعور ہم نے خود ہی بیدار کر دیا اور انہیں اپنے شعور کا احساس دلادیا۔ اب اگر عورتیں گھروں میں باندیاں بن کر بلکہ پاؤں کی جوتی بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہو رہیں تو ہم ان کی راہوں میں تنکے کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور غلط قسم کی تاویلات سے ان کے احساس و شعور کو دبانے

چاہتے ہیں۔

ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ جب کسی انسان میں اپنے حقوق کا شعور بیدار ہو جاتا ہے تو اسے دیا یا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ بلاوجہ اسے زبردستی دباتیں گے تو جتنا دباتیں گے اس کا ردِ عمل اتنا ہی شدید ہوگا۔ اور اگر ان میں یغاوت کے جذبات بھڑک اٹھے تو وہ حدود کو بھی پار کر جائیں گی اور ہمارا حشر وہی ہوگا جو یورپین اقوام کا ہمارے سامنے ہے۔

یورپ کے سامنے وحی کی روشنی نہیں تھی۔ انہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی رہنمائی حاصل نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی عقل اور تجربہ کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لہذا افراط و تفریط کا شکار ہوئے اور خاندانی ادارات کا تیا پانچا کر بیٹھے چنانچہ ان کے دانشور اور حکماء آج نوہ کنایاں ہیں کہ یہ ہم نے کیا کر لیا۔ کاش ہم پھر بھیچے کی طرف لوٹ سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کے پاس وحی کی روشنی موجود ہے۔ انہیں اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی حاصل ہے جس نے آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر دی ہیں اور پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ حد بندی کر دی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جتنی حریت اور آزادی عطا فرمائی ہے وہ عورتوں کو دیکھتے اور غلط تاویلات سے ناجائز قدِ عنیں نہ لگاتے ورنہ اگر اسلام اور مذہب کے نام سے ان کے حقوق کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ مذہب ہی سے باغی ہو جائیں گی اور پھر ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو آج یورپ

کا ہو رہا ہے۔

ایک مہربان دوست فرماتے ہیں کہ :-
 ”موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جو عورتیں گھر سے باہر جاتی
 ہیں وہ نیم عریاں لباس پہن کر جاتی ہیں تاکہ ان کے جسم کی
 پوری نمائش ہو سکے۔ مردوں سے دوستیاں بھی کرتی ہیں اور
 تنہائی میں ملاقاتیں بھی۔ اور تفریح بھی۔ کیا فرماتے ہیں وہ
 علماء جو ان تمام غیر اسلامی باتوں کی اجازت دینے کو تیار
 ہیں پانچ فی صد عورتیں بھی نوکریاں کرنے والیوں میں سے
 ایسی نہیں ہیں کہ جو بیوہ، بیکس، لاوارث اور فاقہ زدہ
 ہوں۔ کیا اللہ نے جو پردہ اور حیل کے احکامات قرآن کریم
 میں دیئے تھے ان کو یہ علماء منسوخ سمجھتے ہیں؟“

(ماہنامہ فاران بابہ ماہ اگست ۱۹۸۳ء ص ۷۸)

حقائق و واقعات سے اغماض کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل
 سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ نوکریاں کرنے والیوں میں زیادہ تر ایسی ہی عورتیں
 ہیں جن کے باپ مر گئے۔ بیوہ ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائی چھوڑ
 گئے۔ معاشرہ ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ نوکریاں
 نہ کریں تو پورا گھرانہ فاقوں میں جائے۔ بیشمار لڑکیاں کنواری بیٹھی
 ہیں، ان کی عمریں ڈھیلی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے والدین کے پاس
 لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے جہیز دینے کے لئے نہیں۔ وہ ملازمتیں کر کے
 اپنا جہیز تیار کر رہی ہیں۔ قوم کو اور زعماء و علماء کو اس کا قطعاً
 احساس نہیں کہ اس نازک صورتِ حال کا کوئی علاج سوچے اور اس

حریص اور لالچی سوسائٹی کے خلاف کوئی تحریک چلائے اور اس کے
 ضمیر کو جھنجھوڑے جس نے شادی جیسے مقدس بندھن کو بھی ایک
 کاروبار بنا ڈالا ہے۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہیے کہ رف اندازے
 کے مطابق صرف ایک کراچی شہر میں بارہ ہزار جوان، خوب رو اور
 تعلیم یافتہ لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں کیونکہ ان کے والدین کے پاس
 جہیز دینے کے لئے خطیر رقم نہیں ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک ذمہ دار گورنمنٹ آفیسر میرے پاس
 یہ شکایت لے کر آئے کہ آپ نے فقہ القرآن میں تعدد ازدواج کے
 خلاف بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ لیکن اس وقت کراچی میں بے شمار لڑکیاں
 ایسی بیٹھی ہیں جن کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں وہ ادھیڑ ہو چکی ہیں
 اب انہیں کنوارے لڑکے تو قبول کرنے سے رہے۔ ان کے لئے ضرورت
 ہے کہ جو لوگ صاحب حیثیت ہیں وہ ان لڑکیوں سے دوسری شادی
 کر لیں تاکہ وہ معاشرہ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ اس وقت تعدد ازدواج
 کے خلاف نہیں بلکہ اس کے حق میں مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اللہ
 کے لئے آپ تعدد ازدواج کے حق میں کچھ لکھئے۔ میں اس صورت
 حالات پر اورد کیا کہوں۔ بس اللہ ہمارے معاشرے پر اپنا رحم فرمائے
 اور ہمارے علماء و زعماء کو صحیح صورت حال کو سمجھنے کی توفیق
 عطا فرمائے۔ آمین۔

حقیر و ناکارہ

عمر احمد عثمانی

تعارف کتاب

از جناب خالد ایم اسحق ایڈوکیٹ سپریم کورٹ پاکستان

[فقہ القرآن کی سابقہ تین جلدوں کے تعارف لکھنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل رہی ہے میں چاہتا تھا کہ ”حدود و قصاص“ کے مباحث پر مشتمل اس جلد کا تعارف لکھنے کے لئے کوئی جامع قدیم و جدید شخصیت نصیب ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری یہ آرزو پوری ہوئی اور محترم خالد اسحاق صاحب اس کے لئے تیار ہو گئے۔

خالد اسحاق صاحب ملک کے نامور قانون دان ہیں۔ عربی جاننے کی بنا پر اسلامی قانون کے اصل مآخذ پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ اپنی اسی جامعیت اور دستور اسلامی پر گہری نگاہ کے باعث انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری غالباً پاکستان کی سب سے گراں قدر لائبریری ہے۔ فقہ القرآن کی تصنیف میں بھی اس لائبریری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کاش خالد صاحب کے انتہائی وسیع مطالعہ پر مبنی ان کا گہرا فکر جو ابھی تک علم سینہ کی شکل میں ہے اگر علم سفینہ کی شکل اختیار کر لے تو ملت اسلامیہ متعدد بیش قیمت اور معنویت سے پر کتابوں سے استفادہ کا شرف حاصل کر سکتی ہے۔

یارب این آرزوئے من چہ خوش است طاہر المکی]

مولانا عمر احمد عثمانی کی ذات اپنی علمی و دینی خدمات کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر انہیں مولانا ظفر احمد عثمانی کی

ولدیت کا شرف حاصل ہے تو اس شرف کو خود مولانا نے اپنی دینی خدمات کے ذریعہ اور اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب موضوع 'فقہ القرآن' میں مولانا کی پانچویں کاوش ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتابیں خصوصاً 'الرحیم' اور 'حقوق نسواں' علمی حلقوں میں خاصی شہرت پا چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ دونوں کے موضوعات کا عمر احمد صاحب نے قرآن کی روشنی میں از سر نو جائزہ لیا ہے۔ سالہا سال کیا صدیوں کے تقدس کے غلافوں نے صاحب تصنیف کی تنقیدی نگاہ کو نہیں روکا۔ جہاں بھی مولانا نے تاریخی فقہ کو قرآن سے ٹکراتے پایا ہے وہاں اس مسئلہ کو بہت ہی محنت کے ساتھ دیکھا و پرکھا ہے اور جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض نکات پر اور صاحبان علم کو مولانا کے نتائج سے اختلاف بھی ہو۔ لیکن اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ جہاں بھی مولانا نے مروجہ فقہ سے اختلاف کیا ہے وہاں متعدد کھٹوس دلائل پیش کئے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ائمہ کے بہت سے ایسے اقوال بھی سامنے لائے ہیں جو متداول فقہ میں فراموش کر دیئے گئے تھے یہاں تک کہ بہت سے اذہان میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فقہ اسلامی کی کل کائنات اتنی ہی ہے جتنی متداول فقہ کی کتابوں میں نظر آتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کام عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ موجودہ حالات کا عین تقاضا ہے۔ گزشتہ کم و بیش پانچ سو سال میں فقہ و دستوری مسائل کے سلسلہ میں مسلمانان عالم کی سوچ جمود کا شکار

رہی۔ بہت سے وسیع علاقوں میں اسلامی ناموں والے ایسے بادشاہوں کا دور دورہ رہا جنہوں نے بجائے اسلامی اجتہاد کے اسلامی قانون کو زندگی کے کئی شعبوں سے ہٹا دینے کو زیادہ مفید پایا۔ مسلمان ریاستوں میں بہت سے ایسے قوانین رائج کئے جانے لگے جو شریعت کے ساتھ ساتھ رائج تھے۔ اور قضاۃ کے اختیار سے باہر تھے۔ اس طریقہ سے ان شاہوں نے اپنی قوت کو اخلاق و شریعت کے بندھنوں سے آزاد کرالیا۔ نیک نیت فقیہوں نے بھی فلاح کی راہ یہ دیکھی کہ بجائے اس کے کہ بادشاہوں کے بدکردار اور بے اخلاق کارندوں کے ہاتھوں فقہی ورثہ کا حلیہ بگڑے یہی بہتر ہے کہ اس قیمتی ورثہ کو لے کر الگ ہو جایا جائے۔ اور اچھے وقتوں کا انتظار کیا جائے جب اس فقہ کو دوبارہ بعینہ نافذ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتلا کے زمانہ میں اس کے علاوہ ان نیک لوگوں کے پاس کوئی اور راہ کھلی نہ ہو۔ لیکن اگر ایک شریعت مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک گراں قدر ڈھال ہے وہاں اس کا اصل مصرف ایک ایسی تلوار کا محتاج جس کے ذریعہ حق و باطل کے اصلی فرق کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے نمو کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔ یہ کام مدتوں نہ ہوا۔

صدیوں سے حجروں میں مقید، تصوف سے متاثر ذہنوں کے مشہور فقہی کتابوں پر حاشیے قوت سے محروم قصبوں میں مقید امت کے افراد کے ذاتی مسائل کے حل میں تو کارگر ہو سکتے تھے لیکن حصول آزادی کے بعد نفاذ اسلام کی بنیادی کوششوں میں اتنے مفید

ثابت نہ ہوتے دنیا میں سینکڑوں تبدیلیاں بڑھتی ہوتی تیز رفتاری سے رو پذیر ہو رہی ہیں۔ خیر و شر کی مسلسل جنگ میں کتنی نئے ہتھیار زیر استعمال ہیں جن کے بارے میں آج سے سو سال پہلے سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں تیز رفتار سفر اور ابلاغ عامہ کی کثرت نے دنیا کو سکیر کر رکھ دیا ہے۔ آج کے اہم مسائل گزرے ہوئے ادوار سے یکسر مختلف ہیں۔ کم سے کم زمانی و مکانی اعتبار سے ان حالات میں فقہی مسائل کی ایک نئی تبویب درکار ہے اور بہت سے میدانوں میں جرات مندانہ اجتہاد کی بھی ضرورت ہے۔ کچھ ایسے ہی محرکات کے زیر اثر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

پاکستان اور اس کے علاوہ اور ممالک میں بھی نفاذ شریعت کا عمل جاری ہے اس سلسلہ میں بہت سے پیچیدہ مسائل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک تویہ ہے کہ کیا حدود کی سزاؤں میں کسی قسم کے اضافے یا تخفیف کی گنجائش ہے یا نہیں۔ عمر احمد صاحب اس سوال سے متعلق ایک خاص رائے رکھتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے ابتدائے کتاب ہی میں کیا ہے اور اس کے حوزہ میں عقلاً اور نقلاً قوی دلائل پیش کئے ہیں۔ نیز لفظ ”نکالاً“ کے تعلق سے جو استدلال عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اور مستقبل میں ہماری فقہی تفہیم پر بھرپور انداز سے اثر انداز ہو سکتا ہے کیونکہ حد اگر آخری سزا ہے تو حالات کے مطابق سزا میں تخفیف ہو سکتی ہے۔

حد زنا کی توجیہ میں دیئے ہوئے دلائل پر اضافہ ممکن ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ جن جرائم کی سزا قرآن میں مقرر کی گئی ہے وہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ مثلاً چوری تو ایک

یاد رکھی ہوتی ہے لیکن راتوں کی نیند سینکڑوں کی اڑ جاتی ہے باہمی لگنا کم ہو جاتا ہے اور یہی اعتماد تو بنیاد ہے اخلاق و تمدن کی۔ یہی کچھ صورت زنا کی ہے۔ خاندان و کنبہ اسلامی معاشرے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ زنا، یا شک زنا یا تشہیر زنا باہمی اعتماد و حسن ظن کو مٹا دیتے ہیں۔ سارے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور تمام سوسائٹی تباہی کی طرف سرکنا شروع کر دیتی ہے۔

اس کتاب کا ایک مستحسن پہلو، واقعہً افک کے سلسلہ میں عمر احمد صاحب کی تحقیق ہے۔ علم حدیث کے تمام اصولوں کو برک و کار لاتے ہوئے اس کرب انگیز قصے کی تحقیق کی ہے جو حقیقت میں صاحب کتاب کے لئے تو شر آخرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم علم حدیث کے سنہرے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تاریخی ورثہ کو از سر نو جاچیں عین ممکن ہے کہ ہمیں بہت سی ایسی روایات سے چھٹکارا مل جائے جو لاتعداد نیک نیت مسلمانوں کے لئے نہ اٹھا سکنے والا بوجھ بنی ہوئی ہیں۔

یوں بھی نہیں کہ اس کتاب میں صرف اختلافی مسائل پر گفتگو ہے حقیقت میں جرم و سزا کے موضوع پر یہ ایک بہت جامع کتاب ہے جس میں وہ تمام موضوعات بھی آجاتے ہیں جو اس فقہ اسلامی کی اس صنف سے متعلق ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقوال ائمہ کی اہمیت بہر کیف ثانوی ہے۔ قرآن معیارِ اوّل۔ سنت معیارِ دوم اور اس کے بعد قدر و منزلت واضح دلیل کی ہے کسی اونچے نام کی نہیں۔ یہ کتاب پڑھنے والوں پر احسان اور عمر احمد صاحب کے لئے باعث تحسین ہے۔

کتاب الحدود

حُدُّ ذُوْءِ، حَدٌّ کی جمع ہے اس مادہ کے اصلی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ حَدَّ التَّوَجَّلَ عَنِ الْأَمْرِ، آدمی کو اس معاملہ سے روک دیا۔ منع کرو یا حَدِّ ذُوْءِ فَلَا تَأْعِنِ الشَّرَّ۔ میں نے فلاں کو شر سے روک دیا۔ اَلْحَدَّ۔ رکاوٹ اور روک ہَذَا اَمْرٌ حَدٌّ یہ امر ممنوع ہے۔ اَلْحَدِيْثُ (لوہا) کیونکہ وہ اپنی سمیٹی کی وجہ سے (خصوصاً دشمن سے) روک بن جاتا ہے۔ تیز دھار حَدَّ اس نے دھار کو تیز کیا۔ کیونکہ آلات حرب کی دھار کی تیزی جنگ میں دشمن سے بچاؤ اور رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ (تاج العروس ومحیط)

بہر حال حَدَّ کے معنی روکنے کے ہیں، چند جرائم کی سزائیں حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود متعین فرمادی ہیں، جن کا مقصد ان جرائم کو روکنا ہے۔ اس لئے ان کو حَدَّ کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے بعض جرائم کی جو سزائیں مقرر فرمادی ہیں وہ انتہائی (MAXIMUM) یعنی زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر موقع پر یہی سزائیں دی جائیں۔ عدالت جرم کی

نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات و کوائف پر نظر کرتے ہوئے ان سے کم سزائیں بھی دے سکتی ہے۔ البتہ عام حالات میں انتہائی اور زیادہ سے زیادہ سزائیں جو دی جاسکتی ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن نے مقرر فرمادی ہیں، ہاں اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں اور ان سزاؤں سے بھی جرائم کو روکا نہ جاسکے تو ہنگامی طور پر بطور تعزیر ان سزاؤں میں تشدید کی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جرائم کی نوعیت اپنے خصوصی حالات و کوائف کے ماتحت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ بعض جرائم حالات سے مجبور ہو کر بھی کئے جاتے ہیں، مجرم کی عمر، تعلیم و تربیت، مالی حالات، معاشرہ کے حالات اور دیگر احوال و کوائف سے جرائم کی شدت میں زیادتی اور کمی کی جاسکتی ہے اور تمام حالات میں یکساں سزائیں نہیں دی جاسکتیں۔ اگر قرآنی حدود کو کم سے کم سزا تصور کیا جائے تو آخر مجرم کی نوعیت اگر شدید ترین ہو تو پھر کیا سزا دی جلتے گی، لہذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سزائیں زیادہ سے زیادہ اور آخری سزائیں ہیں جو عام حالات میں دی جاسکتی ہیں۔ اور اگر جرائم کی نوعیت شدید قسم کی نہ ہو تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ سزائیں حالات کے مطابق کمی کر دے، ایک ہی لاکھٹی سے تمام مجرموں کو نہیں ہانکا جاسکتا۔ سرقہ یعنی چوری کی سزا کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جَزَاءٌ مِّمَّا كَسَبَا تَكَالًا مِّنَ الدَّوۡدِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سزا۔ ایک تو ان کے جرم کی جزا یعنی بدلہ ہے اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف

سے دوسرے لوگوں کے لئے سامانِ عبرت بھی ہے وہ سزا جس سے دوسروں کو بھی عبرت دلانا مقصود ہو۔ انتہائی اور آخری سزا ہوا کرتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں اصحابِ سبت کے واقعہ میں بھی یہی نکال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَ فَاوْتَكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۖ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝

(۶۶-۶۵)

ترجمہ :- اور جن لوگوں نے تم میں سے سبت (ہفتہ کے دن) کے سلسلہ میں زیادتی کی تھی ان کا حال تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ، ہم نے اسے اس زمانہ کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لئے عبرت اور تقویٰ شعار لوگوں کے لئے نصیحت بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ اصحابِ سبت کو پہلی مرتبہ سبت کی بے حرمتی کرنے پر یہ سزا نہیں دی گئی تھی، وہ اس کے عادی ہو چکے تھے اور مسلسل اس بے حرمتی کا ارتکاب کئے چلے جا رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں منع بھی کیا تھا، ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی جا چکی تھی۔ جب ان کی اصلاح کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو حق تعالیٰ نے انہیں یہ سزا دی جسے قرآن کریم نے نکال (عبرت) سے تعبیر فرمایا ہے اسی طرح فرعون کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے اسے تبلیغ فرمائی۔ خدا سے ڈرایا، بڑے بڑے معجزات دکھلائے مگر وہ برابر جھٹلاتا رہا اور نافرمانی کرتا رہا۔

ثُمَّ آذَرَ مِثْنَعِي ۝ فَخَسِرَ فَنَادَىٰ ۝ فَقَالَ أَنَا ذُنُوبِي
الْأَعْلَىٰ ۝ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ۝

(۲۲-۲۹)

توجملہ میں پھر وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا۔ اور (موسیٰ کو شکست دینے کی) کوشش کرتا رہا چنانچہ اس نے ملک کے مشہور جا دو گروں کو جمع کیا اور پھر یہ اعلان کیا چنانچہ کہا کہ میں ہی تمہارا سب سے بدتر پروردگار ہوں، آخر خدا نے اسے پکڑ لیا۔ اگلی پھیلی خطاؤں کی عبرتناک سزا کے لئے۔

فرعون نے سا لہا سال تک موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔ ہر طرح آپ کا مقابلہ کیا۔ بار بار قوم فرعون پر مختلف انواع کے عذاب نازل ہوتے رہے جن کی تفصیل خود قرآن کریم نے دے دی ہے آخر میں اسے پکڑ لیا گیا اور دریائے قلزم میں مع اپنی فوج کے عزق کر دیا گیا۔ اس آخری اور شدید ترین سزا کو نکال فرمایا گیا ہے اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ نکال وہ آخری سزا ہوا کرتی ہے جو اس وقت دی جاتی ہے جب پانی بالکل ہی سر سے گزر جائے سرقہ کی حد کے سلسلے میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری اور انتہائی سزا ہوتی ہے جب مجرم کی بازیافت کی کوئی امید باقی نہ رہے لہذا مقررہ حدود وہ آخری

اور انتہائی سزائیں ہیں جو ان جرائم پر دی جاسکتی ہیں۔ بہر حال سول کے قانون میں یہ انتہائی سزائیں ہیں۔ لیکن ہنگامی حالات میں اگر یہ سزائیں بھی کافی ثابت نہ ہوں تو حکومت وقت جیسا کہ ہنگامی حالات میں سول قانون کو معطل کر کے فوجی قانون (مارشل لا) نافذ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اسی طرح وہ ان احکام میں مزید شدت بھی کر سکتی ہے لیکن یہ مستقل قانون نہیں ہوگا۔ ہنگامی حالات جب رفع ہو جائیں تو اصل اور عام قانون پھر سے نافذ ہو جائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زنا کی حد پر ملک بدر کرنے کا اضافہ فرمایا تھا۔ جس کی توضیح ائمہ احناف نے اسے ہنگامی تعزیر کہہ کر کی ہے۔

دوسرا سوال | حدود کے سلسلے میں دوسرے غور طلب ہیں۔ اول تو یہ کہ کیا اسلام میں مقررہ حدود کی یہ حیثیت ہے کہ جہاں مجرم سے جرم صادر ہو اس پر ضرور ہی حد جاری کر دی جائے؟ اور اس میں کسی نرمی یا رورعایت کی گنجائش ہی نہ ہو؟

دوم یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن کریم کی مقررہ حدود زائد سے زائد انتہائی سزائیں ہیں ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے تاکہ موضوع تشنہ نہ رہ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے ذخیرہ احادیث میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ جرم کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے کسی مجرم کو زنا کے جرم میں بجائے سو کوڑوں کے ایک سو ایک کوڑے

مار دیئے ہوں۔ یا قذف کے جرم میں سبجائے انہی کوڑوں کے
 اکیاسی کوڑے دیئے ہوں۔ مقررہ حدود پر ہمیں اضافہ کہیں نہیں
 ملتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اسلامی احکام، مثلاً نماز، روزہ
 وغیرہ ہر مرد، ہر عورت، ہر آزاد اور ہر غلام پر یکساں نافذ ہیں۔
 ایسا نہیں ہے کہ مرد پر پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوں اور عورت
 پر تین وقت کی یا آزاد آدمی پر ایک مہینے (رمضان) کے روزے
 فرض ہوتے ہوں اور ایک غلام و کنیز پر پندرہ دن کے روزے
 فرض ہوتے ہوں۔ لیکن جرائم کی سزا میں آزاد آدمی کو اگر سو
 کوڑے مارنے کا حکم ہے تو غلام اور باندی کو سچاس کوڑے
 مارنے کا حکم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کے پورے
 مواقع جو ایک آزاد آدمی کو حاصل ہوتے ہیں، غلام اور باندی
 کو حاصل نہیں ہوتے۔ نہ انہیں فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل
 ہوتی ہے۔ انہیں اپنے آقا اور مالک کی مرضی کے مطابق ہی عمل
 کرنا پڑتا ہے۔ پھر معاشرے میں ان کا وہ اسٹیٹس بھی (status)
 نہیں ہوتا جو آزاد آدمیوں کا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی خودی بالکل
 دبی ہوئی اور کچلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان میں عزت نفس کا وہ
 شعور بھی نہیں ہوتا جو معاشرہ میں آزاد آدمیوں کو حاصل
 ہوتا ہے۔ لہذا بسا اوقات وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قدرت
 بھی نہیں رکھتے۔

اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ایک آزاد عورت
 کے مقابلہ میں کنیز اپنی عفت و عصمت کی حفاظت پر قطعاً

قدرت نہیں رکھتی۔ یہی حال غلاموں کا ہے۔ غلاموں کے سلسلے
میں تو قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے
سامنے پیش کر دی ہے کہ وزیر خزانہ کی بیوی نے انہیں ورغلانے کی
کوشش کی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کو لغزش سے
بچانے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ساتھیوں سے برملا کہا: ر
لَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ
لَّمْ يَفْعَلْ مَا امْرَأَةٌ يُسْتَجَاوَنَ وَلَيْكُونَ نَارِ الصَّغِيرِ

(۲۲)

ترجمہ: میں نے اُسے اپنے نفس کی حفاظت سے ورغلانا
چاہا تھا تو اس نے اپنی عصمت بچالی۔ لیکن اگر اس نے وہ
کچھ نہ کیا جس کا میں حکم دے رہی ہوں تو وہ یقیناً قید
کر دیا جائے گا اور ضرور ذلیل و خوار ہوگا۔

چنانچہ جو کچھ زلیخا نے کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا اور بارہ سال
تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں رہنا پڑا۔ ہر غلام یوسف
نہیں ہوتا اور نہ ہر غلام سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کنیزوں
کا حال تو اس سے بھی بدتر تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس مجبوری کو
مد نظر رکھتے ہوئے خود ہی ان کی سزا میں تخفیف فرمادی۔ اور ان
کی سزا نصف کر دی۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے کیا گھروں میں کام
کرنے والی خدمت گار عورتوں کے لئے یہی رعایت نہیں ہونی چاہیے؟
ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی یقیناً اس تخفیف و رعایت کی مستحق ہیں۔

جہالت اور لاعلمی | ایسے ہی وہ لوگ بھی اس رعایت کے مستحق ہیں جو تعلیم و تربیت کی کمی کی وجہ سے یا معاشرہ میں موجودہ اور سچ بیچ موجود ہونے کی وجہ سے اس رعایت کے مستحق ہوں۔ چنانچہ ہیشم بن بدر نے حرقوص سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے شکایت کی کہ میرے شوہر نے میری باندی کے ساتھ زنا کیا ہے شوہر نے کہا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ لیکن خود میری بیوی اور اس کا مال میرے لئے حلال ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا جاؤ، مگر آئندہ ایسا نہ کرنا۔ گویا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہالت کی وجہ سے اس سے حد ساقط کر دی۔

اس روایت کو ابن حزم نے محلی (ج ۱ ص ۱۸۸) میں، امام محمد نے کتاب الآثار (ص ۹۱) میں بیان کیا ہے۔

(اعلام السنن ص ۶۲۳-۶۲۴)

نیز امام شافعی، عبدالرزاق اور بیہقی نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ عبدالرحمن بن عطاء رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام غلاموں اور باندیوں کو جو نماز اور روزہ کے پابند تھے آزاد کر دیا تھا ان میں ثوبیہ نام کی ایک کنیز بھی نماز روزہ کی پابند تھی۔ وہ بھی آزاد ہو گئی۔ وہ عجمی کنیز تھی کچھ دین کی زیادہ سمجھ بھی نہیں رکھتی تھی حضرت عبدالرحمن بن عطاء رضی اللہ عنہ کے بیٹے یحییٰ جو اس روایت کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ انہیں ثوبیہ کے حمل نے پریشان کر دیا۔ وہ زنا سے حاملہ ہوئی تھی اور کنواری بھی نہیں تھی۔ وہ پریشانی میں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور سارا واقعہ ان سے بیان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ ”تم کبھی بھی کوئی اچھی بات لے کر نہیں آتے“ گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پیرہ پوشتی نہ کرنے کو ناپسند کیا اور وہ بھی اس سے گھبرا گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثوبیہ کو طلب کیا اور اس سے پوچھا تم حاملہ ہو گئی ہو؟ اس نے کہا ہاں، مرغوش سے حاملہ ہو گئی ہوں۔ اس نے مجھے دو درہم دیتے تھے۔ وہ اس کا علانیہ اقرار کر رہی تھی اور قطعاً نہیں چھپا رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب سے کہا کہ مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو۔ تو حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہما نے کہا اس پر حد واقع ہو گئی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: عثمان! تم اپنی رائے بتاؤ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ آپ کے دونوں بھائی آپ کو مشورہ دے چکے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں تم اپنا مشورہ دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری رائے تو یہ ہے کہ چونکہ وہ علانیہ اقرار کر رہی ہے، گویا وہ جانتی ہی نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اور وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن حد تو اسی پر نافذ ہوتی ہے جو اس کا علم رکھتا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عثمان! تم نے سچ کہا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ واقعی حد اسی پر واجب ہوتی ہے

جو اس کا علم رکھتا ہو۔

(کنز العمال ص ۸۷، اعلام السن ص ۱۱۵)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جہالت اور لاعلمی ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے حدود ساقط کی جاسکتی ہیں۔

پشیمانی اور ندامت ہمیں ایسی متعدد حد شیں بھی ملتی ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مجرم اپنے جرم پر پشیمان اور نادم ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کرے گا۔ آپ نے مجرم کو تنبیہ فرما کر چھوڑ دیا اور کوئی حد جاری نہیں فرمائی۔ اگر حد ایسی سزا ہوتی کہ وہ متعین ہی ہوتی۔ اس میں مجرم پر حد نافذ کرنا ہی ضروری ہوتا اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جاسکتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یوں اللہ کی حد کو ساقط فرما کر مجرم کو معافی دیدیتے چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے حد کا ارتکاب کر لیا ہے۔ لہذا آپ مجھ پر حد قائم فرما دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ وہی بات دہرائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق پھر بھی خاموش رہے۔ اتنے میں نماز کی اقامت ہو گئی تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے

فارغ ہو گئے تو وہ شخص آپ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور میں بھی اس کے پیچھے ہولیا کہ دیکھوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے کیا جواب دیتے ہیں۔ تو آپ نے اس سے فرمایا: بتاؤ تو، جب تم اپنے گھر سے نکلے، کیا تم نے وضو نہیں کیا تھا۔ اور اچھی طرح وضو نہیں کیا تھا؟ اس نے عرض کیا: بے شک اے اللہ کے رسول! پھر آپ نے فرمایا: پھر تم ہمارے ساتھ نماز میں حاضر رہے؟ اس نے عرض کیا: بیشک اے اللہ کے رسول! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو یقیناً اللہ نے تمہاری حد کو بخش دیا (معاف کر دیا) ہے۔ یا یوں فرمایا کہ اللہ نے تیرے گناہ کو معاف فرما دیا ہے۔ یہ روایت ابو داؤد کی ہے اور بعینہم یہی الفاظ صحیح مسلم میں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی روایت مروی ہے۔
(جمع الفوائد ج ۵، کتاب الصلوٰۃ، فضلیہ)

یہ روایت اور اس کے الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ بعینہم ایک ایسی ہی روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام ابو داؤد نے بھی اپنی سنن میں جو صحاح ستہ کی مشہور کتاب ہے۔ نقل فرمایا ہے۔ اسے ضعیف روایت بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ حد نافذ نہیں فرماتے بلکہ ساتھ ہی اس کے جرم کی معافی کی بھی بشارت دے رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک لازمی اور متعین سزا کے متعلق یہ طرز عمل اختیار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ

یہ واقعہ قرآنی حد نازل ہونے سے پہلے کا نہیں ہے بلکہ بعد کا واقعہ ہے۔ کیونکہ مجرم صحابی، اعتراف کر رہے ہیں کہ میں حد کا مرتکب ہو گیا ہوں۔ مجھ پر حد قائم کر دیجئے جو اس کا ثبوت ہے کہ قرآنی حدود نازل ہو چکی تھیں۔ جب ہی تو وہ صحابی حد قائم کرنے کی درخواست فرما رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کی صرف یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ مجرم کا یہ غالباً پہلا جرم تھا اور وہ اپنے اس ارتکاب جرم پر نادم اور شپیمان تھا۔ چنانچہ وہ اعتراف جرم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سزا کے لئے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ایک ایسی ہی روایت مسند بزار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی کسی عورت سے محبت کرتے تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور کسی اہم ضرورت سے آپ سے جانے کی اجازت چاہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ وہ چلے گئے۔ اس وقت بارش برس رہی تھی یکایک ان صحابی کو وہی عورت ایک حوض میں غسل کرتی نظر آئی۔ وہ بیتاب ہو گئے اور اپنے پر قابو نہ رکھ سکے۔ توجہ وہ جماعت کے لئے بیٹھے جیسے ایک مرد عورت کے سامنے بیٹھتا ہے تو پوری کوشش کے باوجود ان کو ایستادگی ہی نہ ہو سکی اور وہ کچھ کر نہ سکے آخر کھڑے ہو گئے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ آپ سے بیان کر دیا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان سے فرمایا: جاؤ، نماز کی چار رکعتیں پڑھ لو۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

اقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ دُرُ لِفَاقِمَنِ الدَّلِيلِ
اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبُنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۳)

ترجمہ: دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں صلوٰۃ کو قائم کرو۔ یقیناً نیکیاں، برائیوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہیں۔

اس قصہ میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ صحابی خوف و خشیت الہی کے ماتحت اگرچہ زنا کے مرتکب نہیں ہو سکے اور حق تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا لیکن وہ ارادہ تو کر چکے تھے۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اقدامات بھی کر چکے تھے۔ وہ اگر حد کے مستحق نہیں تو تعزیر کے مستحق تو یقیناً تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمانے پر اکتفا فرمایا کہ جاؤ، چار رکعتیں نماز کی پڑھ لو۔ (جمع الفوائد ص ۹۶)

ہمارے نزدیک اس کی توجیہ بھی یہی ہے کہ غالباً ان صحابی کا یہ پہلا جرم تھا جو ان سے بیٹابی کے ماتحت سرزد ہو گیا اور ساتھ ہی وہ اس پر سخت نادم اور پشیمان تھے۔ جب ہی تو وہ سارا واقعہ بے کم و کاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیتے اور خود کو سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور توبہ کیا ہوگی؟ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کا خوف اور خشیت پورے کمال کے ساتھ موجود تھی کہ تمام

اسباب و دواعی کی موجودگی میں وہ ارتکاب جرم پر قدرت حاصل نہ کر سکے۔ انہیں اس عورت سے محبت تھی۔ منظر شہوت آگیز تھا، محبوبہ بھی آمادہ تھی۔ وہ اپنے اوپر قدرت دے چکی تھی مگر محض خشیت الہی کے غلبہ کی وجہ سے وہ ارتکاب جرم پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ ان سے زیادہ اس رعایت کا اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مدینہ منورہ کے ایک کنارے پر میں ایک عورت سے ملا اور میں نے اس کے ساتھ بجز جماعت کے سب ہی کچھ کیا۔ اب میں حاضر ہوں میرے متعلق جو آپ کا جی چاہے فیصلہ فرمائیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اگر تو اپنی پردہ پوشی کر لیتا تو حق تعالیٰ نے تو تیری پردہ پوشی فرمائی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آدمی کھڑا ہوا اور چلا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کو روانہ کیا جو اسے بلا لایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے یہی آیت تلاوت فرمائی اِقِمِ الصَّلَاةَ طَوَّافِي النَّهَارِ --- ذَاكِرِيْنِ تَك۔ حاضرین میں سے ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ حکم خصوصیت کے ساتھ اسی شخص کے لئے ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں سب کے لئے ہے۔

(جمع الفوائد ص ۹۶)

یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان صحابی نے بجز زنا کے اور کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر زنا کی حد نہیں تو کیا وہ کسی تعزیر کے بھی مستحق نہیں تھے؟ لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی کچھ نہیں فرمایا بلکہ اقامتِ صلوٰۃ ہی کا حکم دیا ہے۔ اس کی توجیہ بھی اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ آپ نے اس کی توبہ و انابت اور غالباً پہلا جرم ہونے کی بنا پر صرف اقامتِ صلوٰۃ کے حکم پر اکتفا فرمایا کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مجرم کے حالات و کوائف اس کی شرمندگی اور پشیمانی کو مد نظر رکھتے ہوئے سزا کو معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کمی اور تخفیف بھی کی جاسکتی ہے ایسا نہیں ہے کہ جہاں جرم ثابت ہو جائے وہاں آنکھیں بند کر کے ضرور ہی سزا نافذ کر دی جائے۔ ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدود میں سزائیں لازمی اور متعین نہیں ہیں کہ عدالتوں کو ان کا پابند بنا دیا جائے کہ وہ لازماً ان سزاؤں کو نافذ کریں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوالیسرؓ سے نقل کیا ہے کہ میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے آئی۔ میں نے اسے کھجوریں دکھائیں اور اس سے کہا کہ گھر میں اس سے بھی اچھی کھجوریں رکھی ہیں۔ وہ میرے ساتھ گھر کے اندر چلی آئی۔ میں اس پر جھک پڑا اور خوب اس کے بوسے لے۔ پھر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: بہرہ پوشی سے کام لو۔ پھر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے پاس گیا اور ان سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ اپنے جرم کی پردہ پوشی کرو اور حق تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو۔ لیکن مجھ سے صبر نہیں ہوا۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ایک غازی کی بیوی کے ساتھ خوب نیابت کا فریضہ انجام دیا! حتیٰ کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہونے لگی کہ کاش میں اب سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور اب ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس تو تو قطعاً جہنمی ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیر تک سر جھکائے رکھا۔ حتیٰ کہ آپ پر وحی نازل ہوئی **اقْرَأِ الصَّلَاةَ** (آخر آیت تک) آپ نے میرے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو آپ کے اصحاب نے عرض کیا کہ یہ حکم اسی کے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کے لئے عام ہے۔ آپ نے فرمایا: نہیں، سب لوگوں کے لئے عام ہے۔

(بحوالہ جمع الفوائد ص ۹۶)

اس روایت اور اس سے پچھلی روایت میں اس بات کی بھی صراحت ہو گئی کہ یہ رعایت ان دو اشخاص کے لئے مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ قیامت تک آنے والا ہر شخص جو ان کی طرح اپنے فعل پر نادم اور پشیمان ہو اور اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے آمادہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

جرائمِ حدود کی شہادت نہ دینا افضل ہے | اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ

ہے کہ ایک طرف تو مقدمات کے لئے شہادت ادا کرنے کا حکم ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :-
 وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ (۶۵)
 ترجمہ :- شہادت کو اللہ کے لئے قائم کرو۔

اور
 وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبًا (۶۶)
 ترجمہ :- اور شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شہادت کو چھپاتا ہے تو اسی کا دل گنہگار ہے۔

اور
 وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ (۶۷)
 ترجمہ :- اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا کہ اللہ کی طرف سے شہادت اس کے پاس موجود ہو اور وہ اسے چھپائے۔
 لیکن دوسری طرف ہمارے فقہائے کرام نے عمل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھتے ہوئے یہ تصریحات فرمائی ہیں کہ حدود میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

”اگر یہ کہا جائے کہ زنا کے جرم کو قتل سے بھی زیادہ کیوں اہمیت دیدی گئی کہ ثبوت قتل کے لئے تو دو گواہوں کی

شہادت اور ایک مرتبہ کے اقرار ہی کو کافی سمجھ لیا گیا، لیکن زنا میں چار گواہوں کی شہادت سے کم شہادتوں کو اور ایک ہی مرتبہ کے اقرار کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ چار شہادتوں اور چار مرتبہ کے اقرار کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ تو مسلمانوں میں فواحش کے پھیلنے کو قطعاً پسند نہیں فرماتے؟

تو بات یہ ہے کہ زنا میں چار شہادتوں کو اس لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ زنا کے مجرمین کی پردہ پوشی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس جرم کا ستر اور اخفاء ہی حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ سوسائٹی میں فواحش کی اشاعت ہو۔

محقق ابن المہام نے فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ:-
 ”کہ چونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ان جرائم کی پمدہ پوشی پسندیدہ امر ہے اس لئے زنا کی شہادت دینا خلافِ اولیٰ ہوگا۔ لیکن یہ فیصلہ مجرم کی نسبت سے کرنا ہوگا۔ ایسا مجرم جو اس جرم کا عادی نہیں ہے اور نہ اسے کوئی معمولی بات سمجھتا ہے۔ اس کے سلسلے میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے۔ لیکن جب صورتِ حال اس کی عام اشاعت تک پہنچ جائے اور لوگ اسے ایک معمولی بات سمجھنے لگیں بلکہ کچھ لوگ اس جرم پر فخر کرنا بھی شروع کر دیں تو ان حالات میں زنا کی شہادت ادا کرنا اور مجرموں کو کفرِ کردار

تک پہنچانا اس کے چھپانے سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا منشا اور مقصد یہ ہے کہ اس کی زمین معاصی اور فواحش سے پاک و صاف رہے۔ اگر یہ مقصد مفید خطاب (نصائح و تنبیہات) سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں جرم کرنے والوں کی طرف سے توبہ اور ندامت کا اظہار ہو جائے تو اسے ہی اختیار کیا جلتے گا اور انہیں تنبیہ کر کے چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن جب زنا کی گرم بازار ہو جائے اور لوگ اسے معمولی بات سمجھنے لگیں اور اس کے پھیلنے کا خطرہ ہو تو اس وقت اللہ کی زمین کو تنبیہ اور توبہ کے ذریعہ سے پاک رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ لہذا پھر اللہ کی زمین کو پاک رکھنے کا دوسرا ذریعہ یعنی حدود کو قائم اور نافذ کرنا ضروری ہو جائے گا۔
(فتح القدیر ص ۵ مختصراً)

عبدالرزاق اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زنا میں چار گواہ اس لئے رکھے ہیں کہ وہ پردہ پوشی چاہتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے فواحش سے تمہاری پردہ پوشی فرمائی ہے۔ لہذا اللہ نے جو پردہ ڈال دیا ہے اس کے پیچھے کسی کو جھانکنا نہیں چاہیے۔ یاد رکھو اگر حق تعالیٰ چاہتے تو ایک ہی گواہ مقرر کر دیتے جو سچا ہو۔

(کنز العمال ص ۸۶)

اس سے ہمارے اس قول کی تائید ہو جاتی ہے کہ چار گواہوں

کی شرط رکھنے سے مقصد پردہ پوشی ہے (کہ ایسے مقدمات آسانی سے عام طور پر عدالتوں میں پیش نہ ہو سکیں) اس تاثر و ملوث پر ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

(اعلام السنن ج ۱۱ ص ۵۰۵-۵۰۶)

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ حدود کے سلسلے میں مسلمانوں کو یہی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے مجرموں کو حدود سے بچانے کی کوشش کریں۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور فقہائے حنفیہ میں سے محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہا کا خیال یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی ہے۔ اور اسی لئے حق تعالیٰ نے حدود کے جرائم کے ثبوت کے لئے بڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں۔ زنا کا جرم حالانکہ قتل سے زیادہ شدید نہیں ہے اور قتل کا جرم دو گواہوں اور ایک مرتبہ کے اقرار سے ثابت ہو جاتا ہے مگر زنا کے لئے حق تعالیٰ نے چار گواہ یا مجرم کا چار مرتبہ اقرار ضروری قرار دیا ہے۔

حد کا مجرم عادی ہونا چاہیئے | قاضی کو حدود کے سلسلے میں اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہیئے

کہ مجرم عادی ہے یا اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اگر وہ عادی مجرم ہے اور یہ جرم یکے بعد دیگرے اس سے سرزد ہوتا رہا ہے تو اس پر حد جاری کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ عادی مجرم نہیں ہے۔ اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے تو اس کے ساتھ حتی الامکان رعایت برتنی چاہیئے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ | امام ابن حزم نے ”المحلی“ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک چور پیش ہوا اور اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی (یہ میرا پہلا جرم ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمرؓ کے پروردگار کی قسم تو جھوٹ بول رہا ہے۔ پہلے ہی گناہ پر حق تعالیٰ کبھی نہیں پکڑتے۔

ابن وہب نے عبد اللہ بن سمعان سے اسی واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! حق تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ حلیم اور بردبار ہیں کہ وہ اپنے بندہ کو پہلے گناہ ہی میں پکڑ لیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ کو کاٹ دینے کا حکم دیدیا۔ جب ہاتھ کاٹ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اب تک تو نے کتنی مرتبہ چوری کی ہے؟ تو اس نے اقرار کیا کہ اکیس مرتبہ۔

(المحلی ص ۱۵۸)

علامہ ابن حزم نے ایسی ہی ایک روایت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ ان میں ایک مرسل اور دوسری بھی مرسل اور ناقابل اعتبار ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ والی روایت سند کے اعتبار سے

صحیح ہے۔

اس پر شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں :-
 ”میری گزارش یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت
 سے ان دونوں مرسل روایات کی تائید ہو گئی جو حضرت
 ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ اور
 مرسل ہونا ہم حنفیہ کے نزدیک ضعیف کی دلیل نہیں ہے۔
 (حنفیہ کے ہاں مرسل روایات مقبول ہوتی ہیں)

(اعلام السنن ص ۶۷۱-۶۷۲)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدودِ الہی پہلے ہی جرم پر
 نافذ نہیں کرنی چاہئیں بلکہ یہ زائد سے زائد آخری سزائیں ہیں
 جو عادی مجرموں کو دی جانی چاہئیں۔

ان روایات میں مجرم کا یہ کہنا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی
 چوری نہیں کی اور یہ میرا پہلا ہی جرم ہے اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ
 اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا یہ فرمانا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اس
 بات کو ثابت کر رہا ہے کہ پہلے ہی جرم پر سزا نہیں دی جانی چاہیے
 کیونکہ اگر پہلے ہی جرم پر بھی سزا دی جانی چاہیے تھی تو مجرم خود بھی
 اس کا اظہار نہ کرتا اور یہ حضرات بھی بجائے اس کی تکذیب کرنے کے
 صاف صاف فرماتے کہ اس سے کیا ہوتا ہے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں
 کہ تو نے جرم کیا ہے پہلی مرتبہ کیا ہو یا دوسری تیسری مرتبہ تو ہر حال
 میں سزا کا مستحق ہے۔ لیکن یہ سب حضرات ایسا نہیں فرماتے گویا
 وہ اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ واقعی اگر تیرا پہلا جرم ہوتا تو ہم

سزا نہ دیتے لیکن تو اپنے اس قول میں مجبوثا ہے۔ لہذا سزا کا مستحق ہے۔

مجبوری کے ماتحت جرائم | بعض جرائم کسی مجبوری کے ماتحت بھی سرزد ہوتے ہیں۔ مجبوری کے

ماتحت جو حرم سرزد ہو اس کی حیثیت یقیناً وہ نہیں ہوتی جو طمع اور حرص یا عادت کے ماتحت سرزد ہونے والے جرائم کی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قطع ید کی سزا کو معطل فرما دیا تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے بہ سند

ہارون بن اسمعیل عن علی بن المبارک عن یحییٰ بن ابی کثیر عن حسان بن ازہر نقل کیا ہے کہ ابن حدیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے

کھجوروں کا پھل چیرا لینے میں اور قحط سالی کے زمانہ میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس کو ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے اپنی جامع میں

بھی نقل کیا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ”عذق“ کھجور کے پھل کو کہتے ہیں۔

اور ”عام سنۃ“ سے مراد قحط سالی کا زمانہ ہے۔ تو میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ کیا آپ اس کے قائل ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا

”ہاں میری جان کی قسم!“ (التغیص الجبر ۳۵۸)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کا اس سے استدلال فرمانا اس بات

کی دلیل ہے کہ یہ اثر ان کے نزدیک ثابت ہے۔ اگرچہ مجھے حسان بن ازہر کا حال اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملا۔ نیز ابن جدو بھی غیر معروف شخصیت ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر

عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو
کنز العمال ص ۱۱۱۔ (اعلام السنن ص ۱۱۱)

ایسا ہی ایک واقعہ زنا کے سلسلہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے جسے سفیان ثوری نے اعمش سے بواسطہ ابن المسیب نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جسے ایک بے آب و گیاہ میدان میں ایک چرواہا ملا۔ عورت بہت پیاسی تھی۔ اس نے چرواہے سے پینے کے لئے پانی مانگا اس نے پانی پلانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تو مجھے اپنے اوپر قدرت دیدے کہ میں تجھ سے جماع کر لوں تو میں تجھے پانی پلا دوں گا۔ عورت نے اسے بہت اللہ کی قسمیں دیں مگر وہ نہ مانا۔ جب وہ پیاس سے بہت مجبور ہو گئی تو اس نے اسے اپنے اوپر قابو دیدیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ضرورت اور مجبوری کے ماتحت حد ساقط فرمادی۔ اس واقعہ کو عبدالرزاق نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ص ۱۱۲۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلام السنن ص ۱۱۲)

بہر حال ان روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت اور مجبوری کے ماتحت اگر کوئی مجرم سرزد ہو جائے تو سزائے حد جاری نہیں کی جانی چاہیے۔

مجرم کی ذہنی و جسمانی حالت | اسی طرح مجرم کی صحت اور جسمانی اور ذہنی حالت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ حدود کا مقصد جرائم کا انسداد

ہے مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے چنانچہ انصار میں سے ایک صحابی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہو گئے حتیٰ کہ لتے لاغر ہو گئے کہ ہڈی چمڑا لگ گیا۔ اسی حالت میں کوئی انصاری لڑکی ان کے گھر آئی۔ اسے دیکھ کر ان پر شہوت سوار ہو گئی اور انہوں نے ان سے مجامعت کر لی۔ جب ان کی مزاج پر سہی کے لئے کچھ لوگ آئے تو انہوں نے ان سے یہ واقعہ بیان کر کے درخواست کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے متعلق فتویٰ پوچھو، کیونکہ میں نے اس لڑکی سے جو بہمارے گھر میں آئی تھی مجامعت کر لی ہے۔ لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ ہم نے اتنی بیماری جو اسے بے کسی کو نہیں دیکھی۔ اگر ہم اسے آپ کی خدمت میں اٹھا کر لائیں تو اس کی ہڈیوں کی جوڑ جوڑ الگ ہو جائیں گے۔ اس کا ہڈی چمڑا لگ ہو چکا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ سو باریک شاخیں لے کر انہیں ایک مرتبہ اس سے چھو دو۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ (ابوداؤد ص ۲۲)

اسی طرح کی ایک روایت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے ابن حزم نے الحلی میں بیان کی ہے اور کہا ہے کہ سہل بن سعد کی حدیث درست ہے اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد پھر کہا ہے کہ ہم نے اس کی سند کو عمدہ سند پایا ہے جس سے حجت

قائم ہو سکتی ہے۔ المثلث ص ۱۱۵۔

(بحوالہ اعلیٰ السنن ص ۶۱۷-۶۱۸)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کی بیماری اور جسمانی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے سزا میں اس قدر تخفیف فرمادی جو درحقیقت قرآن کریم ہی سے ایک استدلال تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے تذکرہ جلیلہ میں جب وہ کسی بات پر اپنی بیوی رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر یہ قسم کھا بیٹھے کہ تندرست ہونے کے بعد وہ ان کو سو کوڑے ماریں گے۔ ان کی بیوی نہایت نیک، خدمت گزار اور صابر خاتون تھیں۔ انہوں نے بیماری و آزاری میں محنت مزدوری کر کے اٹھارہ سال تک حضرت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری اور خدمت کی تھی۔ جب آزمائش کا زمانہ گزر گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام تندرست ہو گئے تو انہیں اپنی قسم یاد آئی۔ سورہ ص میں اسی واقعہ کے سلسلے میں حق تعالیٰ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا۔

وَحُذِّرْ بِبَيْدِهِ لَخِ ضَعْفًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَطْ
إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا دَعَا الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ

(۳۸/۳۴)

ترجمہ: اپنے ہاتھ میں ایک شاخ لو (جس میں سوتلے ہوں) اس سے انہیں مار دو اور اپنی قسم پوری کر لو یقیناً ہم نے ایوب کو بڑا صابر پایا۔ کتنے اچھے بندے تھے اور یقیناً وہ اللہ کی طرف رجوع ہونے والے تھے۔

جو سزا حق تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ کے لئے تجویز فرمائی تھی بعینہ وہی سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصاری صحابی کے لئے تجویز فرمادی۔ اس روایت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجرم کی جسمانی حالت کے پیش نظر سزا میں بڑی حد تک تخفیف فرمادی تھی لہذا حدود کی سزا میں ایسے حالات میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔

ناگوار فریضہ | حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حدود قائم کرنے میں قطعاً کبھی سرگرمی نہیں دکھائی بلکہ انہیں ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر ہی ادا فرمایا ہے اور ہر ممکن کوشش فرمائی ہے کہ مسلمانوں کو حدود کا نشانہ بننے سے بچایا جائے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ :-

اِدْرَوْا الْحُدُودَ يَا شُبُهَاتِ-

ترجمہ :- حدود کو شبہات کی بنیاد پر ساقط کر دو۔

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، مستدرک حاکم، سنن بیہقی اور جامع صغیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جہاں تک تم سے ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو۔ اگر مسلمان کے لئے خلاصی کی کوئی راہ نکال سکو تو اسے رہا کر دو۔ کیونکہ امام معاف کرنے میں غلطی کر جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی

کر جاتے۔

یہی مضمون حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو۔
(اعلام السنن ج ۱۱ ص ۵۲۱-۵۲۳)

زنگ کے سلسلہ میں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے جنہیں آپ کے حکم سے سنگسار کیا گیا تھا۔ ان کے واقعہ میں حضرت ہزال (ماعز اسلمی کے آقا) کا بیان ہے کہ جب ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کے لئے (مدینہ کے سنگستان) حرّہ کی طرف لے جایا گیا اور ماعزؓ کو پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور وہاں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ عبد اللہ بن انیس صحابی کے سامنے آئے تو چونکہ سنگسار کرنے والے کچھ نہ کر سکے تھے تو عبد اللہ بن انیس نے اونٹ کی ہڈی انہیں ماری اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم نے انہیں چھوڑ کیوں نہ دیا؟ ممکن ہے وہ توبہ کر لیتے اور اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ (ابوداؤد ص ۲۵۸)

التلخیص الجیر (ص ۳۴) میں ہے کہ اس کی سند عمدہ ہے۔ نیز زیلعی (ص ۴۴) میں بھی یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ پشام نے بتایا کہ یزید بن نعیم نے اپنے والد سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جب انہیں (یعنی نعیم کو جن کا لقب ہزال تھا) دیکھا تو فرمایا۔ اللہ کی قسم اے ہزال اگر تم اپنے کپڑے میں اسے چھپا لیتے (یعنی اس کی پردہ پوشی کر لیتے) تو تمہارے لئے اس سے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے۔ تنقیح میں ہے کہ اس کی سند درست ہے۔
(اعلام السنن ص ۵۰۸ ج ۱۱)

اس واقعہ میں آپ کا حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ ”تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا۔ ممکن ہے وہ توبہ کر لیتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا“ اور ہزال رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ ”اے ہزال اگر تم اسے اپنے کپڑے میں چھپا لیتے تو تمہارے لئے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے“ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کا حکم کچھ خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر دیا تھا۔

نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ان قافورات (فواحش) سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اجتناب برتو۔ پھر جس سے کوئی لغزش ہو جائے تو وہ اسے چھپائے۔ اللہ بھی اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور اللہ سے توبہ کرے۔ البتہ جو اپنا چہرہ ہمارے سامنے کرے گا تو ہم اس پر اللہ کی کتاب (کا حکم) نافذ کر دیں گے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے سنن میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الجامع الصغیر ص ۱۱۲ ج ۱ -
(اعلام السنن ص ۵۱۲ ج ۱۱)

نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔
 حدود کی اپنے آپس ہی میں معافی تلافی کر لیا کرو۔ حد کا کوئی مقدمہ میرے سامنے پیش ہوگا تو مجھے اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔
 یہ حدیث حسن ہے۔ (اعلام السنن ج ۱۱ ص ۵۳۶)

صحابہ کی طرف سے پردہ پوشی کی تلقین | آنحضرت صلی اللہ

و تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرات صحابہ کرام برابر کوشش فرماتے تھے کہ مجرم اپنی پردہ پوشی کریں اور خود ہی توبہ کر لیں اور معاملہ حکومت تک نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ حبیب بن ابی فضالہ بیان کرتے ہیں کہ صالح بن کرین نے ان سے بیان کیا کہ وہ اپنی کنیز کو لے کر حکم بن ایوب کے پاس گئے، میں وہاں بیٹھا تھا کہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے۔ وہ بیٹھ گئے تو انہوں نے پوچھا اے صالح! تمہارے ساتھ جو کنیز ہے اس کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہماری اس کنیز نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ اس پر حد جاری کر دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرو۔ اپنی اس کنیز کو واپس کر دو اور اللہ کا خوف کرو۔ اس کی پردہ پوشی کرو۔ میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کر کے رہوں گا۔ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔ ایسا نہ کرو، میری بات مان لو۔ صالح کہتے ہیں کہ وہ برابر مجھ سے یہی کہتے

رہے حتیٰ کہ میں نے ان سے کہا کہ میں اس شرط پر اسے واپس بھیج سکتا ہوں کہ اس پر جو مجھے گناہ ہو گا تو آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ میں نے اسے گھر بھیج دیا۔ اس روایت کو ابن حزم نے محلی (ج ۱۱ ص ۵۸۸-۵۸۹) میں بیان کیا ہے۔

مجرم کو انکار کی تلقین | حتیٰ کہ معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا تھا تب بھی وہ حضرات مجرم کو برسرِ عدالت تلقین کرنے سے نہیں چوکتے تھے تاکہ مجرم کی جان بچ جائے اور حد جاری نہ ہو سکے۔ چنانچہ ابن حزم نے موسیٰ بن معاویہ کی سند سے یزید زعفرانی سے روایت کی ہے کہ ایک مرد اور عورت مراد کے کھنڈرات میں پائے گئے۔ مرد نے عورت کو لہو لہان کر دیا تھا۔ وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ مرد نے کہا کہ یہ میری چچا زاد بہن ہے۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت سے پوچھا۔ تو کیا کہتی ہے؟ لوگوں نے عورت سے کہا کہ ہاں کہہ دے۔ چنانچہ عورت نے ہاں کہہ دیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے حد ساقط کر دی۔ (محلی ص ۲۴۲)

عبدالحسن بکالی نے بھی ادریس بن یزید اودی کی سند سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ کنز العمال ص ۹۶ میں بیان ہوا ہے۔ (اعلام السنن ج ۱۱ ص ۶۵۵-۶۵۶)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اسی مضمون کی متعدد روایات نقل فرمائی ہیں جن میں سے ہم صرف چند روایات نقل

کرتے ہیں۔ مثلاً

ابن جریر کا بیان ہے کہ میں نے عطار بن ابی رباح (مشہور تابعی) کو کہتے ہوئے سنا کہ جو حضرات (صحابہ) گزر چکے ہیں ان کے سامنے چور کو لایا جاتا تھا تو وہ اس سے کہتے تھے۔ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں! اور انہوں نے خصوصیت سے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا۔ اسے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو التلخیص الجبرج ۳۵۷ ج ۲)

(اعلام السنن ۵۲۲ ج ۱۱)

نیز معمر نے طاؤس سے، انہوں نے عکرمہ بن خالد سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا، کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ نہیں! چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ ”نہیں“ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا۔ اسے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے دیکھئے التلخیص الجبرج ۳۵۷ ج ۲۔ اس کے رجال (راوی) صحیحین کے راوی ہیں۔ البتہ عکرمہ ابن خالد کا سماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ (اعلام السنن ۵۲۲ ج ۱۱)

نیز حماد نے ابراہیم (دخنی) سے نقل کیا ہے کہ ابو مسعود انصاری صحابیؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش ہوئی جس نے ایک اونٹ چرا لیا تھا تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا۔ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ ”نہیں“۔ سفیان ثوری نے اسے اپنی جامع میں بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو التلخیص الجبرج بحوالہ سابق)

اس اثر کو نقل فرما کر علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”میں کہتا ہوں کہ اس کی سند‘ استدلال کرنے کے قابل ہے اس کے باوجود کہ ابراہیم (نخعی) کی ملاقات ابو مسعود انصاریؓ سے ثابت نہیں۔ کیونکہ یہ انقطاع ہمارے نزدیک مضر نہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ابراہیم نخعی کی مراسیل صحیح ہی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب الحج میں گزر چکا ہے۔ (اعلاء السنن ص ۵۲۳)

نیز یہ روایت بھی کہ ہمیں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ ہم سے ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے اپنے والد سے حدیث بیان کی انہوں نے یزید بن کبشہ سے کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک حبشی کنیز پیش کی گئی کہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ ان دنوں دمشق میں قضا پر متعین تھے۔ انہوں نے کہا: اے سلامہ! کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ ”نہیں“ اس نے کہہ دیا کہ ”نہیں“۔ لوگوں نے کہا: اے ابو درداء! تم اسے تلقین کر رہے ہو؟ (یعنی جواب سکھایے ہو) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں۔ تم میرے پاس ایک ایسی عورت کو لائے ہو جو بے چاری نہیں جانتی کہ تم اس کے متعلق کیا اسادہ کر رہے ہو کہ میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔ اسے امامؒ نے کتاب الآثار (ص ۹۳) میں نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی سند ایسی ہے جس سے حجت پکڑی جا سکتی ہے۔ اور راوی اس کے سب ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن ص ۵۲۳ ج ۱۱)

نیز ابن ابی شیبہ نے ابو المتوکل کی سند سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا۔ وہ ان

دنوں امیر تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ ”نہیں“ دو یا تین مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے یہی کہا۔ ملاحظہ ہو التلخیص الجبرج ۳۵۴ (اعلاء السنن ۵۳۳ ج ۱۱)

ان تمام روایات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مجرموں کو برسر عدالت جبکہ ان کے سامنے ان کے مقدمات پیش ہیں خود تلقین فرما رہے ہیں کہ تم جواب میں انکار کر دو۔ یعنی تاکہ ہم تم پر حد جاری نہ کر سکیں۔ حالانکہ قاضی کو عدالت میں دیگر جرائم میں اس قسم کی تلقین کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد حدود کو نافذ کرنے کے بجائے ملزم کو رہائی دلانا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم مجرموں پر حد جاری کریں۔ صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسی کوششیں نہیں فرمائیں بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی متعدد موقعوں پر نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے بھی مجرموں کو معاف فرمادیا اور حد وغیرہ جاری نہیں فرمائی یا حد میں کافی تخفیف فرمادی اس قسم کی روایات جو زیادہ تر معیین یا صحاح ستہ کی ہیں ہم شریعہ میں پیش کر چکے ہیں۔

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حدود کے معاملات کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ ہمیں ان حضرات کی طرف سے ان جرائم کے اثبات اور حدود قائم کرنے میں کوئی بھی سرگرمی اور ذوق و

شوق نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاکتوں جن مجرمین پر حدود قائم کی گئی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے بادلِ ناخواستہ ہی حدیں قائم فرمائی ہیں۔ ان کی طرف سے کسی ایک واقعہ میں بھی ہمیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کسی ذوق و شوق اور اشتیاق کا اظہار فرمایا ہو۔

ہمارا رجحان | لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور ہمارے عوام کا رجحان یہی ہے کہ

وہ اسی کو اسلامی حکومت سمجھتے ہیں جس میں حدود کا نفاذ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہو۔ چنانچہ جب مسلمان مملکتوں کا تذکرہ چھڑتا ہے تو ہم بے تکلف ہر مملکت کو مسلمان مملکت کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کسی ایک کو بھی نہیں کہتے۔ لے دے کر بڑی مشکل سے ہم سعودی عرب کی حکومت کو اسلامی حکومت کے لقب سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں اسلامی حدود نافذ ہیں۔ ہماری موجودہ مثال لا حکومت نے حدود کے نفاذ کا اعلان کیا تو ہمارے علماء کی طرف سے اس کی زبردست حمایت کے اعلان کئے گئے اور بعض حلقوں کی طرف سے برملا اظہار کیا گیا کہ اب ہماری حکومت اسلامی حکومت بن گئی ہے۔

اسلامی حکومت | قرآن کریم نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف و توصیف فرمانے

کے بعد اسلامی حکومت کے جوہر و خال بیان فرمائے ہیں ان میں سرپرست اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ کو رکھا ہے۔ سورۃ حج میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

الَّذِينَ لَا تَمْلِكُهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَأَتَوْا الزَّكَاةَ وَآمَنُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا
عَنِ الْمُنْكَرِ ط (۳۲)

ترجمہ :- جنہیں اگر ہم نے زمین میں تمکن عطا فرمادیا
تو وہ صلوٰۃ قائم کریں گے ، زکوٰۃ دیں گے ، نیک کاموں کو
فروغ دیں گے اور برائیوں کو روکیں گے۔

اس آیت مقدسہ میں اسلامی حکومت کی چار خصوصیات
بتائی گئی ہیں۔ سب سے اہم اور سب سے پہلی خصوصیت اقامت
صلوٰۃ بیان کی گئی ہے۔ صلوٰۃ بڑھنا نہیں بلکہ صلوٰۃ کو قائم کرنا۔
اسلام میں صلوٰۃ ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں پورا اسلامی نظام
آجاتا ہے۔ یہ وہ نگینہ ہے جس میں پوری مملکت سموتی ہوئی ہے۔
اس میں پورا اسلامی نظام جھل جھل کر رہا ہے۔ یہاں تفصیل
کا موقع نہیں۔ مختصراً اتنا سمجھئے کہ مساوات انسانی اور عدلِ عمرانی
اس کی پہلی منزل ہے۔ ہمارے ملی شاعر نے شاید لا شعوری طور
پر ہی کہہ دیا ہے :-

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ مصاف زندگی میں بندہ اور بندہ
نواز کا فرق مٹ جائے صرف مسجد میں پانچ منٹ کا مظاہرہ یعنی
ہے۔ فکر و عمل کی مکمل ہم آہنگی اور یک جہتی اقامتِ صلوٰۃ کا دہرا

سبق ہے۔ ڈسپلن اور مکمل اطاعت اس کا تیسرا سبق ہے۔ وغیرہ
 وغیرہ۔ ان مقاصد کی نمود ہماری پوری زندگی میں ہونی چاہیے۔ یہ
 نہیں کہ اس کی نمائش صرف ہماری مسجدوں تک محدود ہو کر رہ
 جائے۔ جب تک عملی زندگی میں قدم قدم پر مقاصد صلوٰۃ کا مظاہر
 نہ ہو اور ہم اس کے مطابق اپنی پوری زندگی نہ ڈھال لیں اقامت
 صلوٰۃ کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے اَقَامُوا الصَّلٰوۃ کے
 معنی یہ کر لئے ہیں کہ وہ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ اس پر بڑا زور دیا
 جاتا ہے کہ نمازیں پڑھی جائیں۔ جو کام کرنے کے تھے انہیں ہم نے
 کرنے کے بجائے پڑھنا بنا لیا ہے اور ہم بالکل مطمئن ہیں کہ ہم دین
 کے تقاضوں کو صحیح صحیح پورا کر رہے ہیں۔ یہی کچھ ہم نے قرآن کریم
 کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ کتاب عظیم اس لئے نازل
 فرمائی تھی کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو
 اس کے مطابق ڈھال لیں مگر ہم نے عمل سے چھٹکارا حاصل کرنے
 کے لئے اسے پڑھنے کی ایک کتاب بنا لیا ہے۔ خیال تو فرمائیے کہ
 سربراہ مملکت کی طرف سے آپ کے پاس کوئی ہدایت نامہ آئے
 کہ فلاں فلاں کام اس طرح انجام دیدو۔ لیکن ہم ان ہدایات
 پر عمل کرنے کے بجائے روزانہ اس ہدایت نامے کو آنکھوں سے
 لگا کر اور جوم چاٹ کر بڑی ترتیل و تجوید سے اس کی تلاوت کر لیا
 کریں تو کیا ہم اس طرح اس ہدایت نامہ کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔
 یہی صورت ہم نے اَتُوا الزَّكٰوۃ کے ساتھ کی ہوئی ہے کہ سچا
 قوم کے نادار اور معذور افراد کی نشوونما کا سامان ہم پہنچانے

اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے چند سکے ان کی جھولی میں ڈالنے کو ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے ایتار زکوٰۃ کا فریضہ ادا کر دیا۔

تیسری اور چوتھی خصوصیت کے ساتھ بھی ہم نے یہی مذاق کیا ہوا ہے۔ بنیادی چیز حریت و مساوات انسانی اور عدلِ عمرانی کو قائم کرنے کے بجائے محض چند رسمیں ادا کر دینے کو ہم نے اسلامی نظام سمجھ لیا ہے۔

یاد رکھتے جب تک آپ عدلِ عمرانی قائم نہیں کرتے اور امیر و غریب کا فرق ختم نہیں کرتے اسلامی نظام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ کو چوتھے درجہ میں رکھا ہے مگر ہم نے اسے اول درجہ دیدیا ہے۔ قیامِ حدود کا تعلق نہیِ عن المنکر سے ہو سکتا ہے۔ لہذا اس کا چوتھا درجہ تھا۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ اور ایتلے زکوٰۃ کا پہلا اور دوسرا درجہ تھا جو ہماری نگاہوں سے قطعاً اوجھل ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے کرنے کا کام مساوات انسانی اور عدلِ عمرانی کا قیام ہے۔ پہلے تو آپ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کے لئے چوری کرنے کا جواز ہی نہ رہے۔ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی جنسی خواہشات جائز طور پر پوری ہو سکیں۔ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی عزت و آبرو محفوظ ہو جائے اور کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس کے بعد حدود کا نفاذ کیجئے۔

لیکن موجودہ حالات میں جبکہ لوگ نانِ شیینہ کو محتاج ہوں مہنگائی، گرمائی، چور بازاری عام ہو، جوان لڑکیوں کا نکاح جوئے شیر

لانے سے کم نہ ہو۔ عزت و ناموس کوڑیوں کے مول بازاروں میں
 نیلام ہو رہی ہو۔ آپ حدود نافذ کر کے اپنے دل کو جھوٹا اطمینان
 تو دلا سکتے ہیں کہ ہم نے اسلامی نظام قائم کر دیا مگر حقیقت کا اس سے
 دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

لے یہ ہمارے معاشرہ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ صرف کراچی شہر میں
 نوجوان، تعلیم یافتہ، خوبرو لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ انہیں بر نصیب
 نہیں ہو رہا کیونکہ ان کے ماں باپ کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نہیں
 ہے جس سے وہ اپنی بچیوں کا معمولی جہیز تیار کر سکیں۔ ان حالات میں اگر
 بے راہ روی کی صورتیں ظہور پذیر ہوں تو کیا تعجب ہے۔ کیا ان حالات میں
 حدود کا نفاذ عدل عمرانی کا تقاضا ہے؟

(مؤلف)

حذرنا

زنا | اسلام کی نظر میں زنا انتہائی شدید جرم ہے۔ مال
 جان، اور آبرو ہر انسان کی متاعِ حیات ہوتی ہے۔
 ہر شریف آدمی کے نزدیک ان کی ترتیب بھی یہی ہے۔ مال عزیز ترین
 متاعِ حیات ہے لیکن اسے جان کی حفاظت کے لئے قربان کیا جاسکتا
 ہے کیونکہ جان مال سے زیادہ قیمتی چیز ہے لیکن عزت و آبرو کی
 حفاظت کے لئے جان کا نذرانہ پیش کیا جاسکتا ہے اور پیش کیا
 جاتا ہے کیونکہ سب سے اعلیٰ متاعِ حیات انسان کی عزت و آبرو
 ہی ہوتی ہے۔ زنا کا جرم انسان کی عزت و آبرو پر حملہ ہوتا ہے
 اس سے آدمی دوسرے کی عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اسے
 لوٹ لیتا ہے جو انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اسلام نے اس کی سزا
 بھی اتنی ہی شدید رکھی ہے جتنا جرم شدید ہے۔ چنانچہ سورۃ النور

میں ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي فِئ
دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَلَيْشَهِدَ عَمَّا بِهِمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○

(۲۴)

توجہ۔ ہر زنا کار عورت اور زنا کار مرد ان میں سے
ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور تمہیں ان دونوں پر کوئی
ترس نہ آنا چاہیے اللہ کے دین میں۔ اگر تم واقعی اللہ اور
یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان دونوں کی اس سزا کا
مسلمانوں میں سے ایک گروہ مشاہدہ کرے۔

یعنی یہ سزا مجمع عام میں دی جائے کہیں چھپ چھپا کر نہ دی
جائے۔ کیونکہ مقصد صرف ان لوگوں کو سزا دینا ہی نہیں ہے بلکہ
لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کرنا بھی ہے عبرت و
موعظت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ سزا سب لوگوں کے سامنے
مجمع عام میں دی جائے اسلام چاہتا ہے کہ اس جرم کی جڑ ہی کٹ
جائے اور کسی کو آئندہ اس شنیع جرم کے ارتکاب کی جسارت
ہی نہ ہو سکے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي (ہر زنا کار مرد اور زنا کار عورت)
بالکل واضح الفاظ ہیں ان دونوں پر الف و لام استغراق کا ہوا جس
کا، ہر اس شخص کو اپنے تحت لے آتا ہے جس سے زنا کا ارتکاب ہوا

ہو جو ان آدمی زنا کرے، ادھیڑ آدمی زنا کرے، بوڑھا آدمی زنا
 کرے، کنوارا آدمی زنا کرے یا شادی شدہ آدمی زنا کرے سب
 کو زانی ہی کہا جاتا ہے اسی طرح ہر عورت جو ان، ادھیڑ، بوڑھی،
 کنواری اور شادی شدہ جو بھی زنا کی مرتکب ہو وہ ذانیۃً ہی
 کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر زنا کار عورت اور ہر زنا کار مرد کی
 سزا بیان فرمادی ہے اور اس میں سوائے شادی شدہ کنیز کے جو زنا
 کی مرتکب ہو (اور جس کی سزا ۴۰ میں بیان فرمادی گئی ہے) کسی قسم
 کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی گئی نہ کسی قسم کا کوئی استثناء فرمایا گیا
 ہے لہذا قرآن کریم کی رو سے ہر زنا کار کی سزا (سوائے شادی شدہ
 لونڈی) کے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہر دو صورتوں
 میں ستودرے مارنا ہے، زنا کی سزا کے سلسلے میں قرآن کریم میں جتنی
 آیتیں آتی ہیں ان سے اگرچہ رحم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن تمام
 فقہائے اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ زنا کرنے والی عورت اور
 زنا کرنے والا مرد اگر کنوارے ہوں تو ایک سو درے کی سزا دی
 جائے گی۔ لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں دس
 (سنگسار) کیا جائے گا۔ تا آنکہ وہ مرجائیں۔ البتہ خوارج، معتزلہ،
 بعض زیدی شیعہ اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رحم کا انکار کیا ہے۔
 نظام التجریم والعقاب فی الاسلام ص ۱۸۱۔ اس کتاب کی اہمیت
 اور اس کے مزید کچھ حوالے آگے آرہے ہیں فتح الباری ص ۱۲۶ و
 نیل الاوطار باب الرحیم

ہم ان حضرات کی تائید نہیں کرتے جو رحم کا قطعاً انکار کر دیتے

ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ رجم قرآنی حد ہے۔ ہم رجم کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن قرآنی حد کی حیثیت سے نہیں بلکہ تعزیر کی حیثیت سے۔ مملکت اسلامی زنا کی سزا رجم یا رجم سے بھی زیادہ بطور تعزیر کے دینا چاہے تو وہ دے سکتی ہے۔ تاہم رجم ہمارے نزدیک قرآنی حد نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں زنا کے متعلق۔ (۱) پہلی آیت تو وہی سورۃ النور کی مشہور آیت ہے۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
مِائَةً جَلْدَةٍ۔ (۲۲)

ترجمہ: ہر زنا کار عورت و مرد کو، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس میں الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي کلمہ عام ہے جس میں ہر زنا کار شامل ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، پھر دونوں پر الف لام استغراق یا جنس کا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا عموم اور بھی صریح ہو گیا ہے جسے اصول فقہ کے مطابق خاص نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ خاص کر لینے کے معنی اس کے عموم کو منسوخ کر دینے کے ہیں جو خبر واحد سے جائز نہیں۔

(۲) اس سے اگلی آیت میں ہے۔

الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحَرِّمَ ذَلِكَ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ ○ (۲۳)

ترجمہ: اور زنا کار مرد نہ نکاح کرے مگر زنا کار یا مشرک عورت سے اور زنا کار عورت سے سوائے زنا کار

یا مشرک مرد کے کوئی اور نکاح نہ کرے۔ مسلمانوں پر یہ حرام کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں بھی اَلْزَّانِيَةُ اور اَلْزَّانِفُ کلمہ عام ہے اور دونوں پر الف لام استغراق یا جنس کا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا عموم دو آتشہ ہو گیا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی زنا کار مرد بجز زنا کار اور مشرک عورت کے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی زنا کار عورت سے بجز زنا کار اور مشرک مرد کے کوئی دوسرا مرد نکاح نہیں کر سکتا۔ یعنی زنا کار مرد اور عورت زنا کے بعد اس کی بھی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی سے نکاح کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہیں۔ سنگسار کر کے قتل کر دینا نہیں ہے۔ کیونکہ سنگسار کر کے قتل کر دینے کے بعد اس کا امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی زنا کار مرد و عورت کسی سے نکاح کر سکیں۔

(۳) تیسری آیت سورۃ نسا میں باندیوں کے متعلق آئی ہے کہ اگر وہ زنا کی مرتکب ہوں۔

فَاِذَا اُحْصِنَتْ فَاِنْ اَتَيْنِ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ
نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (۲۴)

ترجمہ: توجہ وہ شادی شدہ ہوں تو اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف واجب ہے جو شادی شدہ آزاد عورتوں پر ہوا کرتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ محصنہ (آزاد شادی شدہ عورتوں) کو جتنی سزا دی جاتی ہے اس سے آدھی سزا کنیزوں کو دی جائے گی۔ یعنی مُحْصَنَاتُ عَوْرَتُوں (شادی شدہ آزاد عورتوں) کی سزا ایسی ہوتی ہے جسے آدھا کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحم کی سزا کو تو آدھا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لامحالہ ان کی سزا سو درے ہی ہونی چاہیے کہ ان کے نصف یعنی پچاس درے ان کنیزوں کو لگاتے جاسکیں۔ چنانچہ تمام فقہائے امت متفقہ طور پر کنیزوں کے متعلق یہی فرماتے ہیں کہ ان کی سزا پچاس درے ہوتی ہے۔ لہذا یہ آیت بھی دھم کی نفی فرما رہی ہے۔ کیونکہ دھم کی سزا کو آدھا کر لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس آیت کے مطابق مُحْصَنَاتُ کی سزا ایسی ہونی چاہیے جسے آدھا کرنا ممکن ہو۔

مُحْصَنَاتُ کے ہمارے علمائے کرام کے نزدیک بھی تین معنی ہو سکتے ہیں (۱) شادی شدہ عورتیں (۲) پاک دامن عورتیں (۳) خاندانی وجاہت کی وجہ سے محفوظ و مامون عورتیں اس آیت میں اس کے معنی پاک دامن عورتیں تو ہونہیں سکتے کیونکہ یہ عورتیں سزایاب ہیں۔ لامحالہ اس کے معنی یا تو شادی شدہ عورتوں کے ہوں گے یا خاندانی صاحب وجاہت عورتوں کے ہوں گے جو اپنی ذاتی شرافت و وجاہت سے محفوظ و مصئون ہوں۔ اگر شادی شدہ عورتوں کے معنی ہوں تو ثابت ہوا کہ ان کی سزا قرآن سے رجم نہیں ہے بلکہ سو کوڑے ہے۔ کیونکہ اسی کو نصف کرنا ممکن ہے۔ اگر تیسرے معنی یعنی خاندانی صاحب

وجاہت عورتوں کے لئے جائیں تب بھی خاندانی صاحب وجاہت عورتیں کنواری بھی ہوتی ہیں اور شادی شدہ بھی۔ ایسا تو نہیں ہے کہ خاندانی وجاہت صرف آزاد کنواری عورتوں ہی کو حاصل ہوتی ہو اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں اس سے محروم ہوتی ہوں۔ لہذا اس آیت سے پھر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کنواری اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتوں کی دونوں کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔ رجم نہیں ہے۔ کیونکہ سو کوڑوں ہی کو نصف کر لینا ممکن ہے۔ رجم کی سزا کو نصف کر لینا ممکن نہیں ہے۔

(۴) عَذَابٌ عَرَبِيٌّ زَبَانٍ میں اس اذیت اور تکلیف کو کہتے ہیں جو بطور سزا کے کسی کو دی جائے۔ یہ اذیت اور تکلیف مار پیٹ کی شکل میں ہوتی ہے قتل کی صورت میں نہیں ہوتی۔ عَذَابٌ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہوتی ہیں (۱) پانی کی خوشگوار اور شیرینی جو پیاس کو روک دے (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہو جاتی ہے۔ اور (۳) بندش منع کرنا اور رکاوٹ۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ۔

خلیل نے بیان کیا ہے کہ عَذَابٌ ثَلَاثَةٌ تَعَذُّبٌ مَعْنٰی ہیں۔ میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا۔ یہ امثال کے باب سے ہے یعنی کھانے پینے سے روک دینا۔ اس کے دوسرے معنے جو پہلے معنے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے، عذاب ہیں۔ کہا جاتا

ہے عَذَّ بَشْتُهُ تَعَذَّيْتُہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ اصل عذاب مارنا پیٹنا ہوتا ہے۔ زہیر کا شعر ہے ۵

وَحَلَفْنَا سَائِقٌ يَمُودُ إِذَا أَخْشَيْتَ
مِنْهُ الْعَذَابَ تَمُدُّ الصَّلْبَ وَالْعُنُقَا

ترجمہ ۵۔ اس کے پیچھے اس کو ہانکنے والا ہڈی پڑھ رہا ہے۔ جب اسے اس کی مار پیٹ کا اندیشہ ہوتا ہے تو کمر کی ہڈی اور گردن کو دراز کر لیتی ہے۔

(ابن فارس ص ۳۱۲ مطبوعہ دار احیائے الکتب العربیہ عیسیٰ

البابی الحلبي، مصر)

امام راعب نے کہا ہے کہ عَذَّ بَشْتُهُ کے معنی ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگوار یوں سے محروم کر دیا۔ جیسے مَرَّ بَشْتُهُ کے معنی ہیں، میں نے اس سے مرض کو دور کر دیا۔ قَذَّيْتُ کے معنی ہیں، میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکال دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تَعَذَّيْتُہ کے معنی ہیں، کسی کو دُرے کے سرے (عَذَّ بَشْتُهُ) سے متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعَذَّيْتُہ کے معنی مارنا پیٹنا ہی لکھے ہیں۔

(مفردات القرآن مع ترجمہ و حواشی شیخ الحدیث مولانا محمد عارف

فیروز پوری مطبوعہ اہلحدیث اکیڈمی لاہور)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ عَذَّ ابَّ کے معنی زندگی کی وہ اذیت اور تکلیف ہے جو بطور سزا کے کسی کو دی جاتے۔ بلکہ بعض اہل لغت نے اس کے معنی مارنا پیٹنا ہی لکھے ہیں

اور بعض علمائے لغت نے تو کہا ہے کہ اس کے معنی کوڑے (درے) کے سرے سے متواتر مارنے کے ہوتے ہیں۔ اس کی تائید خود سورۃ نور کی اس مشہور آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں زانیہ اور زانی کو سو کوڑے مارنے کا حکم دے کر فرمایا گیا ہے۔

وَلَيْسَ شَهِدٌ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ

(۲۴)

ترجمہ: اور ان کے اس عذاب (کوڑوں کی سزا) میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو حاضر رہنا چاہیئے۔

اس آیت میں کوڑوں ہی کی سزا کو عذاب کہا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد لعان کے سلسلہ میں سورۃ نور ہی میں

جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگاتے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو دونوں میاں بیوی (لعان کریں) یعنی پانچ پانچ قسمیں کھائیں۔ اسی سلسلے میں ہے۔

وَيَذَرُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَن تَشْهَدَ أَرْبَعٌ

(۲۵)

شَٰهَادَاتٍ۔

ترجمہ: اور عورت اپنے سے عذاب کو اس طرح ٹکاسکتی ہے کہ وہ چار شہادتیں دے۔

لعان کرنے والی یہ عورت شادی شدہ ہے اور عذاب

(یعنی کوڑوں کی سزا یا مار پیٹ کی سزا) کو پانچ قسمیں کھا کر ٹلا رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے علمائے لغت کی تصریحات سے ثابت کیا ہے عَذَابٌ کبھی بھی قتل کی صورت میں نہیں ہوتا۔ قرآن جہاں

شادی شدہ عورت کی سزا کو عذاب فرما رہا ہے جو مار پیٹ یا کوڑے مارنے ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ قرآنی سزائے زنا اگر رحم ہوتی تو قرآن کریم یہاں وَمَيِّدًا عَنْهَا الْعَذَابَ نہ فرماتا بلکہ کچھ اور فرماتا۔ مثلاً وَيَذَرُ عَنْهَا الْعُجْمَ۔ يَأْذِيهَا الْقَتْلُ۔ (۵) ازواج مطہرات کو خطاب فرماتے ہوئے سورہ احزاب میں آیا ہے۔

يُنْسَاءُ النَّبِيُّ مِنْ يَآتٍ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ
يُضَعَّفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (۳۳)

ترجمہ۔ اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کھلی بھائی کا ارتکاب کرے گی تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی۔

یہاں ازواج مطہرات شادی شدہ ہیں اور ان کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ (معاذ اللہ معاف اللہ) اگر وہ کھلی بھائی کی مرتکب ہوں گی تو انہیں دوگنی سزا دی جائے گی۔ لہذا اس آیت کریمہ کی رو سے شادی شدہ عورت کی سزا زنا میں ایسی ہونی ضروری ہے جسے دوگنا کیا جاسکے۔ رحم کی سزا کو تو دوگنا نہیں کیا جاسکتا۔ لامحالہ کوڑوں ہی کی سزا متعین ہے جسے دوگنا کرنا ممکن ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت کریمہ میں بھی سزائے زنا کو قرآن کریم عَذَابٌ ہی سے تعبیر کر رہا ہے جو قتل کی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ عذاب کے معنی زندگی کی لذت اور خوشگوار یوں سے محروم کر دینا، مارنا پیٹنا، کوڑوں سے مسلسل مارنا ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا۔

قرآن مجید کی یہ تمام آیات کریمہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔ رجم نہیں ہے۔ چنانچہ متقدمین میں سے خوارج، معتزلہ، بعض زیدی شیعہ اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رجم کا انکار کیا تھا۔ اور متاخرین میں سے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، علمائے اہل حدیث کے سرخیل مولانا وحید الزمان صاحب مترجم موطا۔ مصر کے مشہور فاضل علامہ ابو زہرہ، علامہ علی بن منصور مصنف نظام التجریم والعقاب فی الاسلام، مصر کے جلیل القدر فقیہ اور عالم استاذ مصطفیٰ زرقاں شیخ الازہر علامہ شیخ محمود شلتوت، عالم عرب کے مشہور علماء مثلاً علامہ شیخ علی خفیف اور علامہ شیخ عبدالوہاب خلاف مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ موسیٰ حارث اللہ ترکی رحمہم اللہ اجمعین بھی رجم کو حد نہیں بلکہ تعزیر مانتے ہیں۔

ہم نے یہاں محض مختصر اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب ”رجم حد ہے یا تعزیر“ ملاحظہ فرمائیں۔ جس کے دوسو سے زائد صفحات میں ہم نے اس پر مفصل و مدلل گفتگو کی ہے۔ کچھ بحث ہم نے اسی جلد چہارم کے باب الرجم میں بھی کی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رجم چوں کہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے اس لئے حاکم وقت یا عدالت کو اس کا اختیار ہے کہ وہ معاشرہ اور نجوم کے حالات دیکھتے

ہوتے سیاست تشدید کر سکتی ہے اور وہ تشدید قتل اور رجم کی صورت میں بھی کی جاسکتی ہے۔

هَذَا مَارَأَيْتَهُ وَاللَّهِ اعْلَمُ

یہاں ہم نے محض ربط قائم کرنے کے لئے چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنی کتاب ”رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟“ میں کر چکے ہیں۔ تفصیل اس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ رجم کے موضوع پر کچھ بحث ہم اس کتاب کے ”باب التعزیر“ میں بھی کریں گے۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

(باب حد القذف)

قذف کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگانے کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی کسی آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور پاک دامن آدمی پر، مرد ہو یا عورت، زنا کی تہمت لگا دے تو قرآن کریم نے اس کے لئے سزا میں اسٹی کوڑے مقرر فرمائے ہیں۔ اسے حد قذف کہتے ہیں۔ لیکن قذف کی یہ اصطلاح فقہاء کی ہے۔ قرآن کریم نے قذف کے لفظ کو اس معنی میں استعمال نہیں کیا قرآن کریم نے پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کیلئے رَمَى الْمُحْصَنَاتِ یعنی پاک دامن عورتوں کو زنا کا نشانہ تہمت بنانے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا

بِبَرَاءَةٍ شَهِدَاءَ فَلْجُلْدُ لَهُمْ ثَلَاثِينَ جَلْدَةً

وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ

هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ

ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ :- جو لوگ پاک دامن عورتوں کو (زنا کی)

تہمت لگاتے ہیں۔ پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے تو انہیں

اسٹی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی بھی قبول نہ کرو۔

اور یہ لوگ فاسق ہیں۔ سچ ان لوگوں کے جو اس کے بعد

توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو بلاشبہ اللہ

بخشنے والا، رحم فرم کرنے والا ہے۔

وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِبَرَاءَةٍ شَهِدَاءَ فَلْجُلْدُ لَهُمْ ثَلَاثِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

لگاتے ہیں) کے الفاظ آتے ہیں اور محصنات باندیوں کو نہیں کہتے
باندیوں کے سلسلہ میں سورہ نسا میں ہے۔

فَإِنْ آتَيْنَ بِغَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ
مِنَ الْعَذَابِ ۖ (۳۳)

ترجمہ : پھر اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر
اس سزا کا نصف ہے جو آزاد پاک دامن عورتوں کو دی
جاتی ہے (یعنی پچاس کوڑے)۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ محصنات سے مراد قرآن کریم میں
آزاد عورتیں ہوتی ہیں۔ اب چونکہ باندیاں نہیں ہوتیں۔ یہ سلسلہ
ہی اسلام نے ختم کر دیا ہے اس لئے اب اس شرط کی ضرورت
بھی نہیں رہی۔ البتہ عاقل و بالغ نیز مسلمان اور پاک دامن کی
شرط ضروری ہے۔ کیونکہ تہمت کی وجہ سے ایک شریف آدمی کو
سوسائٹی میں جو عار لاحق ہوتی ہے۔ یہ حد اسی کی سزا ہے۔ لیکن
ایک مجنون اور نابالغ، نیز کافر اور بدکردار آدمی کو اگر تہمت
لگائی جاتے تو ان کو کوئی عار لاحق ہونے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔ لہذا ان شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری
شرط یہ بھی ہے کہ جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہے وہ حد کا
مطالبہ کرے اور عدالت میں اس کے لئے باقاعدہ مرافعہ داخل
کرے۔ بغیر کسی مطالبہ کے حد جاری نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ
یہ حد اسی شخص کا حق ہے جس پر تہمت لگائی گئی ہے۔ یہ حق اللہ
نہیں ہے۔ لہذا اس کی طرف سے حد کا مطالبہ کیا جانا ضروری

وہ گناہ ہو گا جو اس نے کمایا ہے۔ اور ان میں سے جو شخص تہمت کے بڑے حصہ کا ذمہ دار ہو گا اس کے لئے بڑا عذاب ہو گا۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب تم ایسی جھوٹی بات کو سنو تو مسلمان مرد اور عورتیں اپنے نفسوں کے متعلق نیک گمان ہی کریں اور کہہ دیں کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ (اس لئے کسی طرح قابل اعتبار نہیں)۔

ان آیات کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ جھوٹی باتیں گڑھ گڑھ کر لوگوں کے متعلق مشہور کر دینا انتہائی گناہ کا باعث ہے خود مسلمانوں ہی میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کا مشغلہ ہی یہ ہو کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹی تہمتیں لگا کر بدنام کرنا چاہیں۔ چنانچہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسے منافق موجود تھے جو خود کو سچا مسلمان کہتے تھے لیکن ان کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں پر طرح طرح کی تہمتیں دھرتے اور انہیں معاشرہ میں بدنام کرتے تھے۔ تو ایسے لوگ بھی قرآن کریم کے نزدیک مجرم اور مستوجب عذاب آخرت ہونے کے علاوہ اس دنیا میں بھی سزا کے مستحق ہیں۔

ان آیات کریمہ میں جیسا کہ ظاہر ہے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس شخص پر کوئی جھوٹی تہمت یا جھوٹا بہتان لگایا گیا تھا۔ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے کون لوگ تھے اور کس کس نے تہمت لگانے کا یہ فعل شنیع

تعزیر | نیز ایسی گالیاں جن سے کسی کے والدین پر زنا کی تہمت کا مطلب تو نہیں نکلتا البتہ اسے اذیت پہنچتی ہے اور عار لاحق ہوتی ہے مثلاً کسی کو چور، ڈاکو کہہ دینا یا کسی کو کافر، فاسق و فاجر، خبیث، دیوث وغیرہ کہہ دینا تو اس قسم کی گالیوں میں حد تو واجب نہیں ہوگی البتہ اگر وہ شخص جسے اس قسم کی گالیاں دی گئی ہیں عدالت میں مرافعہ کرے تو حاکم مجاز گالی دینے والے پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔ یعنی گالی کی مناسبت سے اس کے لئے اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کر سکتا ہے۔ فقہاء نے اتنی ہی رعایت رکھی ہے کہ وہ ہر صورت میں حد شرعی سے زیادہ نہ ہونی چاہیے اس سے کم ہی ہونی چاہیے چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کم از کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ کم سے کم حد شرعی قذف میں چالیس کوڑے ہوتی ہے یعنی اگر زنا کی تہمت لگانے والا آزاد آدمی نہ ہو بلکہ غلام یا باندی ہو تو اسے آزاد آدمی کی نصف سزا یعنی چالیس کوڑے مارے جاتے ہیں۔ تو کم سے کم تہمت زنا کی شرعی حد چالیس کوڑے ہوئی۔ لہذا حاکم مجاز چالیس سے ایک کوڑا کم یعنی انتالیس کوڑوں تک کی سزا دے سکتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قذف کی اصل سزا تو اسی کوڑے مقرر کی گئی ہے۔ لہذا تعزیر میں حاکم مجاز پچھتر کوڑوں تک سزا دے سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تعزیر میں گالی کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاکم مجاز اپنی

صواب دید کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ اس میں اسے کسی سزا کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ اس کی اپنی مقرر کردہ سزا کم سے کم قرآنی سزا سے متجاوز نہ ہو۔ لیکن اگر حالات کا یہ تقاضا ہو کہ زیادہ سزا دی جائے تو ایسا بھی کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ اقل

جھوٹی تہمتیں دھرنا | قرآنی تعلیمات کی رو سے تہمت کی بڑی اہمیت ہے۔ تہمت ہر اس بڑی بات کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف جھوٹ منسوب کر دی جائے تہمتیں صرف زنا کے متعلق ہی نہیں ہوتیں بلکہ اس کا میدان بڑا وسیع ہے، جو تہمتیں زنا کے متعلق لگائی جاتی ہیں وہ اپنی اہمیت الگ رکھتی ہیں ان کے لئے قرآن کریم نے وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں (یعنی جو پاک و امن عورتوں کو نشانہ تہمت بناتے ہیں) اس کے لئے قرآن کریم نے باقاعدہ حد مقرر فرمائی ہے کہ جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کریں اور اس پر چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسی کوڑے مارے جائیں لیکن تہمت صرف ایک زنا ہی کی تو نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی تو بہت سی تہمتیں ہوتی ہیں اور اپنے وزن میں بعض مرتبہ زنا سے بھی زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ تو کیا قرآن کریم نے زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ کسی بھلے آدمی پر چوری

کی تہمت دھردینا، شراب نوشی کا اتہام لگا دینا، رقص و سرود کی تہمت دھردینا، بددیانتی اور خیانت یا پبلک فنڈز میں خردبرد کی تہمتیں لگا دینا، کسی کے دین و ایمان میں نقص لگانے کے لئے کسی کے عقیدہ میں کیڑے ڈالنا، مثلاً کسی کو وہابی مشہور کر دینا، کسی پر منکر سنت اور منکر رسالت کے خطابات چسپاں کر دینا، کسی پر جھوٹی روایتیں گڑھنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انہیں منسوب کرنے کی تہمتیں دھرنا۔ ہزار طرح کی جھوٹی تہمتیں ہوتی ہیں اور جو مسلمانوں کے معاشرہ میں عام ہیں بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ طبقوں تک میں ان کی ذہنی عیاشیوں کا مشغلہ ہیں۔ کیا یہ ساری باتیں قرآن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ
لَّا تُخْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَبْرٌ تَكْفُرُ بِهِ
أُمَرِئٌ مِّنْكُمْ مَّا الْكُتِبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي
تَوَتَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ لَوْلَا
إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ
بِأَنفُسِهِمْ خَبَرًا وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ۝

(۲۴/۱۱)

ترجمہ :- یقیناً جو لوگ جھوٹی تہمت بنا کر لاتے ہیں وہ تمہارا ہی ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہی ہوگا۔ ان میں سے ہر آدمی کیلئے

ہے۔ انٹی کوڑے جو حد قذف میں مارے جاتیں گے ان میں وہ تمام قیود اسی طرح ملحوظ رکھنی چاہئیں جن کا ذکر زنا کی حد میں آچکا ہے۔ یعنی کوڑے جسم کے مختلف حصوں پر مارے جاتیں کسی ایک جگہ پر نہ مارے جاتیں۔ نیز چہرہ اور نازک اعضاء پر نہ مارے جاتیں۔ ننگا کر کے نہ مارے جاتیں۔ جو کپڑے وہ پہنے ہوئے ہے۔ وہ پہنے رہے۔ البتہ روئی بھرا ہوا کوئی کپڑا یا فر اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو اسے البتہ اتروایا جاسکتا ہے۔

گالی گلوچ | عام طور پر آپس کے لڑائی جھگڑے اور کالم گلوچ میں اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں جن سے دوسروں پر زنا کی تہمت لگ جاتی ہے اور حد واجب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد تہمت لگانا نہیں ہوتا۔ ایسی بے احتیاطیوں سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو یہ کہہ دینا کہ تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ کسی کو نطفہ بے تحقیق کہہ دینا۔ حرام زادہ یا حرامی کہہ دینا۔ زانیہ کی اولاد کہہ دینا۔ یہ تمام الفاظ تہمت کے الفاظ ہیں۔ ان سے قذف لازم آجاتا ہے اور جس شخص کے متعلق ایسا کہا گیا ہے۔ اگر وہ مطالبہ کرے تو حد واجب ہو جاتی ہے۔ بہر حال ایسی تمام گالیاں جن سے کسی کے والدین پر زنا کی تہمت کا مطلب نکلتا ہو، ان سے حد قذف واجب ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ شخص جسے گالی دی گئی ہے حد کا مطالبہ کرے۔

اختیار کیا تھا۔ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے جھوٹی تہمت دھری ہے وہ ایک گروہ اور ایک جماعت ہے جو تم ہی میں سے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو ان سب کا سرغنہ ہے۔ لیکن اس سرغنہ کا نام بھی نہیں بتایا گیا۔ بلکہ ایک عام قانون کے انداز میں ساری گفتگو چل رہی ہے۔ جس چیز کو قرآن کریم نے خود متعین نہیں فرمایا۔ ہمیں بھی اس کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن کریم نے ہمیں جو ہدایت دی ہے ہم اس سے مناسبت رہنمائی حاصل کریں۔ اور اس نے ہمیں جو قانون دیا ہے اسے اپنے معاشرہ میں جاری کریں۔ لیکن بُرا ہوا انسان کی کنج و کمرید کے جذبہ کا کہ وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا بلکہ ہر بات کو کسی نہ کسی خاص واقعہ پر چسپان کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب قرآن کریم سے اسے کوئی خاص واقعہ یا کسی خاص آدمی کا نام نہیں ملا تو اس نے وضع احادیث کی منت نئی ٹلکسالوں سے رجوع کیا اور جھوٹے وضائعین نے اس ضمن میں جو خرافات گرٹھی تھیں انہیں اپنی مستند ترین حدیث اور تفسیر کی کتابوں کی زینت بنا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہر حال اس موضوع پر ہم آگے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال رہے ہیں۔ فی الحال آپ اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی تہمت کے لئے قرآن کریم نے قَالَتِ یٰۤاٰیْمُوۡنَ الْمُحْصَنٰتِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ وہ بات اور

اس کی سزا کا بیان (۲۲۲ھ) میں ختم ہو چکا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاؤْا بِالْاِفْکِ سے نیا سلسلہ بیان شروع ہو رہا ہے۔ اور اس سے مراد تہمت زنا کا بیان نہیں ہے بلکہ زنا کے علاوہ دوسری تہمتیں مراد ہیں۔ یہ تہمتیں اخلاقی بھی ہو سکتی ہیں اور نظریاتی بھی ہو سکتی ہیں۔ اِفْکِ کے معنی عربی زبان میں زنا کی تہمت لگانے کے نہیں ہیں۔ اَفْکَ یَاْفُکُ کے معنی جھوٹ بولنا۔ جھوٹی بات بنانا ہیں۔
(تلج العروس)

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو الٹ دینا۔ اس کی جہت سے پھیر دینا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں عصائے موسوی کے متعلق ہے۔

فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْخُذُکُوْنَ ۝ (۲۲۲)

ترجمہ: تو یکایک وہ ان تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے (نگل لیتا ہے) جنہیں وہ (یعنی جادوگر) جھوٹ موٹ بناتے تھے۔

سورہ شعراء میں ہے۔

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفْکٍ اَشِیْمٍ (۲۲۲)

ترجمہ: وہ (یعنی شیاطین) ہر جھوٹے گناہ نگار پر نازل ہوتے ہیں۔

سورہ الصافات میں ہے۔

اَعْمَسَا الْاِلٰهَۃَ دُوْنَ اللّٰهِ تُؤْنِدُوْنَ (۲۲۴)

ترجمہ: کیا جھوٹ موٹ اللہ کے سوا دوسرے

معبودوں کا ارادہ کرتے ہو۔
سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا ذکر فرما کر
فرمایا گیا ہے۔

ثُمَّ انْظُرْ اَنْ يُّؤْمِنُوا ۝ (۵)

توجہ دے۔ پھر دیکھیے وہ کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔
لہذا اِخْلَاف کے معنی جھوٹ اور گڑھی ہوتی بات کے ہیں۔
ایسی بات جو اصل میں کچھ ہو اور اسے الٹ کر کچھ سے کچھ کر دیا
جائے اِخْلَاف کہلاتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں، یہ بتایا گیا ہے
کہ جو لوگ کسی پر زنا کے علاوہ اور کسی بات کی جھوٹی ٹہمت
لگائیں وہ بھی مجرم ہیں۔ اس قسم کے اتہامات سے بلاشبہ تمہیں
اذیت پہنچتی ہے لیکن اس میں بھی انجام کے لحاظ سے تمہارے
لئے کوئی خیر کا پہلو نکل سکتا ہے۔ لہذا تم اسے اپنے لئے شرنہیں بلکہ
خیر کا باعث ہی سمجھو۔ لیکن جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں
وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے جس کا اس میں جتنا حصہ ہوگا
اسے اتنا ہی عذاب ملے گا۔ اور جو شخص اس قسم کے کسی بہتان کا
ذمہ دار ہوگا۔ اسے بہت بڑا عذاب ملے گا۔ مسلمان مردوں اور
عورتوں کو چاہیئے کہ جب وہ اس قسم کے بہتان سنیں تو اپنے
معاشرہ کے افراد کے متعلق حسن ظن ہی سے کام لیں اور صاف
کہہ دیں کہ یہ تو کھلا جھوٹ ہے۔ ہم اس پر کان دھرنے کیلئے
تیار نہیں۔ وہ اگر اس قسم کا کوئی بہتان لگاتے ہیں تو وہ اس پر
چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ اگر وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود وہ بہتان لگانے والے ہی جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو آپس میں اس قسم کی بہتان طرازیوں کی وجہ سے تم سخت عذاب میں مبتلا ہو جاتے۔ جبکہ تم اس قسم کی تہمتوں کو مزے لے کر اور زبانیں مروڑ مروڑ کر بیان کرتے ہو اور اپنے منہ سے وہ باتیں نکالتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ کیا تم اس قسم کی اتہام طرازیوں کو ایک معمولی بات سمجھتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جب اس قسم کے اتہامات کو سنو تو صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے لئے جانتے نہیں ہے کہ ہم ایسی باتیں منہ سے نکالیں۔ سبحان اللہ! بغیر تحقیق کے کسی پر الزام لگانا تو بہت بڑا بہتان ہے خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی بہتان طرازیوں میں کوئی حصہ نہ لو۔ اگر تم اہل ایمان ہو تو اس سے ہمیشہ بچتے رہو۔

بہر حال زنا کی تہمت میں جیسا کہ تہمت لگانے والے کو چار گواہ اپنی شہادت میں پیش کرنے پڑتے ہیں ایسے ہی تہمت زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں میں بھی اپنی صداقت کے لئے چار گواہ پیش کرنے ہوں گے۔ تہمت بہر حال میں تہمت ہے زنا کی تہمت ہو یا غیر زنا کی۔ اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔ اور قرآن کریم نے اگرچہ اس کے لئے کوئی متعین حد مقرر نہیں فرمائی ہے مگر حاکم مجاز کو چاہیے کہ اگر وہ

شخص جس پر کوئی تہمت لگائی گئی ہے فریاد کرے تو تہمت لگانے والے پر تعزیر جاری کی جائے۔ یہ تعزیر اسی تفصیل کے ساتھ ہوگی جس طرح گالی دینے کے معاملہ میں ہم تفصیل سے کتاب الحدود میں ذکر کر چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ پچتر کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی رائے یہ لکھی تھی کہ حاکم مجاز کو کسی خاص تعداد کا پابند نہ کیا جائے بلکہ حالات کے تقاضے کے مطابق اسے فیصلہ کرنا چاہیے۔ البتہ بہتر یہی ہے کہ اس کی تعزیر انسی کوڑے سے زیادہ نہ ہو جو ایک شرعی حد ہے اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھانا کہ چونکہ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ جب وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے تو وہ خود ہی جھوٹے ہیں۔ اور چار گواہ زنا کی تہمت ہی میں ضروری ہوتے ہیں۔ ورنہ عام معاملات میں چار گواہ ضروری نہیں ہوتے بلکہ دو گواہ کافی ہوتے ہیں۔ اس لئے لازماً ان آیات کا تعلق بھی زنا ہی کی تہمت سے ہونا چاہیے، ایک ادا عاتے محض ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ چار گواہوں کی شرط صرف زنا کی تہمت ہی میں ہو سکتی ہے۔ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم سے

زنا کی تہمت میں چار گواہوں کی شرط ثابت ہونے سے یہ بات کیسے ثابت ہو گئی کہ کسی اور تہمت میں چار گواہوں کی شرط لگانا ممنوع ہے۔ اور قرآن کریم نے اس سے منع فرمادیا ہے۔ ہمارے خیال میں تہمت کے سلسلہ میں خواہ وہ زنا سے متعلق ہو یا غیر زنا سے متعلق ہو چار گواہوں کی شرط ضروری ہے۔ زنا کی تہمت میں چار گواہوں کی شرط کا بیان پہلے آچکا ہے اور غیر زنا کی صورت میں ان آیات میں دوسری مرتبہ آ رہا ہے۔

شانِ نزول کی روایات | اب ہم ان آیات کی اس تفسیر سے بحث کرتے ہیں جو شانِ نزول کی

روایات کے باعث ہماری تفسیروں اور کتب احادیث میں نہایت اہمیت حاصل کر گئی ہیں۔ حالانکہ شانِ نزول کی روایات کی وہ اہمیت ہرگز نہیں ہوتی جو ان کو دے دی گئی ہے۔ اصولِ تفسیر میں یہ بات علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ۔

العبارة لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد۔

ترجمہ: الفاظ کی عمومیت کا اعتبار ہے۔ کسی خصوصی

شانِ نزول کا اعتبار نہیں ہے۔

قرآن کریم ایک ضابطہ ہدایت ہے۔ اس میں امت مسلمہ کی عام مصالح کے لئے قوانین دیئے گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ جب کوئی خاص واقعہ ہی پیش آجائے تو قرآن کی آیات نازل ہوتی ہیں۔ خاص واقعہ کے بغیر کوئی آیت نازل ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ قرآن کریم کی ہر آیت کو

اس کے شان نزول کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے۔ قوانین کبھی بھی واقعات کے پابند نہیں ہوتے۔

شان نزول کی روایت | لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں تفصیل کے ساتھ ایک

روایت بیان ہوئی ہے جس کو صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشہ[ؓ] وام رومان و کتاب التفسیر و کتاب الشہادات و کتاب الاعتصام بالکتاب و السنۃ اور صحیح مسلم کتاب التوبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ حدیث یوں شروع ہوئی ہے۔ ہم سے یحییٰ ابن بکیر نے حدیث بیان کی کہ ہم سے لیث نے یونس سے حدیث بیان کی انہوں نے ابن شہاب سے کہا کہ مجھے عروہ ابن زبیر نے اور سعید ابن المسیب نے اور علقمہ ابن وقاص نے اور عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود نے عائشہؓ زوجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے متعلق خبر دی جب ان کے بارہ میں اہل افک نے کہا جو کچھ کہا اور اللہ نے انہیں اس سے بری قرار دیا جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ ہر ایک نے حدیث کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے اور حدیث کا کچھ حصہ دوسرے لوگوں کی حدیث کی تصدیق کرتا ہے اگرچہ ان میں سے بعض نے حدیث کو دوسرے بعض سے زیادہ محفوظ رکھا ہے۔ بہر حال جو کچھ مجھ سے عروہ نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالتے

تھے۔ جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ کا نام نکلا۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ کیونکہ پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا لہذا (کچھ آدمی) انہیں ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اُتارتے تھے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے قریب آپ نے ایک مقام پر نزول کیا۔ وہاں سے رات کے وقت آپ نے کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کوچ کا علم ہوا تو وہ قضائے حاجت کے لئے روانہ ہوئیں اور اسلامی لشکر سے کافی دور چلی گئیں۔ قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اپنی سواری کے قریب پہنچیں تو انہوں نے اپنے سینہ پر ہاتھ پھیرا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ان کا ہار جو مینی خزف کا بنا ہوا تھا غائب ہے۔ وہ سمجھیں کہ کہیں ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ لہذا اسکو تلاش کرنے کے لئے وہ واپس اسی جگہ گئیں جہاں انہوں نے قضائے حاجت کی تھی۔ انہوں نے ہار تلاش کیا۔ تلاش کرتے کرتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ اسی اثنا میں اسلامی فوج اس منزل سے روانہ ہو گئی۔ اس زمانہ میں عورتیں بہت کم کھانا کھاتی تھیں۔ ان پر گوشت بہت کم ہوتا تھا۔ لہذا ہلکی پھلکی ہوتی تھیں۔ مزید برآں حضرت عائشہ ایک کم سن لڑکی تھیں۔ لہذا بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ ان لوگوں نے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہودج چڑھاتے

اتارتے تھے ہودج اٹھاتے وقت اس کو ہلکانہ جانا۔ وہ یہ سمجھے کہ حضرت عائشہؓ اس میں موجود ہیں۔ لہذا انہوں نے ہودج اونٹ پر رکھ دیا۔ اور اونٹ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کو وہ ہمارا اسلامی شکر کے روانہ ہونے کے بعد ملا۔ ہمار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اس خیال سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہوگا تو انہیں ڈھونڈنے اسی جگہ آئیں گے۔ کچھ دیر بعد انہیں نیند آئی اور وہ سو گئیں۔

حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہو گئے اسلامی شکر کے پیچھے رہا کرتے تھے وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے۔ کیوں کہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ لہذا دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ کو پہچان گئے۔ اور کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی اور نہ حضرت عائشہؓ نے سوائے استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی۔ حضرت صفوان اپنے اونٹ سے اترے۔ پھر اس کو بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر باندھے۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ حضرت صفوانؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت جبکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی اسلامی شکر سے

جا ملے۔ مسلمان وہاں ایک جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔

اسلامی لشکر مدینہ منورہ پہنچا۔ مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہو گئیں۔ بیماری نے طول کھینچا یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ اس عرصہ میں عبداللہ ابن ابی اپنی مجلس میں اس تہمت کا ذکر کرتا۔ دوسرے منافقین بھی اس کی مجلس میں بیٹھ کر یہی تذکرہ کرتے اور وہ سننا بہت غرضیکہ یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی۔ اس نے سنتے ہی فوراً کہا۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے۔ منافقین کے علاوہ مؤمنین میں سے بھی تین آدمی اس بہتان میں شریک ہو گئے۔ یعنی حضرت حسان ابن ثابتؓ، مسطح ابن اثاثہؓ اور حمزہ بنت جحشؓ۔ لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کا اب تک علم نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا کہ غالباً رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کچھ خفا ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لاتے، سلام کرتے اور یہ پوچھتے ”تم کیسی ہو؟“ پھر واپس چلے جاتے۔ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے بڑے کا زیادہ شعور نہیں تھا۔ (وہ نہ سمجھ سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟)

جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بیماری سے افاقہ ہوا۔ تو وہ ایک رات کو قضائے حاجت کے لئے نکلیں۔ گھروں میں اس وقت تک بیت الخلا نہیں بنائے گئے تھے۔ عورتیں صرف رات کے وقت قضائے حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آ رہا تھا۔ گھروں کے پاس بیت الخلا بنانے سے انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی قضائے حاجت کے لئے نکلیں۔ حضرت ام مسطحؓ ابوہم بن عبد المطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ جو ضو ابن عامر کی بیٹی تھیں حضرت ابوبکرؓ کی خالہ تھیں۔ حضرت ام مسطحؓ کے شوہر کا نام اثاثہ ابن عباد ابن عبد المطلب تھا۔ ان کے بیٹے کا نام مسطحؓ تھا۔ اسی بیٹے کے نام پر ان کی کنیت ام مسطحؓ تھی۔ قضائے حاجت کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام مسطحؓ واپس روانہ ہوئیں۔ راستہ میں حضرت ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا۔ وہ کہنے لگیں ”مسطح ہلاک ہو“ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ”تم بُری بات کہہ رہی ہو۔ وہ تو بدری صحابی ہے“ انہوں نے کہا ”اری دیوانی!

کیا تو نے نہیں سنا کہ مسطحؓ نے کیا کہا ہے؟“ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: ”مسطحؓ نے کیا کہا ہے؟“ حضرت ام مسطحؓ نے تہمت کا سارا حال سنایا۔ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیماری بڑھتی شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے سلام کیا پھر پوچھا: ”تم کیسی ہو؟“ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگی تاکہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور ایک لڑکا ان کے ساتھ کر دیا۔

حضرت عائشہؓ اپنے والدین کے ہاں پہنچیں۔ اپنی والدہ حضرت ام رومانؓ سے پوچھا کہ لوگ (میرے متعلق) کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت ام رومانؓ نے جواب دیا۔ اے بیٹی! گھبراؤ نہیں۔ ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو خوبصورت ہوں، محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں۔ پھر ان کی سوکنیں بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: ”سبحان اللہ! کیا لوگ واقعی یہ بات کہہ رہے ہیں؟“ اتنے میں ایک انصاری عورت آئی اور کہنے لگی۔ اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی کرے۔ حضرت ام رومانؓ نے کہا: ”تم نے یہ کیا بات کہی؟“ اس نے کہا کہ میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے۔“ حضرت ام رومانؓ نے پوچھا: ”آخر کیا قصہ ہے؟“ (اس کی کیا تفصیل ہے؟) اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا۔ جب وہ بیان کر چکی تو حضرت عائشہؓ

صدیقہ نے پوچھا۔ ”کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”ہاں“ حضرت عائشہؓ نے پوچھا۔ ”کیا ابوبکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”ہاں“ یہ سن کر حضرت عائشہؓ صدیقہؓ نے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں۔ ہوش آیا تو لڑکھانچا کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ حضرت ام رومانؓ نے ان پر صفائی وغیرہ ڈال دی اور انہیں اچھی طرح اس میں چھپا دیا۔ ایسی اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپؐ نے پوچھا۔ ”ان کا کیا حال ہے؟“ حضرت ام رومانؓ نے کہا انہیں سخت لڑکھانچا چڑھا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آ گیا ہے؟“ حضرت ام رومانؓ نے کہا۔ ”ہاں“ حضرت ام رومانؓ کہتی ہیں۔ ”پھر آپؐ چلے گئے اور مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ (جب بخار سے ذرا آفاقہ ہوا۔ تو حضرت عائشہؓ نے روتے لگیں۔ رات بھر روتی رہیں۔ نہ آنسو ٹھکتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ روتے روتے صبح ہو گئی۔ حضرت صفوانؓ کو جب اس تہمت کا علم ہوا تو کہنے لگے اللہ کی قسم میں کبھی کسی عورت کے پاس نہیں گیا۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت پریشان تھے۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے خیال چلن کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ پہلے آپؐ نے اپنی بیوی حضرت زینبؓ سے دریافت کیا۔ حضرت زینبؓ نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول! میں اپنی آنکھ اور کانوں کو سچا پاتی

ہوں۔ (میں نے ان میں نہ کوئی برائی دیکھی نہ سنی) اللہ کی قسم میں بجز بھلائی کے کچھ نہیں جانتی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں یہوں اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں صرف زینبؓ میری برائی کی مدعی تھیں۔ لیکن ان کے زہد و تقویٰ نے انہیں (میری برائی کرنے سے) بچا لیا۔ باوجود اس کے کہ ان کی بہن (حمنہ بنت جحش) تہمت لگانے والوں میں شامل تھیں۔ (لیکن انہوں نے اپنی بہن کی بات کو صحیح نہ سمجھا) حمنہؓ حضرت زینبؓ سے جھگڑنے لگیں اور ہلاک ہونے والی جماعت میں شامل ہو کر وہ بھی ہلاک ہوئیں۔
(یعنی تہمت لگا کر گناہ کا ارتکاب کیا اور سزا پائی)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور اسامہ بن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا: ”وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے) آپ بدستور انہیں اپنے پاس ہی رکھیے۔ ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے“ حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملہ میں سلامت رہے (کسی قسم کا شبہ نہیں کیا) البتہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غم غلط کرنے کے لئے) یہ عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائیں گی“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟“ حضرت بریدہؓ نے کہا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں وہ تو اتنی (بھولی) کمسن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں۔ پلی ہوئی بکری آکر اسے کھا جاتی ہے۔“ ایک شخص نے (دوسری روایات میں ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ تھے مترجم) انہیں دھماکا کر کہا کہ ”سچ بیان کرو“ حضرت بریدہؓ نے کہا: ”سبحان اللہ! میں تو عائشہؓ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سرخ سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے۔“

اسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے آپ نے فرمایا: کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا۔ اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں کوئی اور گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ یہ سن کر بنو عبد اشہل کے بھائی حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں

گئے یہ سن کر قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے (یہ وہی سعد بن عبادہ ہیں جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ صدیق اکبر کے مقابلے میں خلافت کے مدعی تھے اور یہ کہ انہوں نے صدیق اکبر سے بیعت بھی نہیں کی۔ مترجم) یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقع پر پھسل گئے۔ قوی حمیت اور غرور نے انہیں اُجھارا۔ کہنے لگے ”تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرج کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے ماننے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے“ یہ سن کر حضرت اسید بن حضیر کھڑے ہوئے۔ یہ حضرت سعد بن معاذ کے چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ سے کہا ”تم جھوٹے ہو۔ اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے جھگڑتے ہو“ اس پر اس اور خزرج دونوں قبیلے اتنا بھڑکے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی نمبر پہنچا ہی تھا۔ آپ ان کو چپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔

ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا اس دن بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ مسلسل روتی رہیں۔ نہ آنسو بھٹکتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ دوسری رات بھی اسی طرح گزر گئی۔ ان کے والدین نے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے صبح کر دی۔ حضرت عائشہؓ کو روتے ہوئے اب دو راتیں اور ایک دن ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں نہ

ان کے آنسو تھمتے نہ ان کی آنکھ لگی۔ وہ اور ان کے والدین ڈر رہے تھے کہ ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ ان کی والدہ بھی ان کے پاس بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک انصاری عورت نے اندہ آنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دی۔ وہ عورت اندر آ کر بیٹھ گئی۔ اور ان کے سامنے وہ بھی رونے لگی۔ یہ لوگ اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سلام کر کے حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھ گئے۔ تہمت کے بعد اس دن پہلی مرتبہ آپ حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے۔ ایک مہینہ تک مسلسل آپ نے حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں وحی کا انتظار کیا۔ لیکن ابھی تک وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھتے وقت کلمہ شہادت پڑھا پھر حمد و تشہید کے بعد فرمایا ”اے عائشہؓ تمہارے متعلق ایسی ایسی خبر سنتے میں آتی ہے۔ اگر تم بری ہو تو اللہ عنقریب تمہاری بریت کی خبر دیدے گا۔ اور اگر تم سے گناہ ہو گیا تو اللہ سے اپنی بخشش کی دعا کرو۔ اس کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ بندہ جب گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے“

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ حضرت عائشہؓ بری ہیں جیسا کہ آپ خطبہ میں فرما چکے تھے تاہم آپ نے یہ کلمات صرف اس لئے کہے کہ ساری امت کے لئے نصیحت و وعظ کا کام دیں۔ اپنے یقین کی بنیاد پر نہ آپ نے بریت کا اعلان فرمایا

نہ مجرموں کو سزا دی تاکہ کسی شخص کو بدظنی کا موقع نہ ملے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ پڑا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے والد حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ آپ میری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیجئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ یہ جواب سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نو عمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: ”اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اور تم نے اسے مان بھی لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں بری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے۔ اور اگر میں تم سے اس امر کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی مثال یوسف (علیہ السلام) کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا **فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ**“ میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی ہوں۔ اور جو کچھ

لوگ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ہی میرا مددگار ہے۔
یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں
وہ فرماتی ہیں کہ اللہ کو علم تھا کہ میں بری ہوں (لہذا مجھے
امید تھی کہ اللہ ضرور میری بریت بیان کرے گا۔ لیکن اللہ
کی قسم میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ میری شان میں ایسی وحی
نازل کرے گا جس کی تلاوت کی جائے گی۔ میں اپنی دانست
میں اپنی شان کو اتنا بلند نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے
معاملہ میں کلام فرمائے گا مجھے تو بس یہ امید تھی کہ اللہ تعالیٰ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں میرا بری ہونا ظاہر
کر دے گا۔ اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اپنی
جگہ سے اٹھنے بھی نہ پاتے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے
پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی اور جو شدت آپ پر بوقت
نزول وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہو گئی۔ سردی کا دین ہونے
کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں
کی طرح ٹپک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر سے وہ شدت دور ہوئی۔ آپ ہنستے ہوئے اٹھے اور فرمایا۔
اے عائشہؓ اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ بزرگ و بڑے تمہیں
بری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِآئِدِنَاكَ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ

الْآخِرَاتِ۔

ان آیات کے سننے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ مطہرہؓ کی

والدہ ماجدہ نے حضرت عائشہؓ مطہرہؓ سے کہا کہ اٹھو اور کھڑی ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ و مطہرہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم میں کسی کی طرف اٹھ کر نہ جاؤں گی اور نہ اللہ کے سوا کسی کا شکریہ ادا کروں گی۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشہؓ و ام رومانؓ و کتاب التفسیر و کتاب الشهادات و کتاب الاعتصام بالکتاب و السنۃ و صحیح مسلم کتاب التوبہ)

(خط کشیدہ الفاظ صرف صحیح مسلم میں ہیں۔ کثرت گریہ سے جگر پھٹنے کا اندیشہ حضرت عائشہؓ کو ہوا یہ صرف صحیح بخاری میں ہے۔ اور یہی اندیشہ ان کے والدین کو ہوا یہ صرف صحیح مسلم میں ہے۔ انصاری کے الفاظ ”یہ بہتان عظیم ہے۔۔۔۔۔“ یہ صرف صحیح بخاری کتاب الاعتصام میں ہیں۔)

تفتیش حدیث | یہ حدیث جیسا کہ حوالہ سے ظاہر ہے صحیح

بخاری اور صحیح مسلم میں آگئی ہے۔ لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے پورے پورے احترام کے باوجود ہمیں بہت افسوس ہے یہ حدیث ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ سب سے پہلی بات جو اس حدیث کے خلاف جاتی ہے وہ اس حدیث کی یہ بنیادی بات ہے کہ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈال کر تے تھے جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے

وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام نکلا
ہمارے نزدیک قرعہ اندازی سے فیصلے کرنا ہی قرآن کریم کے
خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور
بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ قرآن کریم کے سراسر خلاف قرعہ اندازی
فرماتے ہوں اور اس طرح فیصلے فرماتے ہوں گے۔

سورہ مائدہ میں ہے:-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخَازِنَةِ
وَمَا أَهَلَ بِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُتَخَفَّةُ وَالْمُتَوَفَّاةُ
وَالْمُتَرَقِّصَةُ وَالنَّطِيجَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا
مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذَرَعَ عَلَى النَّصَبِ وَأَنْ تَشْتَبِهُوا
بِأَلَا ذَلَامٌ ذَٰلِكُمْ فَسُقُوطٌ (۵)

ترجمہ:- (انے پیروانی دعوت ایمانی!) تم پر حرام
کیا گیا مردار اور خون اور شور کا گوشت اور وہ جانور
جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور جو جانور کھونٹے
سے مر گیا ہو اور جو چوٹ لگنے سے مر گیا ہو اور جو اوپر
سے گر کر اور سینگ لگ کر مر گیا ہو اور جسے کسی درندہ
نے پھاڑ کھایا ہو البتہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو وہ حلال
ہے۔ ایسے ہی وہ جانور جو بتوں کے استعمائوں پر ذبح
کئے گئے ہوں، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم گوشت یا کوئی
اور چیز، آپس میں پانسے کی تیروں سے تقسیم کرو۔ یہ تمہارے
پلے سخت گناہ کا باعث اور فسق ہے۔

نیز سورۃ مائدہ ہی میں ذرا آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا جَعَلْنَا الْخَمْرَ وَالْمَيْسِرَ وَ
 الْأَنْصَابَ وَالْأَدْرَاةَ رِجْسًا مِّمَّنْ عَمِلَ الشَّيْطَانُ
 فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (۵)

ترجمہ :- اے پیروان دعوت ایمانی! حقیقت یہی ہے
 کہ شراب اور جوا اور بت اور پانسہ کے تیرنا پاک
 شیطانی عمل ہیں۔ سو ان سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح
 پاسکو۔

ان دونوں آیات کریمہ میں معاملات کے فیصلے پانسہ کے
 تیروں (الاذلام) کے ذریعہ سے کرنے کو منع فرمایا گیا ہے۔
 آیت نمبر (۵) میں تو بات حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے
 شروع فرمائی گئی ہے اور آخر میں ذَلِكُمْ فِشْقٍ سے بتا دیا گیا
 ہے کہ یہ فعل حرام ہے اور سخت گناہ اور حق تعالیٰ کی انتہائی
 ناراضگی کا باعث ہے اور آیت نمبر (۶) میں رِجْسٍ مِّمَّنْ عَمِلَ
 الشَّيْطَانُ فرما کر کہ یہ گندہ چیزیں اور شیطانی اعمال ہیں
 لہذا فَاجْتَنِبُوهُ ان سے احتراز کرنے اور الگ رہنے کا
 حکم دیدیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اَلْأَدْرَاةَ چیز کیا
 ہے جس سے اس قدر تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی جا رہی
 ہے۔ تو التَّلْمِیْزِ کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے پچھلے
 سرے پر ہند نہ لگاتے گئے ہوں۔ جمع اَدْرَاةٌ، ابن فارس
 نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دُ بِلَا پَتْلَا اور سِپَاٹ

یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں۔ پھر اذ لکھ سے مراد وہ تیر
 تھے جن سے قریش زمانہ جاہلیت میں فال نکالتے یا قرعہ ڈالتے
 تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر پھیلے میں ڈال
 دیئے جاتے۔ ان میں سے ایک تیر پہ (فعل) (کر) دوسرے پر
 لا تفعیل (نہ کہ) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب
 کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے چبائروں
 کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے
 کے بارے میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدہ کے مطابق
 تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے۔
 اگر خلی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ بعض لوگ خود بھی اپنے
 پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے
 فال نکال لیتے۔ (تاج العروس ومحیط المحيط)

اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی اور (جوئے
 کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا (۵) قرآن کریم
 نے ان سب باتوں سے منع فرمادیا۔ اس لئے کہ اس سے انسان
 اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے
 اس کے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے
 اپنے آپ کو اتفاقات (CHANCES) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا
 ہے۔ اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآن کریم
 انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی
 کی تعلیم دیتا ہے اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا

ہے جس سے اس کی عقل و خرد و دب جلے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدودِ اللہ یعنی قوانینِ خداوندی اور ہدایاتِ قرآنی کے اندر رہتے ہوئے اپنے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے۔ یہ بھی قرآن کریم کی تعلیم۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

”بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لئے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار یعنی جوئے کی تھی جیسے آج کل چھٹی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے اولادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر آمّوْحِیْ ذَیْقَتْ لکھا تھا (میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے)۔ کسی پر نَحَاْحِیْ ذَیْقَتْ تحریر تھا (میرے رب نے مجھے منع کر دیا)۔ اسی طرح ہر تیر پر یونہی اشکال بچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال کر دیکھ لیتے۔ اگر اموْحِیْ دیکھا تو تیر نکال آیا

تو کام شروع کر دیا اور اس کے خلاف نکلا تو رب
گئے۔ علیٰ ہذا القیاس گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ
اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کا مبنی غالباً جبل
شرک، اولہام پرستی اور افتراء علی اللہ پر تھا اس لئے
قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تعلیظ اور
تذہید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے۔
(قرآن کریم ترجمہ حضرت شیخ الہند و تفسیر حضرت عثمانؓ ۱۳۸)
یعنی اَزْ لَامَ سے مراد وہ تیر نہیں ہیں جو زمانہ جاہلیت
میں ذبیحہ کا گوشت تقسیم کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے
کیونکہ وہ تو قمار یعنی جوئے کی ایک شکل تھی اور اس کے متعلق
آیت کریمہ میں اَلْمَيْسِرُ کالْفَحْشِ آرہا ہے۔ لہٰذا اَزْ لَامَ سے
بھی اسی کو مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ اس لئے علامہ ابن کثیرؒ
وغیرہ محققین کے نزدیک باطل ہے کہ اَزْ لَامَ سے مراد وہ تیر
ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے
ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یعنی وہ عقل و بصیرت
سے غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے اَزْ لَامَ کا آسان
راستہ اختیار کر لیتے تھے جو کچھ تیروں سے نکل آیا اسی کو اختیار
کر لیا۔ یہ طریقہ بہت آسان تھا۔ غور و فکر اور عقل و بصیرت سے
کسی ہمت کا فیصلہ کرنا تن آسانوں کے لئے پڑا وقت طلب اور
بڑی محنت کی بات تھی اس لئے لوگوں نے اسی کو اختیار کر لیا

یاد رکھیے انسان کے کام اور اس کے اعمال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اہمیت دراصل اس نظریہ اور تصور کی ہوتی ہے جو کسی عمل کی پشت پر کار فرما ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس ذہنیت کے ماتحت فلاں شخص فلاں کام کر رہا ہے۔ ایک ذہنیت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی کسی کام پر عقلی طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی اقدام کرتا ہے۔ وہ تقلیدی طور پر یا کسی اتفاقی حادثہ سے متاثر ہو کر کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا وہ ہر بات کو جلیغ پر کھ کر، تاپ تول کر، اس کے فوائد اور مضرتوں کو عقل و بصیرت کی ہدایت و رہنمائی سے سمجھ کر ہی اختیار کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ذہنیت مشکل پسند اور صبر آزما ہوتی ہے۔ دوسری ذہنیت اس کے برخلاف تن آسانی اور سہل پسندی کی ہوتی ہے کہ آدمی غور و فکر سے کام لینا پسند نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کرنے کے بجائے یہ دیکھتا ہے کہ اب تک کیا ہوتا آ رہا ہے۔ باپ دادا سے جو کچھ ہوتا آ رہا ہے آنکھیں بند کر کے اسی کی پیروی کرتا چلا جا رہا ہے۔ یا اگر کہیں ٹھٹک کر کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑ گیا تو فال، نچھتر، قرعہ وغیرہ کا سہارا لے لیتا ہے کہ ترکش سے تیر نکالے یا دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کا کوئی صفحہ کھول لیا اور پڑھ لیا کہ کیا لکھا ہے یا چند پڑیوں کو بند کر کے ڈال دیا اعدان میں سے ایک پڑیا اٹھالی، کھول کر دیکھ لیا کہ کیا لکھا ہوا ہے۔ جو کچھ لکھا ہوا نکلا اسی کے مطابق عمل کر لیا۔ غور و فکر کرنے، موافق و مخالف نکات پر سوچنے سمجھنے کی زحمت

سے بچ گئے یہ دوسری روش زندگی ان لوگوں کی ہوتی ہے جو تن آسان اور سہل پسند واقع ہوتے ہوں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی کرے وہ خوب سوچ سمجھ کر، مفادات اور مضرتوں کو خوب ناپ تول کر، موافق اور مخالف نکات پر خوب غور و فکر کر کے اختیار کرے۔ کوئی کام تقلید لیا اندھا دھند اتفاقاً سے متاثر ہو کر نہ کرے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو با اختیار اور صاحب ارادہ بنا کر پیدا کیا ہے وہ یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے کام لو اور خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ تمہیں کسی قسم کے جبر کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ احکام خداوندی اور آیات الہی کی پیروی بھی اندھا دھند نہیں کرانا چاہتا۔ وہ اللہ کے نیک بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِمَا آلَمَتْ رَبُّهُمْ لَهُمْ مَخْرُجًا
عَلَيْهَا صُغَرًا وَغَمِيرًا ۝ (۲۵)

ترجمہ: وہ اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں ان کے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان آیتوں پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

وہ ہر بات میں علم و بصیرت کی پیروی کرنے اور سوچ سمجھ کر عملی قدم اٹھانے کی تاکید فرماتا ہے۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ

وَالْبَصَرُ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

(۳۴)

ترجمہ :- اور اس بات کی ہر گز پیروی نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے یقیناً کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کی بابت اس شخص سے باز پرس کی جائے گی۔
کہ تم نے فلاں قدم اٹھاتے ہوئے آنکھ، کان اور دل سے دیکھ، سن اور سمجھ بھی لیا تھا یا یوں ہی اندھا دھند قدم اٹھا لیا تھا۔ اس کی تو دعوت ہی یہ ہے کہ :-

قُلْ إِنَّمَا أَعْطَاكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ إِنَّ تَقْوَىٰ مَوَٰلِدِهِ
مَشْنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا قَف (۳۵)

ترجمہ :- (اے پیغمبر اسلام!) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ ڈو ڈو ایک ایک ہو کر اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ پھر ذرا سوچ سمجھ لو۔

علم و یقین کے بہت بڑے ذرائع سمع و بصر اور فؤاد ہی ہیں آدمی بے شمار باتوں کا علم خود دیکھ کر، لوگوں سے سُن کر اور عقل و بصیرت سے غور و فکر کر کے ہی حاصل کرتا ہے اور قرآن کریم نے انسان کی ان تینوں قوتوں کو جا بجا بڑی ہی اہمیت دی ہے۔ سورہ مؤمنون میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ
وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۳۶)

ترجمہ :- اور اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان
آنکھیں اور دل پیدا کئے ہیں۔ اُف! تم کس قدر کم شکر گزار
کرتے ہو۔

بہر حال قرآنی تعلیمات کے مطابق ایک مسلمان کا جو نقشہ
ہونا چاہیے وہ ان آیاتِ کریمہ اور ان جیسی دیگر سینکڑوں آیات
کریمہ کے آئینہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے جس میں تفکر و
تدبر، تفقہ اور تعقل پر زور دیا گیا ہے۔ اس نقشہ کو ذہن میں
رکھئے اور پھر ان شبیہوں کو ذہن میں لائے جو دیوانِ حافظ
مثنوی مولانا روم کھولے بیٹھے ہیں یا چند پرچیوں پر کچھ نام لکھ
کر لوٹا گھما رہے ہیں یا قرعے نکال رہے ہیں اور ایمان داری
کے ساتھ بتائے کہ یہ تصویریں اس قرآنی نقشہ پر ذرا بھی فٹ
بیٹھتی ہیں جو قرآن کریم نے ایک مردِ مؤمن کا پیش فرمایا
ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ یہ شبیہیں اس نقشہ پر قطعاً فٹ
نہیں بیٹھتیں جو قرآن کریم نے اللہ کے بندوں کا پیش فرمایا
ہے۔ چہ جائیکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ
کو اس نقشہ پر فٹ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے۔ حیرت
ہوتی ہے کہ ہمارے عہد کے ایک عالم اور مفکر یعنی مولانا
سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیرِ تفہیم القرآن میں
رقم طراز ہیں۔

(۱) بشر کا نہ فال گیری (یعنی کوئی مؤمنانہ فال گیری بھی
ہوتی ہے۔ مؤلف) جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے

قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کے لئے کعبہ کے اندر ہہیل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو یا کسوتی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی بھی کام ہو اس کے لئے ہہیل کے پانسہ دار (صاحب القدر) کے پاس پہنچ جاتے اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہہیل سے دعا مانگتے کہ ہمارا معاملہ کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ دار ان تیروں کے فلیجے فال نکالتا اور جو تیر بھی نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہہیل کا فیصلہ سمجھا جاتا۔

(۴۲) تو ہم پرستانہ فال گیری جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعہ کیا جاتا یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی جن کا وسیلہ علم غیب ہونا کسی عملی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جفر، مختلف قسم کے شگون اور نیچتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جوئے کی قسم کے وہ سارے کعبیل اور کام جن میں
اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی
فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر
رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص
کا نام نکل آیا ہے لہذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے
نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے
یا یہ کہ عملی حیثیت سے تو ایک معممہ کے حل کے بہت
سے صبیح حل ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جو کسی
معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے
اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ معممہ کے
صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی
کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی
ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے
حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز
پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے
اور فیصلہ کرنے والے کے لئے ان میں سے کسی کو
ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور
خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق چھوڑنے
کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی
سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار رکھا جاسکتا ہے۔ یا

مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذہب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جاسکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔

(تفہیم القرآن ۲۲۲-۲۲۳)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جو تین صورتیں حرام قرار دی ہیں ان میں جیسا کہ ظاہر ہے اور مولانا مرحوم نے خود بھی اعتراف فرمایا ہے تیسری صورت تو جوئے اور قمار یعنی میسر کی ہے اسے اذ لاء میں شامل کر لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ آیت نمبر (۳۶) میں اَلْمَيْسِرُ کا لفظ صراحتاً آگیا ہے جس سے جوئے کی تمام صورتیں خود بخود حرام ہو گئی ہیں۔ اب اذ لاء سے بھی جوئے کی صورتیں مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ جو چیز پہلے ہی حرام ہو چکی ہے اسی کو دوبارہ اُسی آیت میں حرام قرار دینا غیر مفید تکرار ہے۔ لہذا اذ لاء سے مراد پہلی دو صورتیں ہی ہوں گی۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسی وجہ سے اذ لاء کا مصداق پہلی دو صورتیں ہی قرار دی ہیں۔

اور اسی کو حافظ عماد الدین ابن کثیر اور دیگر محققین کے حوالے سے راجح قرار دیا ہے۔ اب رہ گئی جو سختی صورت جسے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قرعہ اندازی کی جائز صورت قرار دیا ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ بعینہ وہی دوسری صورت ہے جسے مولانا مودودی نے حرام قرار دیا ہے۔ یعنی زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعہ کیا جاتا ہے یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلہ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔

سفر میں کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی کرنا قطعاً اسی صورت میں آتا ہے۔ یہاں آپ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کے لئے فیصلہ کسی عقلی و فکری معقول وجہ سے نہیں فرماتے مثلاً اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ سمجھ دار ہیں، زیادہ فقیہ ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ مزاج شناس ہیں اور ان کی وجہ سے سفر میں آنا اور اطمینان کی زیادہ توقع ہے بلکہ محض وہمی، خیالی یا اتفاقی شے سے فرماتے ہیں کہ ان کا نام قرعہ میں نکل آیا ہے جو قطعاً قرآن کریم کی رو سے ممنوع ہے۔ لہذا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح کے فیصلے فرمانے کے عادی رہے ہوں۔ پھر عجیب بات ہے کرج اور عمرہ کے علاوہ

دیگر اسفار میں جہاں اس قرعہ اندازی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے صرف تین ایسے اسفار ہیں جن میں آپ نے قرعہ اندازی فرمائی ہے ایک تو غزوہ بنی مصطلق کا سفر جس سے واقعہ افک کا تعلق جوڑا گیا ہے۔ دوسرے ایک اور سفر کا واقعہ جس میں آیت تیمم نازل ہوئی۔ تیسرے ایک اور سفر کا واقعہ جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی سفر میں ہمراہ ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی سواری کا اونٹ بدل لیتی ہیں۔ کیونکہ دورانِ سفر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے قریب رہا کرتے تھے۔ لیکن ان تینوں سفروں میں حضرت عائشہ ضرور ساتھ ہیں۔ تو کیا قرعہ اندازی میں ہر مرتبہ حضرت عائشہ مدلیقہ کا نام ہی نکلا کرتا تھا۔ تیسرے واقعہ میں اگرچہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں مگر حضرت عائشہ مدلیقہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ ہی موجود ہیں۔ تو ایسی قرعہ اندازی سے کیا فائدہ محقق جس میں ہر مرتبہ ایک ہی نام نکالا جاتا تھا۔

لے جسٹس کیانی مرحوم نے ایک مرتبہ مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے صدارتی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیابی پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کچھ دن ہوئے ہم چند احباب انگلینڈ گئے اور وہاں ایک ہوٹل کے کمرہ میں ہم لوگوں نے قیام کیا۔ ہم پانچ چھ آدمی تھے روزانہ ہوٹل کا بے مروج کا کھانا کھاتے کھاتے اکٹھے گئے۔ جی چاہا کہ کیوں نہ اپنے کمرہ میں مرغ خود پکا لیا جائے۔ چنانچہ بازار سے زندہ مرغ خرید لائے کیونکہ

اول تو سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی نہ کسی زوجہ محترمہ کو ساتھ لئے بغیر نہ جانا ہی محل تامل ہے۔ آپ نے زیادہ تر سفر جنگ و جدال اور جہاد کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ عمرہ کے لئے اور ایک مرتبہ حج کے لئے سفر فرمانا ثابت ہے۔ عمرہ اور حج کے سفر میں تو ازواج مطہرات کا ساتھ لے کر جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن جنگی اسفار میں مستورات کو ساتھ لے کر جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ مستورات کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یقیناً اس کا کوئی مقصد تو ہوتا ہوگا۔ بلاوجہ تو نعوذ باللہ آپ انہیں ساتھ ساتھ ساتھ لے پھرنے سے رہے یقیناً اس میں آپ

گوشت خریدنے میں یہ اندیشہ تھا کہ باقاعدہ ذبیحہ کا گوشت نہ ہو، مگر اب یہ سوال حل طلب تھا کہ اس کو ذبح کہاں کریں اور کون ذبح کرے پہلا سوال تو ہم نے یوں حل کر لیا کہ باختر روم میں چپکے سے ذبح کر لیا جائے رہا دوسرا سوال تو کوئی شخص بھی ذبح کرنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ لاؤ قرعہ ڈال لیجیے جس کا نام نکل آئے وہی یہ فرض انجام دے چنانچہ میں نے چھ پرچیاں بنائیں اور ایک صاحب سے جن کا نام محمد ایوب تھا میں نے درخواست کی کہ کوئی سی پرچی اٹھا لیں۔ انہوں نے ایک پرچی اٹھا کر کھولی تو اس میں محمد ایوب ہی لکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ میں نے چھیوں پرچیوں پر ایک ہی نام یعنی محمد ایوب ہی لکھا تھا۔ وہ جو سی پرچی بھی اٹھاتے۔ محمد ایوب ہی نکلتا تھا۔ تو کیا معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی ایسا ہی گھپلا فرمایا کرتے تھے۔

نے کوئی خاص مصلحت سمجھی ہوگی کہ مستورات کو بھی ساتھ لیا جائے۔ مثلاً تبلیغ وارشاد یا ازواج مطہرات کی تعلیم و تربیت کیونکہ سفر میں مختلف آبادیوں پر گزر ہوتا تھا۔ وہاں مردوں کے علاوہ عورتوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا۔ لہذا یہ ازواج مطہرات عورتوں کو تبلیغ وارشاد فرمائیں گی یا خود کچھ مسائل جو سفر میں پیش آئیں گے سیکھیں گی۔ نیز اگر جنگ ہوئی تو زخمیوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھا کر لائیں گی۔ ان کو پانی پلائیں گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مصلحتیں ایسی ہیں کہ عقل و فکر کی بناء پر کسی ایک کو دوسری ازواج پر ترجیح دی جاسکتی تھی مثلاً کسی کا فقیہ اور عالم ہونا۔ زیادہ سمجھ دار ہونا۔ جوان اور چاق چوبند ہونا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان عقلی و فکری ترجیحات سے قطعاً نہیں بلکہ محض قرعہ اندازی سے ترجیح کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ ان حضرات نے غالباً یہ سمجھ رکھا ہے یا وہ دوسروں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مستورات کو ان اسفار میں ساتھ لے کر جانے کا کوئی بلند مقصد یعنی تبلیغی یا تعلیمی نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا پست اور فروتر مقصد تھا جس میں ہر بیوی برابر اور مساوی درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ مولانا مودودی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ ”دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کیلئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرعہ اندازی کے اس تصور کی ہرگز تائید نہیں کر سکتے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی کا یہ طریق قطعاً مشرکانہ اور توہم پرستانہ تھا اور قرآن کریم نے اس کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ آپ ایسا کرتے ہوں چہ جائیکہ بقول مولانا مودودی بالعموم فرماتے ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ کوئی ہمارا ہی ذاتی افحش نہیں ہے۔ بلکہ بقول قسطلانی الحنفیہ اور مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ وَالْمَشْهُورُ عَنِ الْمَالِكِيَّةِ وَالْحَنْفِيَّةِ عَدَمُ اِعْتِبَارِ الْقِرْعَةِ (ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للعلامة القسطلانی ص ۱۸) یعنی فقہائے مالکیہ اور حنفیہ سے مشہور یہی ہے کہ قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یہی تحریر فرمایا ہے انہوں نے ذرا تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

زاد ابن سعد من وجه اخر عن القاسم عن عائشة ؓ فكان اذا خرج سهم غیری عرف فيه الكراهية واستدل به على مشروعية القرعة في القسمة بين الشركاء وغير ذلك كما تقدم في اوائل الشهادات والمشهور عن الحنفية والمالكية عدم اعتبار القرعة قال عياض هو مشهور

عن مالک واصحابه لانه من باب الخطر
 القمار وحكى عن الحنفية آه وقد قالوا به
 في مسألة الباب واحتج من منع من المالكية
 بان بعض النسوة قد تكون النفع في السفر
 من غيرها فلو خرجت القرعة للنفع لا نفع
 بها في السفر لا ضرر بحال الرجل وكذا بالعكس
 قد يكون بعض النساء اقرب ببیت الرجل
 من الاخرى - (فتح الباری ص ۲۲۳)

توجہ - ابن سعد نے دوسری سند سے قاسم عن
 عائشہ اٹنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ
 جب قرعہ میں میرے علاوہ کسی دوسری زوجہ مطہرہ کا
 تیر لکل آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ
 اقدس سے ناگواری نمایاں نظر آتی تھی۔ اس حدیث سے
 قرعہ اندازی کے جواز پر شرکاء میں چیزوں کے تقسیم وغیرہ
 کے بارہ میں استدلال کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب الشہادات
 کے اواخر میں گزر چکا ہے۔ لیکن حنفیہ اور مالکیہ سے
 قرعہ اندازی کا معتبر نہ ہونا ہی مشہور ہے۔ قاضی عیاض
 نے فرمایا ہے کہ امام مالک سے یہی مشہور ہے کیونکہ یہ منوطاً
 اور جوئے کے ذیل میں آتا ہے اور حنفیہ سے بھی ایسا ہی نقل
 کیا گیا ہے! بخ ان فقہار نے قرعہ کے مسئلہ میں ایسا ہی فرمایا
 ہے۔ مالکیہ میں سے جن حضرات نے اس سے منع فرمایا ہے

انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ بعض عورتیں سفر میں دوسری عورتوں سے زیادہ مفید ہو سکتی ہیں، تو اگر قرعہ اس عورت کے نام کا نکل آیا جس سے سفر میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو یہ بات مرد کے لئے نقصان رساں ہوگی اسی طرح اس کے برعکس بعض عورتیں آدمی کے گھر کا بہترین انتظام کرنے والی ہوتی ہیں بہ نسبت دوسری عورتوں کے۔

بہر حال علامہ قسطلانی اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات کے مطابق فقہائے حنفیہ اور فقہائے مالکیہ کے نزدیک قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور حضرات فقہائے مالکیہ نے جو اس کے خلاف دلیل دی ہے اس سے بھی ہمارے اس شبہ کی تائید ہوتی ہے کہ ساری عورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ بعض بیویاں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا اپنے شوہر کے ساتھ سفر میں ساتھ جانا شوہر کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے اور بعض کا فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض عورتوں میں انتظامی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم ہوتی ہے۔ لہذا بعض بیویوں کو گھر کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بعض کا گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قرعہ اندازی کر کے فیصلہ کرنا عام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے قرعہ اندازی اور فال گیری کے طریقوں کی مخالفت فرمائی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق اس روایت میں جو

بخاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کی ہے۔
 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ قرعہ میں
 اگر حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجہ مطہرہ کا نام نکل
 آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جہرۃ مبارک پر ناگواری
 کے آثار نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ناگواری
 ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرعہ اندازی فرماتے ہی
 کیوں تھے۔ قرعہ اندازی فرمانے کی آپ پر کوئی پابندی تو تھی نہیں
 قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس میں آپ کو اس کا حکم
 دیا گیا ہو۔ جو فقہائے کرام اس قرعہ اندازی کے مؤید ہیں وہ بھی
 اس پر متفق ہیں کہ آپ کو پورا پورا اختیار تھا کہ جس بیوی کو
 آپ چاہتے اپنے ساتھ سفر میں لے جاسکتے تھے۔ پھر اس فضول
 تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرعہ اندازی
 کے ذریعہ فیصلہ فرما کر کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کا تذکرہ روایات
 میں صرف تین مرتبہ آتا ہے اور تینوں مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ
 ضرور ساتھ ہیں۔ دو مرتبہ تنہا اور تیسری مرتبہ حضرت حفصہ
 رضی اللہ عنہا کے ساتھ۔ تو یہ کیسی قرعہ اندازی ہوا کرتی تھی کہ
 ہر مرتبہ حضرت عائشہؓ کا نام ہی نکلتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا
 گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجہ محترمہ کا نام
 قرعہ میں نکلتا تھا تو آپ کو ناگواری بھی ہوتی تھی۔ لیکن کسی
 ایسے سفر کا کہیں تذکرہ بھی نہیں ملتا جس میں حضرت عائشہؓ کا
 نام نہ نکلا ہو بلکہ تنہا کسی اور زوجہ مطہرہ کا نام نکل آیا ہو۔

یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ہماری فہم سے بالا ہیں۔ اس بنا پر ہماری قطعی رائے ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ آپ قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ ہم پوری تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی قرآن کریم کے قطعاً خلاف یعنی بالکل حرام، فسق، گندہ کام اور شیطانی عمل ہے۔ لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ارتکاب فرماتے ہوں۔ اصولی حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن کریم کے خلاف جو بھی روایت ہو وہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصویر بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ خدا نخواستہ قرآن کریم کے خلاف کوئی عمل فرماتے ہوں۔ بہر حال یہ روایت ایک تو اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

دوسری بات جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ روایت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کی ہے جن کے متعلق ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ امام زہریؒ کو ہمارے محدثین کتنا ہی بڑا امام حدیث کیوں نہ تصور کرتے ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ موصوف پر تشیع کا شبہ کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ جتنی حدیثیں ایسی آگئی ہیں کہ ان سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کوئی قابل اعتراض بات نکلتی ہو اس میں امام زہری کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادہ کے متعلق کہ ان کا نام عبدالغری

رکھا گیا تھا۔ اس کے خالق بھی یہی محترم ہند گ ہیں۔ یہی حضرت اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت قرآن مجید کسی چیز پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ نیز ابن شہاب زہری ہی اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ سورۃ النجم کی تلاوت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ابلیس لعین کے زیر اثر تِلْكَ الْغَوَايِئُ الْمَعْنٰی کے کلمات جاری ہو گئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق وہ روایت بھی ان حضرت ہی کا کارنامہ ہے کہ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ رجم کی آیت کے متعلق حضرت عمرؓ کے خطبہ کو نقل کرنے والے بھی یہی حضرت ہیں کہ رجم کی آیت قرآن میں نازل ہوئی تھی اور بعد میں وہ آیت قرآن سے خارج کر دی گئی اور میرا (عمرؓ) جی چاہتا ہے کہ میں اسے کتاب اللہ میں لکھ دوں۔ بہر حال اس قسم کی زیادہ تر روایات ان ہی حضرت سے منقول ہیں۔ مشہور شیعہ مؤلف شیخ عباس قمی فرماتے ہیں کہ ابن شہاب زہری پہلے سنی تھے پھر شیعہ ہو گئے تھے۔

(تمتہ المنتہی ص ۱۸۱)

عین الغزال فی اسماء الرجال میں بھی ابن شہاب زہری کو شیعہ ہی بتایا گیا ہے۔ مشہور بریلوی عالم شیخ الاسلام علامہ محمد قمر الدین صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف (جوان کل اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی ہیں۔ فدک کے

انہی ابن شہاب زہری کا تذکرہ شیخ عباس قمی کی کتاب
الکافی واللقاب ص ۲۴۴-۲۴۵ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ شیعہ
اسماء الرجال کی کتاب ہے۔ اس میں ان کا ذکر ان کے تشیع
کی کھلی دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

روى الخطيب في تاريخ بغداد ص ۸۴ ان ابا بصير
الزهرى المذکور قدم العراق سنة ۸۴ھ فاکرمه
الرشيد و اظهر برة و سئل عن الغناء فافق
بتحليله -----

ترجمہ: خطیب نے تاریخ بغداد ص ۸۴ میں بیان کیا
ہے کہ ابو اسحق زہری مذکور ۸۴ھ میں عراق آئے تو
ہارون رشید نے ان کا اکرام فرمایا اور ان پر احسانات
فرمائے۔ ان سے گانے بجانے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں
نے اسے حلال قرار دیا۔

شیعہ اسماء الرجال کے امام محمد باقر ابن الحاجی میرزین الدین
موسوی الخوانساری فرماتے ہیں۔

وروى الثقة الجليل على بن محمد بن علي الغزافي
كتابہ الكفاية رواية تدل على تشيعه وروى
النص على كون الائمة اثني عشر عن علي ابن
الحسين وان المهدى سابع اولاد ابنه محمد
ابن علي ----- والذي هو الواضح في

النظر عندى في حق هذا الرجل بعد استقصائى

الكامل لكلمات المادحين له والقادحين
 والتأمل الغائر التام في سبب كل منهما وما
 هو طريق الجمع بين الأدلة التي لم يطالع على
 عمدتها صاحب التعليقات التي استظهر تشيعه
 وحسن احواله فضلا عن الشيخ الجي على الرجالى
 الذى هو لصيق عندة الفنون وقاصر عن
 ادراك ما هو عند اهله مخزون انه مرة
 كان في مبتدأ امره كما عرفت من عبارة
 تاريخ ابن خلكان من جملة علمائى اهل السنة
 ونداء حزب الشيطان ثم ان علمه وادراكه
 ادر كاه وارشداه الى الحق المبين فصيرة
 فى اواخر عمره من الراجعين الى الامام
 زين العابدين وفى زمرة المستفيدين من
 بركات انفاسه الشريفة والمستندين الى
 كلماته الطريفة والمجيبين له بيده ولسانه
 والمحافظين لغيبه المعنيتين لعظم شأنه و
 قويم برهانه فمن جملة ما دل على
 ذلك وكانه الذى رآه صاحب التعليقات
 وجعل اياه الدليل على تشيعه وكمال ايمانه
 دون رواية النص على الاثمة الاثنى عشر
 الذى فهمه صاحب المنتهى من عبارته -

(روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات ص ۲۸۹)

توجہ مد جلیل القدر اور قابل اعتماد بزرگ علی ابن محمد بن علی الخزاز نے اپنی کتاب کفایہ میں ایک روایت بیان کی ہے جو ان کے شیعہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور انہوں نے علی ابن الحسین سے یہ نص نقل کی ہے کہ ائمہ بارہ ہوں گے اور مہدی ان کے صاحبزادہ محمد بن علی کی ساتویں پشت میں ہوں گے۔ اس شخص کے بارہ میں غور و فکر کرنے کے بعد اور ان کی مدح کرنے والوں اور قدح کرنے والوں کی باتوں پر مکمل انتہائی تأمل کے بعد جو کچھ میرے نزدیک راجح ہے نیز ان دلائل میں عمیق تأمل کر کے کہ مدح اور قدح کے اسباب کیا ہیں اور ان کے درمیان میں جمع کرنے کی کیا صورت ہے جن پر صاحب تعلیقات کو واقفیت حاصل نہیں ہو سکی نہ شیخ بوعلی کو (گو کہ ان کے سامنے تمام علوم و فنون سپر افگندہ ہیں اور لوگ ان فنون کے ادراک سے قطعاً قاصر ہیں جو ان کے ہاں محفوظ ہیں) ان تمام امور پر غور و فکر کر لینے کے بعد میرا جائزہ یہ ہے کہ وہ ابتداء عہد میں کبھی جیسا کہ تاریخ ابن خلکان کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے منجملہ علمائے اہلسنت اور گروہ شیطانی کے ہم نشینوں میں سے رہے ہیں لیکن پھر ان کے علم و شعور نے ان کی حق مبین کی طرف دستگیری اور ہمنمائی کی۔ چنانچہ لن کے علم و شعور

نے ان کو آخری عمر میں امام زین العابدین کی طرف لوٹ
 آنے والوں میں سے بنا دیا اور انہیں امام زین العابدین
 کے انفاس قدسیہ کی برکت سے فائدہ حاصل کرنے والوں
 کے زمرہ میں داخل کر دیا اور ان کے عجیب و غریب
 کلمات سے سند لینے والوں اور اپنے ہاتھ اور زبان کے
 ذریعہ سے ان سے محبت کرنے والوں اور ان کی غیبت
 میں ان کی حفاظت کرنے والوں اور ان کی عظمت شناس
 اور مستقیم برہان کا اقرار کرنے والوں میں سے بنایا۔
 اور یہی منجملہ ان باتوں کے ہے جو تمہیں اس بات کی
 طرف رہنمائی کرتی ہیں اور جس کو امام شیخ بوعلی نے
 ان کے شیعہ ہونے کی اودان کے کمال ایمان کی دلیل
 بنایا ہے اور غالباً یہی وہ بات ہے جسے صاحب تعلیقات
 نے بھی دیکھا ہے مگر بارہ اماموں کے وجود کی نص کو
 روایت کرنے والی بات ان سے بھی اہم ہے جسے صاحب
 منہتی نے ان کی عبارت سے سمجھا ہے۔

دروضات الجنات فی احوال العلماء والسادات

مؤلفہ امام محمد باقر موسوی خوانساری

ان تصریحات کے بعد اس امر میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ
 محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری منجملہ شیعہ علماء کے ہیں جن کو
 حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرات شیخین
 رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے خدا کے واسطے کابیر اور لٹھی بغض ہے۔

ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کو پھیلانیں جن سے ان حضرات کی سبکی ہوتی ہو اور قرآن کریم پر لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا ہوں۔

اس کے بعد ہم اس روایت کا باقاعدہ تجزیہ کر کے بتاتے ہیں کہ درایت کے نقطہ نظر سے اس میں کس قدر خامیاں ہیں۔

(۱) سب سے پہلے تو اس پر غور فرمائیے کہ ابن شہاب زہری نے یہ حدیث چار تابعین سے روایت کی ہے۔ یعنی عروہ ابن زبیرؓ، سعید ابن المسیبؓ، حلقمہ ابن وقاصؓ اور عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعودؓ۔ لیکن پوری روایت کسی ایک راوی کی نہیں ہے۔ بلکہ روایت کا کچھ حصہ ایک راوی نے بیان کیا، کچھ حصہ دوسرے نے کچھ تیسرے نے اور کچھ چوتھے نے اور ابن شہاب زہری نے ان سب کی روایتوں کو جوڑ کر ایک مربوط کہانی مرتب کر لی ہے۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ حدیث کا کوئی خاص ٹکڑا چونکہ کسی ایک راوی کی طرف منسوب نہیں ہے لہذا اگر کوئی انکار کرنے لگے تو آسانی کے ساتھ اس کا منہ بند کیا جاسکتا ہے کہ میں نے کب کہا ہے کہ یہ بات آپ نے بیان کی تھی؟ آپ نے بیان نہیں کی تو دوسرے لوگوں میں سے کسی نے بیان کی ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی دوسرا راوی اگر انکار کرنے لگے تو اس کا منہ اسی طرح بند کیا جاسکتا ہے۔ راوی کو

لے یہاں مجھے امام ابو زرہؒ، محدث اور امام احمد ابن حنبلؒ کا واقعہ یاد آ گیا کہ وہ جامع مسجد کوفہ کے دروازہ پر پہنچے تو ایک صاحب

متعین طور پر بتانا چاہیے کہ اس کے کون کون سے استاد نے کون سی بات بیان کی ہے تاکہ اس کی تحقیق اور پھر اس کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکے۔ ایسی مجہول روایت کا کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے (فتح الباری ص ۶۹) میں فرمایا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ محدثین نے زہری کے اس طرز عمل پر سخت تنقید کی ہے جو انہوں نے اپنی اس روایت کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے کہ چار راویوں کی روایات کو خلط ملط کر کے ایک روایت بنا ڈالی ہے۔ انہیں چاہیے تھا کہ ہر راوی کی روایت الگ الگ بیان کرتے۔ اُسی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے

وہاں وعظ فرما رہے تھے اور ان دونوں حضرات ہی کے حوالہ سے روایا بیان کر رہے تھے۔ اپنا نام سن کر ان دونوں حضرات کے کان کھڑے ہوئے۔ دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ روایات قطعاً من گھڑت تھیں۔ وعظ ختم ہوا تو امام ابو زرعہؒ آگے بڑھے اور ان داعظ صاحب سے عرض کیا کہ میں ابو زرعہ ہوں اور یہ احمد ابن حنبل ہیں۔ ذرا بتائیے کہ یہ حدیثیں ہم نے آپ سے کب بیان کی تھیں؟ ہم نے تو یہ حدیثیں آپ سے کبھی بھی بیان نہیں کیں۔ بجائے شرمندہ ہونے کے وہ صاحب نہایت دیدہ دلیری سے بولے کہ اے یحییٰ ابو زرعہ اور احمد ابن حنبل آپ ہی رہ گئے ہیں۔ میاں! ستر ابو زرعہ ہیں اور ستر ہی احمد ابن حنبل ہیں جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ اس نام کے آدمی دنیا میں صرف آپ ہی تو نہیں ہیں۔ منہ

ہیں کہ میں نے روایات کو تلاش کیا تو مجھے عروہ اور علقمہ کی روایتیں
 الگ الگ مل گئیں لیکن دونوں روایتوں کے سیاق میں، زہری کے
 اس سیاق سے جو انہوں نے چاروں راویوں سے نقل کیا ہے
 بڑی مخالفتیں، نقص، اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں۔ مزید برآں
 انہوں نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ راوی نے یہاں تو روایت یوں
 شروع کی ہے کہ ”حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے
 یوں فرمایا۔ لیکن فلیح“ راوی نے اپنی روایت یوں شروع کی ہے کہ
 زعموا ان عائشہ قالت یعنی ان چاروں راویوں کا یہ خیال ہے
 کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا ہوگا۔ یعنی انہیں اس بات کا
 یقین نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ
 فرماتے ہیں کہ دَعَمَ کاللفظ عربی زبان میں قَالَ کی جگہ بھی استعمال
 ہو جاتا ہے یعنی کہنے والے کو تردید نہ ہو۔ لیکن یہاں اس لفظ
 کو استعمال کرنے میں غالباً راز یہ ہے کہ زہری کے تمام
 استادوں نے ان کے سامنے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی
 کہ انہوں نے یہ روایت حضرت عائشہؓ ہی سے سنی ہے۔ وہ کہتے
 ہیں کہ حافظ کرمانیؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(فتح الباری ص ۱۶۱)

ان تمام باتوں سے اس روایت کی قدر و قیمت متعین کرنے
 میں جو اہم مدد مل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) دوسری بات اس روایت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ کیونکہ پردہ
 کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ لہذا (کچھ آدمی) انہیں (حضرت عائشہؓ

کو ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اتارتے تھے۔ ہودج اونٹ کا تھا۔ ہاتھی کا تو تھا نہیں۔ اونٹ کا ہودج (کجاوہ) جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے در حصے ہوتے ہیں جو اونٹ کے کوبان کے دونوں طرف ہوتے ہیں جب تک ان دونوں حصوں کا وزن برابر نہ ہو۔ یعنی دونوں طرف دو آدمی برابر وزن کے سوار نہ ہوں اسے اونٹ پر نہ کسا جاسکتا ہے نہ چڑھایا جاسکتا ہے۔ اگر ہودج میں ایک طرف تو کوئی سوار موجود ہو اور دوسری طرف کوئی سوار نہ ہو تو اسے اونٹ پر چڑھایا ہی نہیں جاسکتا۔ دوسری طرف بھی کوئی سواری ہونی چاہیے یا کوئی وزنی چیز رکھنی چاہیے۔ ورنہ ہودج گر پڑے گا یہی وجہ ہے کہ مع سواری کے ہودج کو اونٹ پر نہیں چڑھایا جاسکتا۔ پہلے ہودج باندھا جاتا ہے۔ اس کے بعد سواری کو ہودج میں بٹھایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معمول کے خلاف مع سواری کے ہودج چڑھایا جا رہا ہے۔ اور سواری کو متنبہ بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ ہودج کا وزنی توازن درست کر لے۔ جس طرف آدمی سوار ہے وہ یا تو دوسری طرف کسی آدمی کو بٹھائے گا یا اُدھر کوئی وزنی چیز رکھے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہودج میں دوسری طرف کوئی وزنی چیز ہودج کا توازن قائم رکھنے کیلئے پہلے سے رکھی ہوئی تھی تو پھر بھی چونکہ ہودج میں حضرت عائشہؓ موجود ہی نہیں ہیں تو لامحالہ ان کی جہت خالی ہے۔ ہودج کو فوراً گر جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہودج گرنا بھی نہیں ہے۔ چنانچہ پوری ایک

منزل کے سفر میں کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہو سکا کہ ہودج خالی ہے اور حضرت عائشہؓ موجود نہیں ہیں لہذا ان کو تلاش کیا جائے۔

(۳) بخاری ہی میں ابن ابی ملیکہ عن القاسم عن عائشہؓ کی سند سے کتاب النکاح (باب القرعة بین النساء اذا اراد سفرًا) میں ایک روایت آئی ہے کہ ایک سفر میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ آنحضرت کے ساتھ سفر میں تھیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے ساتھ رات بھر چلتے تھے اور حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو یہ تجویز پیش کی کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں اونٹ بدل لیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ چمک میں آگئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر اسی اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جس پر بجائے حضرت عائشہؓ کے حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور سارے رات بھر کے سفر میں حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت سے محروم رہیں اور منزل پر پہنچ کر حضرت عائشہؓ نے اذخر میں اپنے پاؤں خوب ملے اور رگڑے اور خود کو کوسنے دیئے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں حضرت عائشہؓ کو تنہا نہیں چھوڑتے تھے ان کے اونٹ کے ساتھ ساتھ رہتے اور باتیں کرتے ہوتے چلتے تھے یہی آپ کی عادت تھی۔ مگر اس سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات بھر سفر میں حضرت عائشہؓ کی کم شدگی کی کوئی

خبر نہیں ہوتی بلکہ منزل پہ پہنچ کر بھی دوپہر ہو گیا اور آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہوتی۔ تا آنکہ وہ حضرت صفوان کے ساتھ قافلہ میں پہنچ گئیں۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے لوگوں کو آپ کی گم شدگی اور حضرت صفوان ابن معطل کے ساتھ قافلہ میں آمد کی اطلاع ہوئی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملا۔ تعجب ہے کہ خلافِ عادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ سے اس درجہ غافل رہے۔ یہ بات بھی محلِ تأمل ہے۔

(۴) ابن شہاب زہری کی اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواجِ مطہرات قضائے حاجت کے لئے رات کو جنگل تو جایا کرتی تھیں مگر تنہا نہیں جاتی تھیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں قضائے حاجت کے لئے آپ کے جنگل جانے کا تذکرہ کیا گیا ہے تو حضرت ام مسطحؓ آپ کے ساتھ ہیں عجیب بات ہے کہ مدینہ منورہ میں تو آپ قضائے حاجت کیلئے جنگل جاتی ہیں تو کسی نہ کسی عورت کے ساتھ جاتی ہیں لیکن سفر میں جہاں کے جنگل سے آپ واقف بھی نہیں ہیں قضائے حاجت کے لئے جاتی ہیں تو تنہا چلی جاتی ہیں اور ایسے چپ چاپ تے چلی جاتی ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور نہ پورے لشکر اسلام میں کوئی آپ کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کا قیام منزل پر

اگر ہو گا تو وہ کسی درمیان جگہ پر ہو گا۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ شکر کے کمانڈر کا قیام شکر کے قلب میں ہوا کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تو ویسے بھی شکر کے درمیان ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ صحابہ آپ کو اور آپ کی حرم محترم کو سفر میں کسی یکسو مقام پر تو چھوڑنے سے رہے جبکہ آپ کی حفاظت وصیانت کا فریضہ بھی ان پر عائد ہوتا تھا۔ یہ بات بھی محل تامل ہے۔

(۵) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم سنی اور کم وزنی کا چہر چاروں رو و شور سے کیا گیا ہے۔ ہم دلائل سے بتا چکے ہیں کہ ان کی کم سنی کا افسانہ بالکل غلط ہے ان کا نکاح کم از کم سولہ سال کی عمر میں اور رخصتی کم از کم انیس سال کی عمر میں ہوئی ہے اور غزوہ بنی مصلوق میں جو ۵۷ھ میں ہوا ہے ان کی عمر کم از کم بائیس سال تو ضرور ہے۔ بائیس سال کی عمر والی عورت کو کم سن اور کم وزن قرار دینا کہ ہودج اٹھا کر اونٹ پر کھنسنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ کوئی اس ہودج میں سوار ہے یا نہیں عجیب بات ہے۔ بائیس سال کی ایک عورت وہ کتنی ہی دہلی پتلی اور لاغر کیوں نہ ہوا تھی بے وزن تو لا محالہ نہیں ہو سکتی کہ ہودج اٹھانے والوں کو انداز ہی نہ ہو سکے کہ کوئی ہودج میں سوار ہے یا نہیں۔

(۶) بار کا ٹوٹ کر اس طرح گر جانا اور حضرت عائشہ کو شکر اسلام کے قریب پہنچنے تک اس کا علم نہ ہونا بھی محل تامل ہے۔

جبکہ یہ ہاریمنی منکوں کا تھا اور ایک مرتبہ اور بھی (واقعہ متیمم میں) ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ یہ ہار بار بار کیوں ٹوٹتا تھا؟ کیا اس کو ہمیشہ کچے دھلا گے میں پرویا جاتا تھا؟ یمنی منکوں کے ہار میں کچھ وزن تو ضرور ہونا چاہیے۔ اس ہار کا ٹوٹ کر گر جانا اور پہننے والی عورت کو معلوم نہ ہونا بھی حیرتناک ہے۔ پھر حضرت عائشہؓ بقول راوی کے (قضائے حاجت کے لئے دور جاتی ہیں۔ واپس آتی ہیں اور شکر اسلام میں اپنی سواری کے قریب پہنچتی ہیں اور سینہ پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو ان کو علم ہوتا ہے کہ ہار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ہار کو تلاش کرنے کے لئے دوبارہ جاتی ہیں۔ مگر بار بار آنے اور جانے کے باوجود شکریوں میں سے کسی نے بھی ان کو نہ دیکھنا اور بھی باعث تعجب ہے۔ شکر اسلام کے درمیان سے ان کا ایک مرتبہ قضائے حاجت کے لئے جانا۔ پھر واپس آنا اور اپنی سواری تک پہنچنا اور ہار کی غیر موجودگی کا علم ہو کر پھر دوبارہ واپس جانا۔ یہ اُن کے تین چکر ہو گئے۔ تعجب ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ کیا انہوں نے داستانِ امیر حمزہ کی کلاہ سلیمانی اوڑھ رکھی تھی کہ وہ سب دیکھتی رہیں اور خود کسی کو نظر نہیں آئیں۔ کتنی خلافِ عقل بات ہے۔

(۷) روایت میں بتایا گیا ہے کہ ”وہ ہار اسلامی لشکر کے روانہ ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ کو ملا۔ ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اس خیال

سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہوگا تو انہیں ڈھونڈتے اسی جگہ آئیں گے۔ کچھ دیر بعد انہیں نیند آگئی اور وہ سو گئیں۔ یہ ساری بات انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ایک نوجوان عورت (بلکہ بقول راوی ایک کسن لڑکی) جنگل بیابان میں۔ جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں۔ (عرب کے ریگستانوں کا منظر ذہن میں رکھیے) آدم ہے نہ آدم زاد۔ عورت تنہا ہے۔ وہ اپنے کارواں سے بچھڑ گئی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ وہ وہاں اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے کہ مسلمانوں کو میری گم شدگی کا علم ہوگا۔ تو خود ہی ڈھونڈنے آئیں گے اور وہ مزے سے سو جاتی ہے واضح رہے کہ یہ سہمہ کا واقعہ ہے جب کہ ہر طرف مشرکین عرب کا غلبہ تھا۔ جولہی وحشت و بربریت میں ضرب المثل تھے۔ ان حالات میں تو اچھے سے اچھا سو رہا بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا چہ جائیکہ ایک کسن اور نوعمر لڑکی۔ کس قدر خلاف فطرت بات ہے کہ ایک کسن اور نوعمر لڑکی کو نہ کوئی وحشت لاحق ہوتی ہے نہ گھبراہٹ بلکہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے اور یہ سکون حالت میں اس کی آنکھ بھی لگ جاتی ہے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ ان حالات میں خود امام زہری ہوتے تو ان کا زہرہ بھی آب ہو جاتا۔ کہاں کی نیند اور کہاں کا سکون و اطمینان۔ یہ خلاف فطرت گھڑا ہوا افسانہ نہیں تو اود کیا ہے۔

(۸) جن لوگوں نے ایک لشکر کے ساتھ اونٹوں پر کبھی سفر کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ لشکر کی روانگی کے وقت انتہائی شور و شغب ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اونٹوں کے ذریعہ سفر کیا جا رہا ہو تو صرف اونٹوں کے بلبلا نے کی آواز ہی اتنی شدید ہوتی ہے کہ میلوں تک سنی جاسکتی ہے۔ حیرت ہے کہ حضرت عائشہؓ کو لشکر کی روانگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ان کو لشکر کی روانگی کا علم اس وقت ہوا جب وہ پڑاؤ پر پہنچیں چنانچہ راوی کہتا ہے کہ ”مار کو لے کر وہ اپنی منزل پر پہنچیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا“ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کی روانگی کا علم تو انہیں لشکر اور اونٹوں کے شور و غوغا سے ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ روانگی کے شور و غوغا کو سننے کے ساتھ ساتھ انہیں واپسی میں انتہائی سرعت کرنی چاہیئے تھی۔ بھاگنا دوڑنا چاہیئے تھا۔ لشکر کو چیخ کر بلند آواز سے روانگی سے روکنا چاہیئے تھا۔ مگر حضرت عائشہؓ جو راوی کے بیان کے مطابق نہایت کم سن اور کم عمر لڑکی تھیں انہوں نے فطرت انسانی کے خلاف نہ شور کیا نہ کسی کو آواز دی۔ نہ وہ بھاگیں نہ دوڑیں نہ کسی قسم کی گھبراہٹ اور توحش کا اظہار فرمایا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ صمۃ بنت مہزیار کے دانے ہی ڈھونڈتی رہیں اور جب تک ایک ایک دانہ تلاش نہیں کر لیا وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہیں۔ اسلامی لشکر منزل سے روانہ بھی ہو گیا اور انہیں کانوں کان خبر بھی نہیں

ہوئی۔ رات کی تاریکی میں ان دانوں کو تلاش کرنا بجائے خود ایک حیرت ناک بات ہے۔ نہ کوئی روشنی ساتھ ہے۔ نہ لالٹین ہے نہ طارج ہے رات کو اندھیرے میں وہ دانے ملے تو کیسے ملے۔

(۹) حضرت صفوان ابن معطل سلمیٰ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہو گئے اسلامی شکر کے پیچھے رہا کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے، عجیب بے تکلی بات ہے۔ صفوان بن معطل سلمیٰ اسلامی شکر ہی کا ایک جزو تھے۔ وہ اسلامی شکر کے پیچھے رہا کرتے تھے تاکہ شکر کی گری پڑی چیزیں اٹھالیں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک منزل پیچھے رہا کرتے تھے۔ کیونکہ اسلامی شکر شروع رات میں روانہ ہو چکا ہے اور صفوان ابن معطل اس منزل پر صبح سویرے پہنچے ہیں۔ بہر حال یہ بات غور طلب ہے کہ وہ اتنا پیچھے کیوں رہتے تھے۔ اگلی منزل پر وہ حضرت عائشہؓ کو لے کر اسلامی شکر کے پڑاؤ پہنچ گئے ہیں اور اسلامی شکر ہی کے ساتھ انہوں نے بھی قیام کیا ہے۔ تو اس سے پچھلی منزل میں وہ شکر سے اس قدر دور کیوں ہو گئے تھے۔ پیچھے رہنے کا مطلب تو یہ ہونا چاہیے کہ صفوان بھی شکر کے ساتھ قیام کریں لیکن اس کے ساتھ روانہ نہ ہوں بلکہ ایک دو گھنٹے کے بعد روانہ ہوں تاکہ شکر کی گری پڑی چیز اُٹھاتے لائیں۔ واضح رہے کہ عرب میں جو ایک ریگستانی ملک ہے سفر عام طور پر رات کو کیا جاتا ہے اور صبح ہونے پر شکر پڑاؤ کر لیتا ہے۔ ایک منزل بارہ کوس یعنی اٹھارہ میل

کی ہوتی ہے۔ ایک ایسے علاقہ میں جہاں قدم قدم پر خطرات ہوں اور ہر طرف دشمن ہی دشمن ہوں ایک تنہا آدمی کو لشکر سے اتنی دور یعنی اٹھارہ میل کے فاصلہ پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہ بات خلاف عقل اور خلاف مصلحت ہے۔ کیونکہ وہ بھی تو اسلامی لشکر ہی کا ایک فرد ہے۔

(۱۰) بتایا گیا ہے کہ ”کیونکہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ لہذا وہ دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ کو پہچان گئے اور کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ حضرت عائشہؓ نے سوائے استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی۔ یہ بھی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ صفوان ابن معطل کو علم غیب تو تھا نہیں۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ حضرت عائشہؓ لشکر سے بچھڑ گئی ہیں اور تنہا یہاں ریگستان بھی پڑی ہیں اور وہ اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون بھی پڑھتے ہیں مگر وہ اپنی ماں (ام المؤمنین) سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ یہ حادثہ کیوں اور کیسے پیش آیا۔ وہ کس وجہ سے پیچھے رہ گئیں۔ وغیرہ ذلک۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی عجیب بات اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کی وجہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اسے قصد و ارادہ بھی نہیں

کرنا پڑتا۔ یہ باتیں بلا ارادہ اس سے صادر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بلا ارادہ ان کی زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکل گیا تھا دوسری باتیں بھی (از قسم استفسارات) بلا ارادہ ان کی زبان سے نکلتی چاہئیں تھی۔

(۱۱) بتایا گیا ہے کہ اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اوردیناٹین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔ سوال یہ ہے کہ منافق کسے کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو زبان سے اسلام لانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود کو مسلمان کہتے ہیں اور تمام اعمال مسلمانوں جیسے کرتے ہیں۔ البتہ ان کے دل میں اسلام وایمان نہیں ہوتا۔ وہ دوسری طرف کفار سے بھی ملے رہتے ہیں۔ لیکن ان پر مسلمانوں کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ وہ غزوات میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں مال غنیمت میں سے حصے بھی دیئے جاتے ہیں۔ وہ کسی حکم سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اچھی طرح علم تھا کہ اس فتنہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی ہے۔ چنانچہ ایک ماہ تک اذیت سہتے سہتے بالآخر آپ مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہیں اور گروہ انصار و مہاجرین سے اس کے خلاف مدد بھی طلب فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ ”کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے“

لیکن جب حضرت عائشہؓ کی برأت نازل ہو جاتی ہے اور ان بہتان طرازی کرنے والوں کا کذب ثابت ہو جاتا ہے تو حد قذف صرف ان تین آدمیوں پر نافذ کی جاتی ہے (حسان ابن ثابت، مسطح بن اثاثہ۔ اور حمزہ بنت جحش) جو غریب محض ان منافقین کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ عبد اللہ ابن ابی اور دوسرے منافقین کو کیوں معاف کر دیا گیا۔ کیا وہ اس قدر صاحب قوت تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر حد جاری کرنے سے ڈر گئے؟ یا آپ نے کسی مصلحت اندیشی کی بنا پر درگزر کرنا مناسب سمجھا؟ حدود اللہ کے جاری کرنے میں یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصلحت کا شکار ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب ایک قریشی عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی اور پورے قریش میں اس حکم پر کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ایک سنسی سی پھیل گئی کیونکہ یہ ان کی ناک کا مسئلہ تھا اور حضرت اسامہؓ کو سفارشی بنا کر بھیجا گیا تو آپ نے حضرت اسامہؓ کو ڈانٹ پلائی تھی کہ (اتشفع فی حدود اللہ) کیا اللہ کی حدود کے معاملہ میں تم سفارش کرتے ہو؟ اور فرمایا تھا کہ اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (معاذ اللہ) یہ جرم سرزد ہوا ہوتا تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا تو آپ کے متعلق یہ تصور تو نہیں کیا جاسکتا کہ آپ مصلحت اندیشی کا شکار ہو گئے تھے نہ ہی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ آپ خدا خواستہ ڈرتے

تھے کہ اس پر حد جاری کر دی گئی تو کوئی قیامت برپا ہو جائے گی جو شخص تین تہا پورے عربستان کے مقابلہ میں کسی طرح کے خوف و اندیشہ کا شکار نہیں ہوا اور اپنی بات بباغ دہل و ہراتار ہا اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدا نخواستہ سعد بن عبادہؓ کی تقریر سے ڈر گئے تھے۔ پھر ابن ابی منافق کا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا جاتا جس کی بنا پر اسے معاف کر دیا گیا ہو۔

(۱۲) بتایا گیا ہے کہ ”مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہو گئیں۔ بیماری نے طول کھینچا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔“ بیمار کیوں ہو گئیں، اور بیمار بھی ایسی کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ اور بیماری نے اتنا طول کھینچا۔ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ بیماری کیا تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کی ایک مہینہ تک کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی کہ اسے ہی بیماری کا سبب قرار دیا جاسکے۔ بہر حال یہ بات بھی شبہ میں ڈالنے والی ہے۔

(۱۳) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ ”یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی اس نے سنتے ہی فوراً کہا، اے اللہ تو پاک ہے ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے“ یہ وہی الفاظ ہیں جو خود قرآن کریم میں آئے ہیں کہ مسلمانوں کو سنتے ہی یوں کہنا چاہیئے تھا۔ یہ انصاری معلوم نہیں کون تھا۔ لیکن نہایت کامل الایمان

شخص تھا جس کا عمل بالکل منشاء الہی اور رضائے خداوندی کے مطابق رہا۔ اس نے وہی کچھ کہا جو حق تعالیٰ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان یہ کچھ کہے اور ماشاء اللہ یہ انصاری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی سبقت لے گیا کہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کچھ کہا بلکہ وہ حضرت زینبؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت بریرہؓ سے مشورے اور تحقیقات ہی کرتے رہے اور حضرت علیؓ دے لفظوں میں تہمت کی تائید ہی کرتے رہے اور لگے حضرت بریرہؓ کو مارنے پینے کہ وہ کچھ تو خلاف کہہ دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راوی نے یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ، حضرت بریرہؓ سب پر اچھا غاصا وار کر دیلے خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کا مسلمانوں میں جو تقدس و احترام ہے وہ تو بالکل ہی پارہ پارہ کر دیلے۔

(۱۴) آگے ارشاد ہوا ہے ”لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ صدیقہ کو اب تک اس تہمت کا علم نہ تھا۔“ یہ کتنی خلاف عقل بات ہے۔ ازواج مطہرات کے حجرے مسجد نبوی سے متصل بنے ہوئے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا حجرہ بھی مسجد کے ساتھ ہی تھا چنانچہ آخری زمانہ میں آپ نے تمام صحابہ کے دروازے جو مسجد کی طرف کھلتے تھے۔ سوائے ابو بکرؓ کے دروازہ کے بند کر دیئے تھے۔ لہذا ثابت ہے کہ مسجد کے ساتھ ہی حضرت

ابوبکر صدیقؓ کا مکان بھی تھا۔ ایک مہینہ تک مدینہ منورہ میں خاصا کھرام مچا رہا۔ مسجد نبویؐ میں آپؐ نے خطبہ دیا وہاں اوس اور خزر ج کے سرداروں سعد ابن معاذؓ اور سعد ابن عبادہؓ کے درمیان تو تو میں میں ہوتی ہے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے سردار کے ساتھ آواز بلند کرتا ہے۔ اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، ازواج مطہرات کے حجروں میں مسلمان عورتیں مسائل پوچھنے کے لئے آتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن اس پورے مہینہ میں کوئی انصاری یا مہاجر خاتون کو بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور کوئی عورت نہیں آئی۔ انصاری عورت آئی بھی تو آخری مرحلے میں آئی جب آیات برأت نازل ہونے کو تھیں۔ اس سے پہلے پورے ایک مہینہ تک سب کو سانپ مونگھ گیا تھا۔ نہ حضرت عائشہؓ کو مہینہ بھر تک خبر ہوئی نہ ان کے والدین کو خبر ہوئی نہ حضرت عائشہؓ سے ہمدردی رکھنے والی کسی مسلمان خاتون کو خبر ہوئی کہ وہ اگر حضرت عائشہؓ کو بتا دیتی۔ یہ ساری باتیں خلاف عقل ہیں جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتیں۔ علاوہ ازیں ازواج مطہرات کے حجروں تو مسجد نبویؐ کے ساتھ ہی تھے اور تمام ازواج مطہرات ایک دوسرے سے ملتی رہتی تھیں۔ سب کے حجروں پاس پاس تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پورے ایک ماہ بیمار رہیں اس پورے ایک مہینہ میں کوئی زوجہ مطہرہ ان کی عیادت کے لئے بھی نہیں آئی کہ کوئی تو کچھ بتا دیتی۔

(۱۵) کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنی بیماری میں رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا (کہ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ خفا ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لاتے، سلام کرتے اور پوچھتے ”تم کیسی ہو؟“ پھر واپس چلے جاتے۔ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا (وہ نہ سمجھ سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟) یہ انسانی فطرت کے بالکل ہی خلاف بات ہے۔ جس قدر محبت اور تعلق زیادہ ہوتا ہے اسی قدر ذرا سی بے رخی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے انتہائی محبت تھی ایسی ہی محبت حضرت عائشہؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی جس کا مظاہرہ ایک دوسری حدیث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سفر میں ایک مرتبہ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں اپنا اپنا اونٹ بدل لیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر اور حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ کے اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسی اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جو حضرت عائشہؓ کا تھا لیکن اس پر حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور اس طرح حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور آپ کی باتوں سے رات بھر محروم رہیں تو منزل پر پہنچنے کے بعد اذخر گھاس میں انہوں نے خوب خوب پاؤں رگڑے اور اپنے آپ کو کوسنے دیجئے کہ ”پروردگار! میرے اوپر

کسی بچھو یا سانپ کو مسلط کر دے جو مجھے ڈس لے۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی، ملاحظہ فرمائیے کہ صرف ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور گفتگو سے محرومی پر تو آپ کو اتنی شدید ناگواری ہوئی مگر یہاں ایک مہینہ تک اس محرومی پر کوئی خاص ملال نہیں ہوا۔ صرف شک ہی ہوا کہ شاید آپ ناراض ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عین تقاضا تھا کہ حضرت عائشہؓ نے آپ کی ذرا سی بے رخی دیکھی تھی تو فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ معلوم کرتیں۔ پھر کس قدر غیر معقول بات ہے کہ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا، اول تو یہی غلط ہے کہ وہ کم سن تھیں اور اگر بالفرض کم سن تھیں بھی تو انہیں تو اور زیادہ پوچھنا چاہیے تھا کیونکہ بھلے برے کا زیادہ شعور نہ ہونے کی بنا پر وہ مصلحت اندیش نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ وجہ دریافت کرنے میں مصلحت نہ سمجھ کر خاموش ہو جاتیں۔ ان میں تو بے حیائی اور بے صبری زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ کم سن ہونے کے معنی یہ تو نہیں کہ کچھ کسی کی محبت اور شفقت کو بھی نہ سمجھے۔ دوسروں کی محبت اور شفقت کو تو دودھ پیتے بچے تک خوب سمجھتے ہیں۔ لہذا جب انہوں نے آپ کی بے توجہی بے اعتنائی اور بے رخی کو محسوس کر لیا تھا تو ان کے اضطراب اور بے حیائی کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ بلا تاخیر فوراً اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتیں۔

(۱۶) آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو

بیماری سے افاقہ ہوا تو وہ ایک رات قضائے حاجت کے لئے نکلیں

----- حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی

قضائے حاجت کے لئے نکلیں ----- راستہ میں حضرت

ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا۔ وہ کہنے لگیں ”سطح ہلاک

ہو“ — اردو کی ایک ضرب المثل ہے۔ ”ماروں گھٹنا، چھوٹے

آنکھ“ یہ ضرب المثل شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے کہی گئی ہے۔

قصور تو اپنایا اپنی چادر کا کہ اس میں ان کا پاؤں الجھ کر پھسل گیا

اور شامت آگئی عزیزِ حضرت مسطحؓ کی کہ والدہ صاحبہ نے ان

کو کوسنا شروع کر دیا۔ شاید وہ اُدھار ہی کھائے بیٹھی تھیں

کہ کچھ بات ہو اور وہ یہ کہانی اُگلیں۔ بات بے بات جب وہ اُگلنے

کے لئے اُدھار ہی کھائے بیٹھی تھیں تو پورے ایک ماہ تک ان سے

صبر کیسے ہوا۔ مزید تعجب اس پر ہے کہ وہ مسطحؓ کو کوس رہی ہیں

اصل سرغنہ یعنی عبداللہ ابن ابی کونہیں کوستیں۔ اس کا نام کوئی

نہیں لیتا۔ وہ مسطحؓ کو اس انداز سے کوس رہی ہیں۔ گویا سارا

طوفان اسی کا اٹھایا ہوا ہے حالانکہ طوفان عبداللہ ابن ابی کا

اٹھایا ہوا تھا۔ یہ عزیزِ تو اس کے طوفان میں بہہ گئے تھے۔

پھر بتایا گیا ہے کہ ”گھروں میں اس وقت تک بیت الخلاء

نہیں بنائے گئے تھے۔ عورتیں صرف رات کو قضائے حاجت

کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آرہا

تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قضائے حاجت کے لئے عورتیں باہر ہی

جایا کرتی تھیں۔ قضائے حاجت کا تقاضا تو حضرت عائشہؓ کو

بیماری میں بھی ہوتا ہوگا، کیونکہ بیماری میں آدمی کا بول و براز تو بند نہیں ہو جاتا اور جیسا کہ آج بھی ہمارے ہاں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں عورتیں قضاے حاجت کے لئے باہر جاتی ہیں اور دو چار عورتیں مل کر ساتھ جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سے پہلے بھی باہر جاتی رہی ہوں گی اور دو چار عورتوں کے ساتھ ہی جاتی رہی ہوں گی جیسا کہ بیماری کے بعد وہ ام مسطحہ کے ساتھ گئی ہیں۔ تو حیرت ہے کہ کسی عورت نے آج تک یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے بیان نہیں کیا۔ حالانکہ عورتوں کی فطرت ایسی ویسی بات کو مضبط کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ عورتیں زیادہ تر پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں، وہ تو باتوں کو اگلنا ہی جانتی ہیں جیسا کہ ام مسطحہ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ محض بات کو اگلنے کی خاطر وہ اپنا پاؤں پھسلنے پر اپنے بیٹے مسطحہ کو کوسنے لگیں کہ اس بہانے وہ بات کو اگل سکیں۔ حالانکہ پاؤں پھسل جانے پر غریب مسطحہ کو کوسنے کا کوئی تک نہیں تھا۔

(۱۷) آگے بیان ہوا ہے کہ ”حضرت ام مسطحہؓ نے تہمت کا سارا حال سنایا، یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیماری بڑھنی شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے سلام کیا پھر پوچھا ”تم کیسی ہو؟“ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگی تاکہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں۔“ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ نہ بھول جائیے

کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ہونے کے باوجود ایک عورت ہیں اور پاک دامن اور پاکباز عورت ہیں۔ تہمت کا سارا حال ام مسطحؓ سے ان کو معلوم ہو چکا ہے۔ پورے ایک مہینہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیور بدلے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ آپ کی بے اعتنائی اور بے رخی سے ان کے دل پر کیا کچھ گزر رہی ہو گی ظاہر ہے۔ ایک عورت کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے اس قدر ضبط اور تحمل کی توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ بھٹ نہ پڑتیں اور سبائے رونے دھونے کے صرف اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگتیں۔ جو کچھ راوی نے ان کے متعلق والدین کے ہاں جانے کے بعد بیان کیا ہے وہ کچھ ام مسطحؓ کے بیان کے بعد ہو جانا چاہیے تھا۔

(۱۸) راوی کہتا ہے کہ والدین کے گھر پہنچنے کے بعد ”اتنے میں ایک انصاری عورت آئی اور کہنے لگی۔ اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی کرے۔ حضرت ام رومان نے کہا ”تم نے یہ کیا بات کہی“ اس نے کہا کہ ”میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے“ حضرت ام رومان نے پوچھا ”آخر کیا قصہ ہے“ (اس کی کیا تفصیل ہے؟) اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا۔ جب وہ بیان کر چکی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا ”کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں“ حضرت عائشہؓ نے پوچھا ”کیا ابو بکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ اس نے کہا ”ہاں“ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ بے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں یہی ساری

داستان بھی محض داستان اور وہ بھی من گھڑت داستان ہی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ام مسطحؓ حضرت عائشہؓ سے تہمت کی ساری داستان بیان کر چکی تھیں۔ حضرت عائشہؓ جب والدین کے ہاں آئی ہیں تو انہوں نے ام مسطحؓ کی باتیں اپنی والدہ کو سنادی تھیں اور یہ سب باتیں سننے کے بعد ہی انہوں نے حضرت عائشہؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ”ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو خوبصورت ہوں، کسی محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں، پھر ان کی سونکین بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کو پوری کہانی معلوم تھی یا معلوم ہو گئی تھی۔ لیکن انصاری عورت کے آنے پر ام رومانؓ بالکل بے خبر بن جاتی ہیں اور خود اس انصاری عورت سے پوچھنے لگتی ہیں کہ آخر قصہ کیا ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ کا اس سے یہ سوال کہ ”کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ ”کیا ابو بکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟“ محض تجاہل عارفانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا اتنا بڑا حادثہ پیش آ جانے کے بعد ماں اور باپ میں کبھی اس کا ذکر اذکار نہیں آیا تھا کہ ام رومانؓ حضرت عائشہؓ کو بتا دیتیں کہ ابو بکرؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن لی ہے۔ اور کیا وہ خود پورے ایک مہینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیور بدلے ہوئے اور آپ کی بے اعتنائی اور بے رخی نہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب انہیں یہ بھی پوچھنے کی ضرورت پیش آ گئی کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بھی یہ بات سنی ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اتنی کودن اور غبی تو کبھی بھی نہیں تھیں۔ پھر یہ انصاری عورت بیان کر رہی ہے کہ اس کا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے مگر سزایانے والوں میں اس کا کہیں نام نظر نہیں آتا۔ آگے چل کر جب اسی روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے ہیں اور حضرت عائشہؓ کو سخت لرزہ سے بخار چڑھا ہوا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آگیا ہے؟“ تو حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”ہاں“ جس کے معنی یہ ہیں کہ ام رومان رضی اللہ عنہا کو تہمت کی ساری داستان معلوم تھی۔ ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بات نہ فرماتے اور ام رومان رضی اللہ عنہا اس طرح جواب نہ دیتیں۔

(۱۹) آگے اس داستان کا وہ افسوسناک حصہ آ رہا ہے جس پر عینا ماتم بھی کیا جاتے کم ہے۔ یعنی ”پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور اسامہ ابن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا: ”وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟) آپ بدستور انہیں اپنے ہی پاس رکھتے ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے“ حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے معاملہ میں سلامت رہے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں کیا۔ البتہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غم غلط کرنے

کے لئے یہ عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ ”کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟“ حضرت بریرہؓ نے کہا۔ ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں۔ وہ تو اتنی (بھولی) کمسن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں۔ پہلی ہوئی بکری آکر کھا جاتی ہے ایک شخص نے انہیں دھمکا کر کہا (دوسری روایات میں تصریح ہے کہ یہ حضرت علیؓ تھے) کہ ”سچ سچ بیان کرو“ حضرت بریرہؓ نے کہا کہ ”سبحان اللہ“ میں تو عائشہؓ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سرخ سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے۔“

اس افسانہ میں سب سے پہلی بات جو محل تا مل ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ تمام اہم معاملات میں آپ ان ہی سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے بعد اگر کوئی اہم شخصیت تھی تو وہ حضرت عثمانؓ کی تھی اس سے پہلے کسی اہم معاملے میں حضرت اسامہ ابن زیدؓ اور حضرت علیؓ سے مشورہ فرمانا ثابت نہیں ہے۔

تو اس اہم معاملہ میں آپ نے نہ حضرت ابوبکرؓ کو یاد فرمایا نہ حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کو یاد فرمایا تو حضرت اسامہؓ اور حضرت علیؓ کو یاد فرمایا۔ یہ آپ کی عام عادت کے خلاف ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی تو بیٹی کا معاملہ تھا اس لئے ان کو یاد نہیں فرمایا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو یاد نہ فرمانا انتہائی حیرت کا باعث ہے۔

(۲۰) دوسری اہم اور قابل استعجاب بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات سے اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ لیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو قطعاً مستثنائے الہی اور تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ تو عام مسلمانوں سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ
إِذْ تَلْقَوْنَهُ يَأْتِيَنَّكُمْ وَتَقُولُونَ يَا فَوَاحِشُ
مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ
عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ
مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا ۖ سُبْحَانَكَ هَذَا
بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۝ يَعْزُبُكَ اللَّهُ أَنْ تَعُوذُوا بِالْمِثْلِ
أَبَدًا ۚ إِنَّ كُنْتُمْ مَوْثِقِينَ ۝

موجہ ۵۔ اور دے مسلمانوں تم پر دنیا و آخرت میں
 اگر اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو جس بات کا تم نے چرچا
 کیا ہے اس کی وجہ سے تمہیں بڑا عذاب پکڑ لیتا۔ یاد کرو
 جب تم اسے اپنی زبانوں سے مڑے لے کر نقل کر رہے تھے اور اپنے منہوں
 سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں
 تھا۔ اور تم اُسے معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ
 کے نزدیک بڑی بات تھی۔ جو نبی تم نے اس بات کو سنا
 تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے
 منہ سے نکالیں۔ خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے۔
 یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ
 تم دوبارہ ایسا کام کبھی نہ کرو اگر تم مؤمن ہو۔

غور تو فرمائیے کہ عام مسلمانوں سے خدائے تعالیٰ کے اس
 مطالبہ کا کیا حجاز رہ جاتا ہے کہ انہیں بات کو سنتے ہی یہ کہنا
 چاہیئے تھا کہ ”ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے منہ سے نکالیں۔
 خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے۔ یہ تو یقیناً بہت بڑا بہتان
 ہے۔“ جبکہ خود اللہ کا رسول بھی اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا
 ہے۔ اس رسول الہی کا ایک جلیل القدر صحابی (حضرت علیؓ)
 بھی درپردہ اس کی تائید میں ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا
 تو بعد از اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ سے
 تو وہ انصاری صحابی ہی اچھے رہے اور خدا کے اس معیار پر پورے
 اترے کہ تہمت کی بات سنتے ہی انہوں نے کہا ”اے اللہ تو پاک

ہے۔ ہمارے لئے یہ ضرور یہاں نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے،“ راوی نے یہ بات کہہ کر نعوز باللہ حضرت علیؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں جو تقدس اور احترام پایا جاتا ہے اسے انتہائی تکلیف دہ حد تک ٹھیس پہنچائی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلہ (۲۱) تیسرے یہ زبردستی کی بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ آپ خلاصہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی، اور پھر اس کے بعد یہ کہ ”ایک شخص نے حضرت بریرہؓ کو دھمکا کر کہا کہ سچ بیچ بیان کرو“ بیہقی اور طبرانی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت علیؓ تھے، اور انہوں نے نہ صرف بریرہؓ کو دھمکایا بلکہ مارا پیٹا بھی تھا تا کہ وہ حضرت علیؓ کے خیال کے مطابق صحیح صحیح بات بتا دیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود راوی کا دعویٰ یہ ہے کہ ”حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے معاملہ میں سلامت رہے یعنی کسی قسم کا شبہ نہیں کیا“ سبحان اللہ! یہ اچھی سلامتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ فرما رہے ہیں اور حضرت علیؓ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ”اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں، یعنی آپ میری ماں کو طلاق دیدیجئے اور کوئی دوسری عورت گھر میں لے

آئیے اگر سلامتی اسی کا نام ہے تو پھر تہمت میں ملوث ہونے کے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ مشورہ حضرت علیؓ دے رہے ہیں جو ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں۔ قرآن کے بہت بڑے عالم ہیں۔ جنہوں نے بتایا جاتا ہے کہ نزول کی ترتیب کے مطابق قرآن کریم کو مرتب بھی فرمایا تھا۔ نزول کا اتنا بڑا عالم اور یہ کہہ رہا ہے کہ ”اے اللہ کے رسول اللہ نے آپ پر کوئی تلخی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں۔“ گویا اسے قرآن کی یہ آیت معلوم ہی نہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدِ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ
بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حَسَنُھُنَّ
(۳۳)

توجہ :- (اسیغیر اسلام!) آپ کے لئے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ حلال ہے کہ ان انفع کے بدلے آپ دوسری ازواج بدل لیں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت سورۃ احزاب کی ہے اور سورۃ احزاب غزوۃ احزاب (خندق) کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی آیات سے ظاہر ہے۔ اور غزوۃ احزاب (خندق) مکہ میں واقع ہوا ہے۔ جبکہ غزوۃ بنی المصطلق جس میں واقعہ اُفت پیش آیا ہے (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) شام کا واقعہ ہے تو یہ یقیناً ممکن ہے کہ مکہ میں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے مزید شادیاں ممنوع قرار دی جا چکی تھیں اور ایک بیوی کی جگہ (اُسے طلاق دے کر) دوسری بیوی کر لینا بھی حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے پورے ایک سال بعد حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتیں کہ ”اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں“ جبکہ حضرت علیؓ قرآن کریم کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب کرنے والے بھی شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر ترتیب نزول کی معلومات حضرت علیؓ کو ایسی ہی تھیں تو جیسا کچھ قرآن کریم کو انہوں نے مرتب فرمایا ہو گا وہ ظاہر ہے۔ شاید اسی وجہ سے امت میں وہ مقبول نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ خود شیعیان علیؓ کی درس گاہوں میں بھی بار نہ پاسکا ورنہ آج کہیں تو اس کا سراغ ملتا۔

ہمارے نزدیک عائشہؓ دشمنی میں یہ حضرت علیؓ کو مطعون کرنے کی سازش ہے کہ وہ ایسا بے ہودہ مشورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دے رہے ہیں۔ یہ حضرت علیؓ کے ذمہ بہت بڑا بہتان ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کوئی مشورہ فرما سکتے تھے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ اولاد ہیں۔ حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں پورے تیس سال چھوٹے اور آپ ہی کے پروردہ تھے اور حضرت اسامہؓ حضرت زیدؓ کے بیٹے ہیں جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے یعنی پوتے کی جگہ تھے مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک بیٹے

اور پوتے سے مشورہ فرمایا۔ ایسے معاملات میں اولاد سے مشورہ نہیں لیا جاتا بلکہ اپنے ہم عمروں اور ہم سستوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی یہ کوتاہی بعض راویوں کو محسوس ہوئی۔ چنانچہ قسطلانی نے شرح بخاری میں موافقات فاروقی و عظیمی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صاحب الریاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے بارہ میں حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمایا تھا جب اہل اقلب نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! عائشہؓ سے آپ کا نکاح کس نے کرایا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ نے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے پروردگار نے آپ کے ساتھ اس معاملہ میں گھپلا کیا مَبْحَاثُكَ هَذَا مَبْعَثَانِ عَظِيمَانِ چنانچہ قرآن کریم میں بھی یہی الفاظ نازل ہوئے۔ بہر حال حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کا ایک امکان ہو سکتا تھا لیکن حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے تو مشورہ فرمانے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک چونکہ واقعہ اقلب کی یہ کہانی محض ایک من گھڑت داستان ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ہم حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کی بات کو بھی موضوع سمجھتے ہیں۔ (۲۲) جو بھی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ کو مشورہ کے لئے طلب فرمایا تھا انہیں

مقتانیدار تو نہیں بنایا تھا۔ حضرت علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مقتانیدار بننے کا کیا حق تھا کہ وہ حضرت بریرہؓ کو ڈانٹتا، دھمکانا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔ یہ تو یہ

لَا تُقَدِّمُوا بَيْنِي وَبَيْنَ اللَّهِ قَدْ سَوَّلَهُ۔ (۲۲)

ترجمہ: اے اللہ اور اس کے رسول کے مابینے پیش نہ کرو۔

پھر وہ

اگر

لَا تَقْدِرُوا عَلٰی اَمْنٍ اَنْتُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (۲۳)

ترجمہ: نبی کی آواز پر اپنی آوازوں پر بلند نہ کرو۔

کی صریح خلاف ورزی اور سخت ترین گستاخی اور سبوتاژ کی شمار کی جائیگی۔ تعجب ہے راوی نے اس کی جسارت کیسے کی کہ حضرت علیؓ کے خلاف اس قسم کی بہتان طرازی کرے۔

(۲۳) مذکورہ بالا حصہ کے سلسلہ میں پانچویں اور آخری کلمے

کی بات یہ ہے کہ راوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ

مشورہ دیا کہ ”آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات

بتائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام

بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے

فرمایا۔ کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی

ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟“ الخ ”اس میں حضرت بریرہؓ

کو حضرت عائشہؓ کی خادمہ بتایا گیا ہے۔ کیوں کہ حضرت بریرہؓ

دراصل ایک لونڈی تھیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
 عنہا نے ان کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد فرما دیا تھا اور
 اس کے بعد وہ حضرت عائشہ کی خدمت میں رہنے لگی تھیں چنانچہ
 اس انداز سے ان کا نام لیا گیا ہے گویا وہ تو حضرت عائشہ کے گھر
 میں ہر وقت رہتی تھیں اور ہر بات سے واقف تھیں۔ لہذا وہ
 صحیح صحیح ثابت بتا رہی تگی۔ حضرت علیؓ ان کو جو حد کا تہ بھی ہیں کہ
 صحیح بیان کرو۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس وقت کا یہ
 واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت بریرہؓ کا حضرت عائشہؓ
 کے گھر سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ چنانچہ علامہ قسطلانی
 شارح بخاری فرماتے ہیں کہ ”یہاں خادمہ یا لونڈی کا نام
 بریرہؓ بیان کرنا بہت مشکل سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ قصہ انک
 حضرت بریرہؓ کو خریدنے اور ان کو آزاد کرنے سے بہت پہلے کا
 ہے۔ کیونکہ واقعہ انک سلمہ یا سلمہ میں (باختلاف الاقوال)
 پیش آچکا تھا۔ اور حضرت بریرہؓ کو آزاد کرنے کا واقعہ فتح مکہ
 کے بعد سلمہ یا سلمہ میں ہوا ہے۔ اسی واسطے زرکشی نے
 کہا ہے کہ لونڈی کا نام بریرہ کسی راوی نے بعد میں بڑھا دیا
 ہے۔ یہ کوئی اور باندی ہوگی۔ لیکن شیخ نقی الدین سبکی نے اس
 کے کئی جواب دیئے ہیں۔ جن میں سب سے اچھا جواب یہ ہے
 کہ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت ان کو خریدنے سے
 پہلے بھی کرتی ہوں گی۔“ (قسطلانی شرح بخاری ص ۲۹۲)
 حافظ ابن حجرؒ نے بھی زرکشی کا یہ قول نقل کیا ہے اور بتایا

ہے کہ ترکشی نے یہ بات حافظ ابن القیم حنبلیؒ سے لی ہے کیونکہ انہوں نے بھی کہا ہے کہ باندی کا نام بریرہ بیان کرنا وہیم ہے جو کسی راوی کو ہو گیا ہے۔ (رفع الباری ص ۴۱)

رہا شیخ تقی الدین سبکیؒ کا قیاسی جواب سورہ بہت کزود ہے۔ حضرت بریرہؓ ایک باندی تھیں۔ وہ اپنی آزادی کی خواہاں تھیں۔ کیوں کہ وہ جن لوگوں کی باندی تھیں وہ لوگ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہیں آتے تھے اور ان سے زیادہ خدمت لیتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کو خرید کر آزاد کر دے تو انہیں اس پر اصرار تھا کہ ولاء انہی کے لئے ہوگا یعنی ضرورت پڑنے پر وہ پھر بھی ان سے خدمت لینے کا خود کو حقدار سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر حضرت بریرہؓ مر گئیں تو وارث بھی وہی ہوں گے۔ غرض یہ کہ اتنے حریص اور بخیل مالکوں سے ان کا واسطہ تھا، اسی لئے وہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں اور اپنی دکھ بھری داستان انہیں سنائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کے شرط کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ولاء اسی کے لئے ہوگا جو ان کو آزاد کرے گا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ترس کھا کر ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ توقع عبث ہے کہ وہ دوسروں کی لونڈی ہوتے ہوئے حضرت عائشہؓ کی خدمت کتنی ہوں گی اور ان کے مالک ان کو اس کی اجازت دیتے ہوں گے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت گزاری کرتی رہیں اور ان کے گھر میں ہر وقت پڑی رہیں کہ ان کے خلوت

و جلوت کی راز آشتی بن جائیں اور حضرت عائشہؓ کے متعلق صحیح
صحیح بات بتا سکیں ہمیں زرکشی کے اس قول سے مکمل اتفاق ہے
کہ حضرت بریرہؓ کا نام اس روایت میں لینا غلط ہے اور سراسر
غلط ہے۔

(۶۲) اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ اس دن رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم مہاجرہ تشریف لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مکہ میں جو
اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے
معاملہ میں مجھے سخت مدد پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی
میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس
سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی
کے میں کوئی اور گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں
کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ یہ سن کر بنو عبد شہل کے بھائی حضرت
سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کی
مدد کروں گا۔ اگر وہ اہل قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن
اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو
حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ یہ سن کر قبیلہ خزرج
کے سردار سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے۔ یہ بہت اچھے آدمی
تھے لیکن اس موقع پر پھسل گئے۔ قوی حمیت اور غرور نے انہیں
اُبھارا۔ کہنے لگے تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے
اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے
ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ یہ سن کر حضرت

کرنے میں کبھی دانتیں کو جھکتا ہے اور کبھی بائیں کو، مگر فیصلہ نہیں کر پاتا۔

(۲۵) دوسری بات جو اس روایت کو قابل رد قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنے گھریلو معاملات کو یوں قوم کی جو پالی میں پیش نہیں کیا کرتا جس طرح یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو برسرِ مہر ایک بے پردہ بات کا چرچا کرتا ہوا اور قابلِ شرم بات کو اچھالتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ہمیں تو آپ نے قرآن کریم کے ذریعے یہ تعلیم دی ہے کہ:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ أَنْ تَشِيعَ الْفُحْشُ خِلَافَ
الَّذِينَ آمَنُوا اللَّهُ عَذَابُ الْيَوْمِ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ ط قَالَ اللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○

(۴۴)

ترجمہ :- یقیناً جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی کوئی بات پھیلے ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کے علی الرغم ایسا کر سکتے تھے کہ آپ برسرِ مہر اس بات کا چرچا فرماتے۔ صحابہ کے ان بیانات کو سامنے رکھتے کہ آپ میں شرم و حیا اس قدر تھی کہ کنواری لڑکیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی کی موجودگی میں جنگل میں قضائے حاجت اور پشتاب تک

کہ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر آپ کے متعلق کیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس قدر یقین تھا جس کا آپ اب مظاہرہ فرما رہے ہیں تو اس سے پہلے وہ سب مشورے اور تحقیقات کیوں کی جا رہی تھی کس نے کہا تھا کہ آپ بیوی پر شبہ کریں اور اس کو الگ کرنے کی سوجھیں۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جن کے سہارے مستشرقین اور دیگر نابینا کے اہل قلم ہر طرح کی پیرزہ سرا تھیل پلپل کرتے ہیں۔ لیکن یہ خود ہم ہی ہیں جو ان لوگوں کو الگ کیا وہ گواہوں کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ تعویذ باللہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسا قائلہ اعتراض تصور و قائلہ نہیں کر سکتے ہم سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابر کا بی اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ کو وطن و تخمین کی وادیوں میں یوں بھٹکتا ہوا اور وہم و گمان کے ریگستانوں میں یوں سرگردان ہوتا ہوا پیش کیا جائے آپ علم و یقین کے اسی بلند مقام پر فائز تھے کہ آپ اہم معاملات میں دو ٹوک اور بچے تلے صحیح فیصلے فرمانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس میں آپ کو نہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف ہوتا تھا اور نہ کسی مصلحت اندیشانہ رکاوٹ سے سابقہ پڑتا تھا۔ کیا کوئی شخص تصور بھی کر سکتا ہے کہ دنیا کے اتنے عظیم ترین انقلاب کا قائد جو چند سال میں دنیا کی بساط الٹ کر رکھ دیتا اور ایک نئی دنیا تعمیر کر کے دکھا دیتا ہے وہ بات کی تہ تک پہنچنے اور بروقت صحیح فیصلے کرنے میں اس قدر کوتاہ دست اور کمزور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ایک گھریلو معاملہ کا فیصلہ

اسید ابن حنیفہؓ کھڑے ہوئے۔ یہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے
 چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ سے
 کہا: تم جھوٹے ہو۔ اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق
 ہو کہ منافقوں کی طرف سے جھگڑتے ہو، اس پر اوس اور خدیج
 دونوں قبیلے اتنا بھڑکے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم ابھی ممبر نہ پڑھا تھے۔ آپ ان کو چپ کرتے رہے۔ یہاں
 تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔“

داستان کا یہ حصہ بھی مختلف وجوہ سے قابل رد ہے سب
 سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
 کردار انتہائی متضاد بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے
 ہیں کہ آپ حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے بیوی کی علیحدگی کے
 متعلق مشورہ فرما رہے ہیں۔ حضرت زینبؓ اور حضرت بریرہؓ
 سے حضرت عائشہؓ کے کیریئر کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے
 ہیں۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ حضرت عائشہؓ کے متعلق
 خاصے مشکوک ہیں حتیٰ کہ ان کو طلاق دیدینے اور اپنے سے علیحدہ
 کر دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہاں برسر ممبر سارے صحابہ کے سامنے
 اللہ کی قسم کھا کر یہ بیان دے رہے ہیں کہ میں اپنی بیوی میں
 سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس
 سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی
 کے میں اور کوئی گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں
 کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ ذرا دیانت داری کے ساتھ غور فرمائیے

نہیں کرتے تھے۔ تعمیر کعبہ کے وقت (نبوت سے بہت پہلے) جب
 پتھر ڈھوڑھوڑھو کر لارہے تھے تو چچا حضرت عباسؓ نے ہتھکڑیاں لگا کر
 کندھے پر رکھ دینا چاہا کہ اس پر پتھر رکھ کر لاؤ تو خود کو نہنگا دیکھ
 کر بے ہوش ہو گئے۔ کیا اس قدر شریف اور شرم و حیا کا پتلا
 خاص اس معاملہ میں اتنا لالہ بالی ہو گیا کہ اپنے گھر کی ایک
 افسوسناک بات کو یوں علی الاعلان برسرِ منبر بیان کر کے اپنی
 ملت سے فریاد کر دے اور اس سے مدد کی بھیج مانگ رہا ہے۔
 استغفر اللہ!

(۲۶) تیسری اہم ترین بات اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت
 سعد بن معاذؓ کو بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
 کی فریاد پر کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے: "یا رسول اللہ! میں
 آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس
 کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی
 ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔" حالانکہ
 حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال غزوہ بنی المصطلق
 سے ایک سال پہلے غزوہ خندق میں سلمہ میں ہو چکا تھا۔
 چنانچہ علامہ قسطلانیؒ شارح بخاری تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں
 سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بڑا مشکل سمجھا گیا ہے۔
 کیونکہ واقعہ انک سلمہ غزوہ مریح میں پیش آیا تھا اور
 حضرت سعدؓ کا انتقال اس تیر لگنے کی وجہ سے ہوا ہے جو انہیں
 غزوہ خندق میں سلمہ میں لگا تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا

ہے کہ غزوہ مرسیع کے بارہ میں مؤرخین و محدثین کے مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں چنانچہ بخاری ہی میں موسیٰ ابن عقبہ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ وہ غزوہ سلمہ میں پیش آیا تھا۔ ایسے ہی خندق بھی۔ اور ابن اسحق نے کہا ہے کہ غزوہ مرسیع شعبان میں اور غزوہ خندق شوال میں پیش آیا تھا تو اگر دونوں غزوے ایک ہی سال میں ہوئے ہوں تو سعد ابن معاذؓ کا دونوں میں موجود ہونا ناممکن نہیں ہے۔ لیکن موسیٰ ابن عقبہ سے جو کچھ صحیح اسناد سے نقل کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ غزوہ مرسیعؓ میں پیش آیا ہے۔ پس بخاری میں جو کچھ نقل ہو گیا ہے (یعنی اس وقت حضرت سعد ابن معاذؓ کا موجود ہونا) اس کو محدثین نے سبقت قلم پر ہی محمول کیا ہے۔

(قسط لانی شرح بخاری ص ۱۹۲)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے انہوں نے حافظ ابن عبدالبرؒ ابن حزمؒ ابن العربیؒ قرطبیؒ وغیرہ محدثین سے یہی نقل کیا ہے کہ سعد ابن معاذؓ کا ذکر اس قصہ میں قطعاً غلط اور وہم ہے۔

(فتح الباری ص ۴۷)

اس سے ظاہر ہے کہ سلمہ میں جب (بقول راوی) واقعہ انک پیش آیا ہے اس سے ایک سال پہلے حضرت سعد ابن معاذؓ وفات پا چکے تھے۔ لہذا انک کے واقعہ میں حضرت سعد ابن معاذؓ کا تذکرہ غلط ہے۔ موسیٰ ابن عقبہ کے متعلق تو خود علامہ قسط لانی

نے واضح کر دیا ہے کہ ان سے غزوہ مریض کا سلسلہ میں پیش
 آنا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ وہ گئے ابن اسحق توان کے متعلق
 ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق امام
 مالک کا یار شاہ و نقل کیا جاتا ہے کہ انہ دجال من الدجالۃ
 (وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے) تو ان جیسے حضرات کے بیانات
 میں مشہور اور راجح اقوال کے خلاف پناہ ڈھونڈنا محض ایک
 غلط بات کو زبردستی صحیح باور کرانے کی ایک ناکام کوشش ہی
 ہے۔ اس کے بعد اس روایت کے متعلق بجز اس کے موضوع ہونے کے
 اور کیا کہنا جاسکتا ہے۔ نرم سے نرم بات جو اس سلسلے میں کہی جاسکتی ہے وہ
 یہی ہے کہ یہ روایت امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری کی طرف غلط طور پر منسوب
 ہو گئی ہو۔ کیونکہ روایت حدیث میں زہری نام سے روایت کرنے والے ایک
 محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہی نہیں ہیں بلکہ اسماء رجال کی کتابوں
 مثلاً تہذیب التہذیب اور لسان المیزان وغیرہ کے مطالعہ سے ایسے ایک
 سو بیس راویوں کا ذکر ملتا ہے جو زہری ہی کے نام سے موسوم تھے۔ ان میں
 کچھ وضع اور کذاب بھی تھے۔ پھر زہری کے شاگردوں میں بھی ایسے وضع
 اور کذاب موجود تھے جو زہری کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من گھڑت
 حدیثوں کو اس کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔

(۲۷) اس سلسلے میں ایک اور قابلِ تردید بات یہ ہے کہ روایت
 میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ناروا
 رویہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ روایت کا بیلان یہ ہے کہ یہ سن کر
 قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے
 یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقع پر پھسل گئے۔ قومی حیات

اور غزوہ نے انہیں اُجھارا کہنے لگے تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ یہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے خلاف انتہائی گھناؤنا الزام ہے۔ حضرت سعد ابن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار ہیں اور قبیلہ خزرج مدینہ منورہ میں انصار کا ایک مقتدر قبیلہ تھا۔ واضح رہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں مدینہ منورہ سے بنو خزرج کے لوگ ہی حاضر ہوئے تھے اور بیعت عقبہ ثانیہ میں بھی انہی کی اکثریت تھی۔ بنو اوس کے محوڑے لوگ اس بیعت میں شریک تھے اصل ہجرت کے داعی قبیلہ خزرج ہی کے لوگ تھے۔ بنو خزرج میں ہی حضرت سعد ابن عبادہ بھی تھے۔ لہذا حضرت سعد ابن عبادہ قدیم الاسلام شخصیت ہیں۔ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ چلے آنے کی دعوت دینے والوں میں شامل تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے جو بارہ نقیب مقرر فرمائے تھے ان میں قبیلہ بنی ساعدہ کے لئے آپ نے نذر ابن عمروؓ کے ساتھ آپ کو بھی نقیب مقرر فرمایا تھا۔ تمام سیرت اور تاریخ کے ائمہ اس پر متفق ہیں۔ عرض یہ کہ مدینہ منورہ میں انصار کے دو بڑے قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ اوس کے مقابلہ میں خزرج قبیلہ زیادہ مقتدر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کے باشندوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ پورے مدینہ کا سردار عبداللہ ابن ابی ابن سلول کو بنا دیا جائے۔ اس کی

تاجپوشی طے ہو چکی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور عبد اللہ ابن ابی کی سرداری کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول قبیلہ بنی خزرج ہی کا ایک سردار تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بنو خزرج کے اقتدار پر پورا مدینہ منورہ اتفاق کر چکا تھا۔ چنانچہ خود بخاری باب مناقب الانصار اور باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب البیوع میں حضرت انسؓ اور سعدؓ سے روایت ہے کہ ”ایک مرتبہ حضرت سعدؓ بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ ابن ابی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے مٹھہر گئے۔ عبد اللہ ابن ابی نے کہا۔ تم جو کچھ کہتے ہو یہ اچھی چیز نہیں۔ ہماری مجلس میں آکر ہمیں تکلیف نہ دیا کرو“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے حضرت سعدؓ کے ہاں پہنچے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول میرا باپ آپ پر قربان ہو جائے۔ آپ درگزر فرمائیے۔ اس کو معاف کر دیجئے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے بے شک اللہ نے جو کتاب آپ پر نازل کی ہے وہ حق کے ساتھ نازل کی ہے اور جو مرتبہ اللہ نے آپ کو دیا ہے وہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ عبد اللہ ابن ابی کو تاج پہنا کر دستار باندھ دیں۔ لیکن اللہ نے یہ حق سیادت آپ کو عطا فرمادیا اس وجہ سے اس کو حسد پیدا ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو

معاف کر دیا۔

(بخاری باب مناقب الانصار وغیرہ)

اس روایت سے علاوہ اس بیان کی تائید کے لئے جو علمائے سیرت و تاریخ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ چند باتیں مزید ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت سعد بن عبادہؓ قدیم الاسلام تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ شروع ہجرت کا ہے۔ جبکہ عبداللہ ابن ابی مسلمان بھی نہیں ہوا تھا۔ بعد میں یہ منافقانہ طور پر اسلام لے آیا تھا۔

(۲) عربوں میں سرداری نظام رائج تو تھا ہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پورا شہر عبداللہ ابن ابی کو سردار بنانے پر اتفاق کر چکا تھا جو ایک خزرجی آدمی تھا۔ لہذا بنو خزرج کی قوت و اقتدار بنو اوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مہاجرین کو مدینہ منورہ میں پناہ مل جانا دراصل بنو اوس کے مقابلہ میں بنو خزرج کا زیادہ مہم جوئی منت تھا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی دعوت دینے میں بھی بنو خزرج ہی پیش پیش تھے۔

(۳) چونکہ عربوں میں اسلام سے پہلے سرداری نظام ہی رائج تھا اس لئے حضرت سعد بن عبادہؓ کی قوت اور ان کا اقتدار (جو اپنے قبیلہ کے مسلمہ سردار تھے) ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

(۴) ابتدا ہجرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سعد ابن عبادہؓ کی جو گفتگو نقل ہوئی ہے وہ ان کے راسخ الایمان ہونے اور قومی حمیت و غرور سے بالکل بے بری ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(۵) حضرت سعد ابن معاذؓ نے یہ کہا ہی نہیں تھا کہ ہم اس شخص کو اگر وہ خزر جی ہوا تو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ ”اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزر جی قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے“ اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ کا یہ فرمانا ”تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزر جی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے“ بالکل بے شکا جواب ہے۔ سعد ابن معاذؓ نے کہا تھا کہ ”اگر وہ اوس قبیلہ کا ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا“ اس پر سعد ابن عبادہؓ فرما رہے ہیں کہ ”اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے“ سعد ابن معاذؓ فرما رہے ہیں کہ ”اگر وہ ہمارے بھائی خزر جی قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے“ اور اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ فرماتے ہیں ”تم جھوٹے ہو“ واللہ تم خزر جی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے“ ”سوال از آسماں جواب از رسیماں“ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ راوی غالباً یہ چاہتا ہے کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ

لے چکر مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ملائے میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا جانا تھا اس لئے یہی ہے کہ شیعوں کو ان سے صلہ پر حاکم ہے اس لئے ہر حالت میں انہیں پیشکش دیتے ہیں۔

کے متعلق سامعین یہ تصور قائم کر لیں کہ وہ نہایت، کودن
 غبی اور انتہائی متعصب اور مغرور انسان تھے۔ ایک جلیل
 القدر صحابی کے متعلق ہم ایسا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت
 سعد ابن عبادہؓ کے متعلق ایک دوسری روایت میں جو آنحضرت
 صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد سقیفہ بنی
 ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے اجتماع اور خلافت کے
 فیصلہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں حضرت عمر ابن الخطاب رضی
 اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے درمیان
 جو جھڑپ اور بد کلامی ہوئی نیز یہ کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ کو
 جو اس وقت بخار میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے روند ڈالا، کسی کے
 متنبہ کرنے پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ اللہ سعد ابن عبادہؓ کو
 غارت کرے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ سے یہ فقرہ منسوب کرنا کہ
 ”ایک امیر تم میں سے ہو گا اور ایک امیر ہم میں سے“ اور یہ
 بتانا کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آخر وقت تک حضرت ابوبکر
 صدیقؓ کی بیعت نہیں کی۔ حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ موجودہ
 روایت ان سے کچھ زیادہ ہی افسوس ناک ہے۔ یہ دوسری روایت
 بھی حضرت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کا کارنامہ ہے جو انہوں
 نے حضرت عمرؓ سے منسوب کر کے نقل فرمائی ہے۔ (دیکھئے بخاری
 کتاب الحدود) ہمیں افسوس ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ دشمنی میں
 بے چارے سعد ابن عبادہؓ خواہ مخواہ زد میں آ گئے۔ راوی کو
 باور تو یہ کرانا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا متفقہ

اور اجتماعی انتخاب گویا متنازعہ فیہ تھا اور اس کی حقیقت خدا خواستہ ایک زبردستی اور دھاندلی کی بیعت کی تھی اور اس کے ثابت کرنے کے لئے راوی نے حضرت سعد ابن عبادہؓ کو امت کی نگاہوں میں مطعون کر ڈالا۔

ساتھ ہی اس پر غور فرمائیے کہ سعد ابن عبادہؓ کے ساتھ ساتھ ان کا پورا قبیلہ زہد میں آ رہا ہے۔ کیونکہ سعد ابن عبادہؓ کی بات کو کاٹنے کے لئے بنو خزرج کا کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ ان کی بات کا جواب دینے کے لئے کوئی اٹھا ہے تو وہ حضرت اسید ابن حضیرؓ ہیں جو پھر قبیلہ اوس ہی کے آدمی اور حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچا زاد بھائی تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا قبیلہ کا قبیلہ حضرت سعد ابن عبادہؓ ہی کا ہمنوا تھا۔ اور ہم بتا چکے ہیں کہ مدینہ منورہ میں قبیلہ خزرج زیادہ طاقتور اور با اقتدار قبیلہ تھا اگر اس سارے قبیلہ کا یہ حال تھا تو اسلام کے متعلق ہمیں اس دور میں جو خوش فہمیاں ہیں ان کی حقیقت معلوم۔

قرآن کریم تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ :-
 وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ
 وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ
 فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ
 لَوَجَّهَ وَاللَّهُ تَوَّابًا رَحِيمًا ۝ فَلَا وَرَبِّكَ
 لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

ثُمَّ لَا يَجِدُ فِي أَنْفُسِهِمْ حَرْجًا مِّمَّا قَضَيْتَ
وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۶۵-۶۴)

ترجمہ۔ اور ہم نے ہر رسول اسی غرض سے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت و فرمان برداری کی جائے۔ اور اگر وہ جب کبھی اپنے نفسوں پر ظلم کریں۔ اس کے بعد آپ کے پاس چلے آئیں پھر اللہ سے خود بھی استغفار کریں اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرے تو وہ یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائیں گے۔ اے پیغمبر اسلام! آپ کے پروردگار کی قسم ہے وہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی اختلافات و نزاعات میں آپ کو حکم نہ بنالیں۔ پھر جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اس کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اسے تسلیم کر لیں۔

انصار کے قبیلہ خزرج کے کردار کی جو نقش گری اس روایت میں کی گئی ہے، وہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے قسم کھا کر (فَلَا وَرَيْبَ) یہ بات بتائی ہے کہ ایسے لوگ مؤمن ہو ہی نہیں سکتے۔ تو کیا قبیلہ خزرج پر فاتحہ پڑھ لی جائے اور تسلیم کر لیا جائے کہ پورا قبیلہ مؤمن نہیں تھا۔ اگر ایسا ہی تھا (العیاذ باللہ) تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چند سال کے عرصہ میں انہوں نے قیصر و کسریٰ

کے سخت کس طرح الٹ دیتے اور ایک تہائی معلوم دنیا پر پرچم اسلام کس طرح لہا دیا۔

حضرت سعد بن معاذؓ نے یہی تو فرمایا تھا کہ ”اگر وہ ہمارے بھائی خزر ج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے“ حضرت سعد بن معاذؓ کا یہ فرمانا قطعاً قرآنی حکم کے مطابق تھا۔ اس کی تردید میں حضرت سعد بن عبادہؓ کا وہ کچھ فرمانا جو ان سے منسوب کیا گیا ہے، قرآنی حکم کے مطابق اپنی بے ایمانی کا کھلا ثبوت مہیا کر دینا نہیں تو اور کیا تھا۔

(۲۸) اس کے بعد راوی بیان کرتا ہے ”ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا“ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر بے بسی اور عاجزی کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی مرضی اور خوشنودی کے ماتحت ہی فیصلے فرمانے پر مجبور تھے۔ کسی معاملہ کے اپنے حسن و قبح کے مطابق آپ فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ
النَّاسِ بِمَا آرَأَى اللَّهُ۔ (۳۴)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمادی ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان جو کچھ خدا نے آپ کو سمجھایا ہے اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اور

وَاللّٰهُ يَعِصُّكَ مِنَ النَّاسِ - (۵/۴۷)

ترجمہ :- اور اے پیغمبر اسلام ! اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پہر آپ کا نہ عمل تھا، نہ اعتماد۔ آپ بھی خدا سخواستہ اسی طرح مصلحت اندیشیوں کا شکار ہوتے تھے جیسا کہ دنیا کے اور سربراہان مملکت شکار ہوا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود راوی اس بات کا اعتراف کر چکا ہے کہ ”اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔“ لیکن آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم آیات برأت نازل ہونے کے بعد بھی نہ عبداللہ ابن ابی کو کچھ کہہ سکے نہ دوسرے منافقین کو۔ آپ نے حد بھی جاری فرمائی تو تین صادق الایمان مسلمانوں پر جو سب کے سب جلیل القدر صحابی ہیں۔ یعنی حضرت حسان ابن ثابتؓ مداح رسول رضی اللہ عنہ اور حضرت مسطح ابن اثاثہ جو عباد ابن مطلب کے پوتے یعنی آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھتیجے اور ماں کی طرف سے صحرا بن عامر کی بیٹی (جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ تھیں) کی لڑکی کے صاحبزادے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور حضرت حمزہ بنت جحش رضی اللہ عنہا یعنی آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن اور ام المؤمنین حضرت زینب

بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔ صرف ان تین آدمیوں پر جو سارے ہی سچے مسلمان اور آپ کے جان نثار تھے اور منافقین کی سازش کا اپنی سادگی سے شکار ہو گئے تھے، ان پر تو آپ نے حد جاری فرمادی اور وہ منافقین جو اصل تہمت لگانے والے تھے خصوصاً ان کا سرغنہ یعنی عبداللہ ابن ابی ان کو ایسا صاف چھوڑ دیا جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بظاہر اسلام لے آتے ہیں۔ مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے ہیں۔ سارے اسلامی احکام سجالاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ ہی کیا جاتا ہے۔ سارے اسلامی احکام ان پر نافذ ہوتے ہیں مگر ان کے دل میں اسلام نے کما حقہ گھر نہیں کیا ہوتا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلوم ہے کہ آپ حدود الہی میں ذرا بھی رعایت نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ خود صحیح بخاری باب مناقب اسامہؓ اور کتاب المغازی باب فتح مکہ اور کتاب الحدود و نیز صحیح مسلم کتاب الحدود میں یہ حدیث موجود ہے (جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) کہ ”حضرت اسامہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب کہلاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں ایک مخزومی عورت نے جب چوری کی تو لوگوں نے سفارش کے لئے حضرت اسامہؓ ہی کا انتخاب کیا۔ انہوں نے سوچا کہ سوائے اسامہؓ کے یہ جرأت اور کون کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے کہنے سے حضرت اسامہؓ نے سفارش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

متغیر ہو گیا۔ آپ نے فرمایا ”اے اسامہؓ تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتے ہو؟“ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا ”اے اللہ کے رسول! میرے لئے دعائے مغفرت کیجئے“ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے سوال یہ ہے کہ منافقین کے سلسلہ میں خصوصاً عبداللہ ابن ابی بن سلول کے حق میں آپ نے بیطرح عمل کیوں اختیار فرمایا کہ انہیں آپ نے کھلی چھٹی دیدی۔ کیا حضرت سعد ابن عبادہؓ کی اس دھمکی سے ڈر کر جو انہوں نے حضرت سعد ابن معاذؓ کے مقابلہ میں علی الاعلان دی تھی آپ نے ان خزعبیوں کو ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا؟ حدودِ الہی کے مقابلہ میں کیا آپ بھی ان مصلحت کوشیوں کا (العیاذ باللہ) شکار ہو جایا کرتے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر دوسروں سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟۔

(۲۹) اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے تہمت کے بارہ میں خطاب فرمایا تو راوی کہتا ہے کہ ”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ پڑا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے والد حضرت ابو بکرؓ سے کہا، آپ میری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیجئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا، اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ یہ جواب سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نو عمر لڑکی تھیں۔ اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ الخ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ام رومانؓ کا جواب دینے سے پہلو تہی فرمانا قطعاً انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ کئی دنوں اور راتوں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو گزدر رہی تھی وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے۔ اس کا ماں باپ کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ دونوں بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ روتے رہے تھے۔ اور وہ دونوں ڈر رہے تھے کہ (بقول ابی) ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ کچھ غیر معقول بات بھی نہیں تھی۔ آپ نے تہمت لگانے والوں کی بات کی تائید و توثیق بھی نہیں فرمائی تھی۔ ان دونوں حضرات کو بات کا جواب دینے سے کیا امر مانع تھا۔ فطرت انسانی کا تقاضا تھا کہ وہ اس ناگوار صورت حالات کو جتنی جلد ختم کر سکتے تھے کریں۔ نہ کہ اس کو اور طول دیں کیا وہ حضرت اسامہؓ اور حضرت عمرؓ ابن الخطاب کی طرح محض حضرت عائشہؓ کی برأت اور اہل نفاق کی اس سازش کا پردہ بھی چاک نہیں فرما سکتے تھے؟ لیکن چلتے اسے حضرت صدیق اکبرؓ

اور حضرت ام رومانؓ کے غایت عقیدت و احترام پر محمول کر کے اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ بات کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے متعلق راوی کا یہ ریمارک قطعاً غلط ہے کہ وہ ایک نوعمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں۔ ہم اپنے مقام پر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی عمر رخصتی کے وقت کم از کم انیس سال تھی لہذا شہد میں وہ کم از کم بائیس سال کی ایک جوان عورت تھیں۔ ماں باپ کے گھر میں بچپن سے قرآن کریم کی تلاوت ہوتے دیکھتی اور سنتی آرہی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لے آنے کے بعد تو ہر صبح و شام آپ کا مشغلہ ہی قرآن پڑھنا اور سننا تھا۔ امور خانہ داری میں مصروفیت بھی برائے نام ہی تھی۔ مہینہ مہینہ بھرتک گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ کھجور اور دودھ پر گزارہ ہوتا تھا۔ اور اکثر اس کا بھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ تو آپ کو گھر میں سوائے قرآن شریف پڑھنے اور سننے کے کام کیا تھا۔ لہذا راوی کا یہ کہنا کہ وہ نوعمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں غلط واقعہ اور خلاف حقیقت ہے۔

(۳۰) اس کے بعد راوی نے حضرت عائشہؓ کی جواب دہی نقل فرمائی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا ”اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اور تم نے اسے مان بھی لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں

کہ میں بری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے اور اگر میں تم سے اس امر کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی مثال یوسف (علیہ السلام) کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا فَصَبْرٌ جَبِيلٌ قَالَ اللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی ہوں۔ اور جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو، اس پر اللہ ہی مددگار ہے۔ یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں۔

حضرت عائشہؓ صدیقہؓ کا جواب نہایت معقول اور موقع و محل کے عین مطابق ہے اور ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کا کھلا ثبوت ہے۔ غم و اندوہ میں شدت جذبات کے ماتحت حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یاد نہ آنا عین فطرت نسوانی بلکہ فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اس موقع پر کہانی نویس نے اپنے فن کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن آخر میں وہ پھر پڑی سے اتر گیا۔ ایسے موقع پر حضرت عائشہؓ کا منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ جانا نہ صرف بد تمیزی اور گستاخی کی دلیل ہے اور اس سے پہلے ماں باپ کی جو کردار نگاری راوی نے کی تھی اس کے قطعاً خلاف ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ابو بکرؓ اور ام رومانہؓ کی بیٹی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شدید ضرورت کے وقت بھی لب کشائی کی جرات نہیں فرماتے، ان کی بیٹی یوں منہ پھیر کر پڑ رہتی ہے جبکہ یہ موقع تھا کہ وہ ان تاثرات

اور ردِ عمل کا بغور مطالعہ کرتیں جو ان کے ان کلمات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس پر مرتب ہوتے تھے جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جو اباً عرض کئے تھے۔

(۳۱) اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ فراقی ہیں۔ ”اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اور جو شدت آپ پر بوقت نزول وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہو گئی۔ سردی کا دن ہونے کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔“

سبحان اللہ! اس ساری داستان پر اگر دشمنانِ اسلام یہ بھیبتی کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمت لگانے والوں کا تو کچھ نہ کر سکے اور نہ دلائل و شواہد سے اپنے حرم محترم کی برأت ثابت کر سکے، آخروجی کا ڈھونگ رہا کہ (نعوذ باللہ) ان کی برأت کا بزعم خود اعلان کرنے کا ایک بہانہ تراش لیا۔ تو کیا جواب دیا جائے گا۔ ہم خود ہی دشمنانِ اسلام کے لئے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو بدنام اور مطعون کرنے کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں اور پھر طعن کرنے والوں پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تھا اس روایت کا تجزیہ محض درایت کے نقطہ نظر سے۔

بات بہت طویل ہو گئی ہے مگر چونکہ بات بہت اہم تھی اس لئے ہمیں تفصیل کے ساتھ بحث کرنی پڑی، ہم نے درایت کے نقطہ نظر سے اکتیس^۳ وجوہ پیش کی ہیں جن میں سے ہر وجہ ایسی ہے کہ اس کی بناء پر اس روایت کو رد کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال قرآن کریم نے تمام آیات میں کہیں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان پر تہمت لگاتے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لہذا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی کہانیاں گڑھے اور حضرت عائشہؓ پر انگشت نمائی کا سامان پیدا کرے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی سیرت النبی حصہ اول ص ۲۶ پر لکھتے ہیں کہ ہر

”واقعہ انک۔ یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقتین نے

جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی (مریض) سے

واپسی پر پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں

اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔

لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور

ہے کہ سننے کے ساتھ ہی لوگوں نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ

”یہ بالکل افتراء ہے“ اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے

کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ محض جھوٹ اور

بے ہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل

میں منافقتین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان

دھوکہ میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی۔

جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔
 آج کل کے عیسائی مؤرخوں نے بھی قدیم مؤرخوں
 کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے
 کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے۔ لیکن ہم ان
 سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔“

آپ نے دیکھا کہ اگرچہ علامہ شبلی نعمانی احادیث و سیر
 کی اس موضوعہ داستان کو رد نہیں فرما سکے۔ کیونکہ ان کے عہد
 میں ابھی لوگوں میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی
 سلیم الطبعی اپنے قلم کو اس موضوعہ داستان سے ملوث کرنا بھی
 پسند نہیں کرتی اس لئے وہ ایک سرسری تذکرہ کر کے گذر جانے
 ہی کو بہتر تصور فرما رہے ہیں۔ ایک سلیم الطبع انسان کے لئے
 ان کا یہ خفیہ سا اشارہ بھی تردید سے کم نہیں ہے۔

شانِ نزول کی دوسری روایت | آخر میں اُن حضرات کی خدمت
 میں جو آیاتِ قرآنی کی
 تفسیروں میں شانِ نزول کی احادیث بغیر گزارہ ہی نہیں کر سکتے
 ان ہی آیات کی تفسیر میں مستدرک حاکم کی یہ روایت پیش
 خدمت ہے جس کی رو سے اس آیت کریمہ کا شانِ نزول حضرت
 عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مشہور قصے کے
 بجائے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو بتایا گیا
 ہے۔ مستدرک میں ہے۔

حد ثنا علی بن حمزہ العَدَل قال حد ثنا

احمد بن علی البار قال حد ثنا الحسن بن حماد

سجادة قال حدثني يحيى بن سعيد الاموى
قال حدثنا ابو معاذ سليمان بن الارقم
الانصارى عن عروة عن عائشة رضى الله
عنها قالت اهديت مارية الى رسول الله
ﷺ الله عليه وسلم ومعه ابن عمر لها قالت
فوقع عليها وقعة فاستحرت حاملاً قالت
فعزلها عند ابن عمها قالت فقال اهل الافك
والزور من حاجته الى الولد ادعى ولد غيره
وكانت امه قليلة اللبن فاتباعت له ضائفة
لبون فكان يغذى بلبنها فحسن عليه لحمه
قالت عائشة رضى الله عنها فدخل به على
النبي صلى الله عليه وسلم فأت يوم فقال
كيف ترين فقلت من غذى بلحم الضأن يحسن
لحمه قال ولا الشبه قالت فحملنى ما تحمى النساء
من الغيرة ان قلت ما ارى شيئاً قالت فبلغ
رسول الله ﷺ الله عليه وسلم ما يقول الناس
فقال لعلى خذ هذا السيف فانطلق فاضرب
عنق ابن عمر مارية حيث وجدته قالت فانطلق
فاذا هو فى حائط على نخلة يخترق رطبها
قالت فلما نظر الى على ومعه السيف استقبلته
رعدة قال فسقطت الخرقه فاذا هو لم يخلى الله

لہ ما للرجال شیعی مسح۔

(مستدرک حاکم ص ۳۹۰)

ترجمہ :- ہم سے علی ابن حمزہ نے حدیث بیان کی جو ثقہ راوی ہیں انہوں نے کہا کہ ہم سے احمد بن علی ابان نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے حسن بن حماد سجادہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ مجھ سے یحییٰ ابن سعید اموی نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے ابو معاذ سلیمان ابن الارقم انصاری نے حدیث بیان کی، انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ماریہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں بھیجی گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا چچا زاد بھائی بھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت فرمائی تو انہیں حمل رہ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (حمل کی بنا پر) الگ رہے (تاکہ حمل کو نقصان نہ پہنچے) اور انہیں ان کے چچا زاد بھائی کے پاس بھیج دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اہل افک اور اہل زور نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیٹے کی ضرورت تھی لہذا انہوں نے دوسرے کے بیٹے پر دعویٰ کر دیا (کہ میرا بیٹا ہے) ابراہیمؑ کی ماں کے دودھ کم تھا۔ آپ نے اس

کے لئے دودھ دینے والی بکری خرید دی چنانچہ اسی کا دودھ اسے پلایا جاتا تھا۔ بچہ پر خوب گوشت چڑھ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن بچہ کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور فرمانے لگے۔ کیوں کیسا لگتا ہے تو میں نے کہا مجھے بکری کا گوشت غذا میں دیا جائے گا اس پر گوشت کیوں نہ چڑھے گا۔ آپ نے فرمایا کہ مشابہت نہیں دیکھتیں، مجھے وہی رشک سوار ہوا جو عورتوں کو سوار کرتا ہے میں نے کہہ دیا، مجھے تو کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ بات پہنچی جو لوگ آپس میں کرتے تھے تو آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یہ تلوار لو اور جاؤ مار پیٹ کا چچا زاد بھائی جہاں بھی ملے اس کی گردن اڑا دو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت علیؓ گئے تو وہ ایک باغ میں کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا پکی کھجوریں توڑ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کو دیکھا اور ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے کپکپی طاری ہو گئی اور اس کی لنگوٹی گر پڑی تو یکبارگی (حضرت علیؓ نے دیکھا) اللہ نے اس کے وہ کچھ پیدا ہی نہیں فرمایا تھا جو مردوں میں ہوتا ہے۔ محض ایک سپاٹ جگہ تھی (یعنی وہ مختل آدمی تھا)۔

یہ حدیث مستدرک حاکم کی ہے۔ مستدرک کے متعلق حاکم کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اس میں وہ صحیح احادیث جمع کی ہیں جو صحیح ہیں لیکن امام بخاری اور امام مسلم سے رہ گئی ہیں۔ ان کے اس دعوے کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی اپنے مقدمہ اعلام السنن میں لکھتے ہیں کہ :-

”حافظ ابو عبد اللہ حاکم نے مستدرک میں اُن احادیث کو درج کرنے کا اہتمام فرمایا ہے جو بخاری اور مسلم سے زائد ہیں یعنی ان دونوں کی شرط پر صحیح ہیں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط پر صحیح ہیں یا فی نفسہ صحیح ہیں اگرچہ ان میں سے کسی ایک کی شرط پر نہ بھی ہوں۔“

د قواعد فی علوم الحدیث مع التعلیق بعد الفتح
ابو غده ص ۶ مطبوعہ بیروت

بہر حال یہ بھی اسی درجہ کی حدیث ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم کی وہ حدیث ہے جس پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مستدرک حاکم کی یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے مروی ہے اور ان سے بیان کرنے والے بھی حضرت عروۃ ابن الزبیرؓ ہی ہیں جو اُس روایت کے راویوں میں بھی شامل ہیں جو بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے۔ تو بخاری اور مسلم کی روایت کو ملنے والے حضرات اس روایت کو کیوں نہیں مانتے۔

پھر یہ روایت مستدرک حاکم کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی مختصراً موجود ہے۔ چنانچہ کتاب التوبہ کے آخری باب باب برآة حرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الریبة میں ہے کہ :-

عن انس بن ان رجلاً کان یتھم بام ولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلیؑ اذهب فاضرب عنقه فاتاه علی فاذا هو فی بکی یتبرد فیہا فقال له علی اخرج فناولة یدة فاخرجه فاذا هو محبوب لیس له ذکر فکف علیؑ عنه ثم اتى النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انه لمحبوب ماله ذکر۔

(صحیح مسلم مطبوعہ مصر ۱۳۸۸ھ بتحقیق فواد عبدالباقی)

ترجمہ :- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ولد (حضرت ماریہؓ) کے ساتھ تہمت لگائی جاتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ جاؤ اور اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس گئے تو یکایک وہ ایک تالاب میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے گھسٹا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا ”باہر نکل اس نے حضرت علیؓ کو اپنا ہاتھ پکڑایا اور انہوں نے اسے نکالا تو یکایک اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ

قتل کرنے سے باز رہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ وہ تو مقطوع الذکر ہے۔ اس کے آلہ تناسل ہی نہیں ہے۔

مزید سنئے کہ حضرت مارٹھ کے متعلق یہ روایت صرف اہلسنت کی کتابوں ہی میں نہیں شیعوں کی کتابوں میں بھی ہے مشہور شیعہ عالم مولوی مقبول حسین اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ۔

تفسیر قمی میں ہے کہ عامہ کی روایت تو یہ ہے کہ یہ آیت جناب عائشہؓ کے بارے میں ہے اور حوا تہام ان پر غزوہ بنی المصطلق میں لگایا گیا تھا اس کے بارے میں ہے اور خاصہ کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت ام المؤمنین مارٹھ قبطیہ کی شان میں ہے اور جو الزام عائشہؓ نے ان پر لگایا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ امام محمد باقرؑ سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ جب فرزند جناب رسول خدا کا انتقال ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو عائشہؓ نے کہا کہ آپ رنج کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو جرج قبطی کا بیٹا تھا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علی مرتضیٰ کو بھیجا اور جرج کے قتل کا حکم دیا (آگے یہ داستان بڑی طویل ہے جس کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ علیؓ کے خوف سے جرج کا ستر کھل گیا تو معلوم ہوا کہ وہ نہ عورت ہے نہ مرد)۔

بہر حال یہ روایت تفسیر قمی میں امام محمد باقرؑ سے اور صحیح مسلم

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے صحیح مسلم کی روایت میں امام مسلمؒ کا باب برآۃ حرم النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الریبة کے تحت اس روایت کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ امام مسلمؒ اسے آیات برآت کا شان نزول سمجھتے ہیں اور اس واقعہ کو انہی آیات پر چسپاں فرما رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ پہلی روایت سے بھی گئی گذری ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض تو یہ وارد ہوتا ہے کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ثم معاذ اللہ محض سنی سنائی باتوں پر بغیر کسی شہادت اور ثبوت کے اور بغیر متہم آدمی کو اپنی صفائی کا موقعہ دیتے یونہی قتل کے احکام جاری کر دیا کرتے تھے۔ ایسا تو کوئی بڑے سے بڑا سفاک ڈکٹیٹر بھی نہیں کرتا۔ وہ بھی کم از کم کچھ جھوٹے گواہ پیدا کر کے اور کوئی جھوٹا ثبوت مہیا کر کے ہی ایک معصوم جان کو قتل کرتا ہے چہ جائیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بے ثبوت سفاکی کا اتہام لگایا جائے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اس آدمی کو تو قتل کرانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ لیکن اس کنیز کو آپ نے کچھ نہیں کہا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بچتی۔ زنا کا ارتکاب مرد اور عورت دونوں ہی کرتے ہیں اور دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں اگر

آپ نے اس زانی کو قتل کرنا چاہا تھا تو زانیہ کو بھی قتل کرنا چاہیے تھا۔

قیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو قتل کیوں نہیں کیا۔ ان کو صاف طور پر یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ تلوار لو اور اس کی گردن مار دو۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اس کو جا کر دیکھو۔ اگر وہ مقطوع الذکر ہو تو اسے چھوڑ دینا اور اگر اس کے آئینہ تناسل پاؤ تو قتل کر دینا۔ انہوں نے اختیار تمیزی سے کیوں کام لیا۔ ان کا کام تو تعمیل ارشاد تھا۔ انہیں اسے قتل کر دینا چاہیے تھا۔

بہر حال ہمارے نزدیک یہ روایت بھی قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اس پر کوئی توجہ کی جائے بلکہ ہم تو اِذَا تَعَادَا تَنَا قَطَا کے اصول کے مطابق حضرت عائشہؓ کے متعلق روایت ہو یا حضرت ماریہؓ کے متعلق دونوں کو موضوع اور گھڑی ہوئی سمجھتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا تو وہ افک کے احکام بتاتے ہوئے اس قسم کے کسی واقعہ کا خود ہی ذکر فرما دیتا۔ جب اس نے ذکر نہیں فرمایا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان احکام کا سمجھنا ان واقعات پر موقوف نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کسی بھی زوجہ مطہرہ کو متہم بتانے والی موضوع روایات کا ذکر کرنا چاہتا ہے یا کم از کم ان پر لگائے گئے کسی اتہام کا ذکر ضروری سمجھتا ہے تو وہ اپنی عاقبت

کی فکر کرے اور قیامت کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم،
 حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ماریہ قبطیہ
 رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہے۔ وَسَيَعْلَمُ
 الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ○

(کتاب السرقة)

چوری کرنے والوں کی سزا کے متعلق قرآن کریم میں ایک ہی آیت ہے جو بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے :-

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً
بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنْ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥

(۵ / ۳۸)

ترجمہ :- اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت، تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ سزا ہے اس عمل کی جو انہوں نے کمایا۔ یہ اللہ کی طرف سے سزائے عبرت ہے اور اللہ بڑا غالب حکمت والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بنیادی لفظ السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ ہے۔ سوال یہ ہے کہ سرقة کسے کہتے ہیں؟ ایک آدمی کو ہم چوری کرنے والا یا چوری کرنے والی کب کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ لغت کے اعتبار سے چوری اسے کہتے ہیں کہ کسی غیر کا مال چھپ کر رازداری کے ساتھ

لے لیا جائے۔ نیز جو چیز چرائی جائے وہ قیمتی ہونی چاہیے۔ کسی نے اگر دوسرے آدمی کے گھر سے ایک گلاس پانی لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا یا کوئی بہت ہی معمولی چیز مثلاً سوئی، دھاگہ، بٹن، آم کی ایک کیری، مھوڑا، اسمک مرچ لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ چیز محفوظ جگہ سے لی گئی ہو۔ اگر سڑک پر پڑی ہوئی ہے۔ دروازہ کے باہر پڑی ہوئی ہے۔ کسی غیر محفوظ مقام مثلاً پبلک پارک یا میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک آسکتا ہے اور وہاں سے کسی نے کوئی چیز لے لی ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا۔

فقہاء نے مسجدوں، پبلک اسکولوں، جماعت خانوں وغیرہ کو بھی اسی میں شامل کیا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ان مقامات سے چوری کرنے کی شاعت تو اور بھی زیادہ ہے۔ لہذا ان صورتوں میں سخت سزا دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی وہ چیزیں جو جلد خراب ہو جانے والی ہوں، مثلاً دودھ، دہی، سبزیاں، پکے پھل، پکا ہوا سالن، کچا گوشت وغیرہ ان چیزوں کے لئے لینے کو بھی چوری نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ممکن ہے یہ چیزیں اس نے اس لئے لی ہوں کہ ان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے یہ سمجھا ہو کہ میں انہیں استعمال کروں تو یہ کام آجائیں گی ورنہ سڑ بھس جائیں گی اس لئے اسے بھی چوری میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ چوری کا ثبوت اس وقت ہوگا جب وہاں کسی شبہ اور تاویل کی گنجائش نہ ہو، مثلاً کسی نے اپنے والدین کے ہاں سے اپنی اولاد کے ہاں سے یا کسی ذی رحم محرم کے

ہاں سے کچھ چرا لیا تو چونکہ اس میں مشہہ اور تاویل کی گنجائش ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی چیز سمجھ رہا ہو کیونکہ والدین ، ماموں ، چچا ، بھانجا ، بھتیجا بیٹا وغیرہ ایسے رشتے ہیں کہ آدمی ان کی چیزوں کو غیروں کی چیز نہیں سمجھتا تو اسے اصطلاح شریعت میں چوری نہیں کہا جائے گا۔ بشرطیکہ معاشرہ کے عرف اور رواج میں اس کی گنجائش ہو اور حاکم مجاز اس تاویل سے مطمئن ہو اور مال مسروقہ اتنا ہو کہ عرف عام میں اسے چوری نہ کہا جاتا ہو۔ لیکن اگر بیٹے نے باپ کی تجوری توڑ کر دس ہزار روپے چرائے ہیں یا بکس اور الماری توڑ کر ماں کے زیورات چرائے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ عرف عام میں اسے چوری نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا یہ چوری ہوگی اور اس پر قطعید کی حد جاری کی جائے گی۔ چوری کرنا لوگ اول اول اپنے گھروں ہی سے سیکھتے ہیں۔ لہذا اس کا سدباب ضروری ہے۔

بہر حال ان چند شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر یہ شرائط موجود ہوں تو اس وقت اگر کوئی شخص کسی کی چیز محفوظ مقام سے خفیہ طور پر لیلے تو اسے چوری کرنا کہا جائے گا اور اسے شریعت کے مطابق سزا دی جاسکے گی۔ یہ باتیں انسانوں کی عقل عام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو کتنے نہ کسی نص کی ضرورت ہے اور نہ کوئی بے لچک قانون بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی کہ مسروقہ چیز قیمتی ہونی چاہیے۔ اس میں کہ قیمتی چیز کسے کہا جائے گا فقہاء کی رائے میں اختلاف رہا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک وہ ایک چوتھائی دینار کی قیمت کی ہونی چاہیے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تین درہم قیمت کی ہونی چاہیے۔ حنفیہؒ کا مذہب یہ ہے کہ وہ دس درہم کی قیمت کی ہونی چاہیے۔ روایت سے معلوم

ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں ایک ڈھال کی قیمت کے برابر اگر کوئی چیز چرائی گئی تو آپ نے چور کا ہاتھ کاٹ دیا ہے پھر اس میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت کتنی ہوتی تھی۔ تین دھم سے لے کر دس دھم تک۔ روایات ملتی ہیں۔ اسی اختلاف پر فقہاء کا اختلاف مبنی ہے۔ حنفیہ کا قول مبنی بر احتیاط معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ قیمت والی روایات کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ حدود میں احتیاط ہی مد نظر رہنی چاہیے۔

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ حدود میں قرآن کریم نے جو سزائیں بیان فرمائی ہیں وہ انتہائی سزائیں ہیں۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ عربی زبان میں نَكَال کا لفظ ایسی سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو جرائم کی انتہائی صورتوں میں دی جائیں اور لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہو سکیں اب چونکہ ہمارے عہد میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بڑا تفاوت ہو چکا ہے۔ ضروری نہیں کہ جو چیزیں آپ کے زمانہ میں قیمتی سمجھی جاتی تھیں وہ آج بھی قیمتی سمجھی جاتی ہوں اور جو آج قیمتی سمجھی جا رہی ہیں غین ممکن ہے کہ کل کو قیمتی نہ سمجھی جائیں۔ اس بات کا مدار معاشرہ کے اقتصادی حالات پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی متعین مقدار ہمیشہ کے لئے متعین نہیں کی جاسکتی۔ لہذا ہمیں نظام سزا پر بڑی احتیاط سے نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری پارلیمنٹ کو غور و خوض کے بعد موجودہ حالات کے مطابق قانون سازی کرنی چاہیے اور بتانا چاہیے کہ آج کے عہد میں کس قیمت کی چیز پر ہاتھ قطع کر دینا چاہیے اور کس قیمت

تک دوسری سزاؤں پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

ہمارے نزدیک جیل خانوں میں بند کر دینا اور قید و بند کی سزائیں دینا کچھ مفید نتائج مرتب نہیں کر رہا ہے۔ ہمارے جیل خانے جرائم کی اچھی خاصی تربیت کا ہیں بن گئی ہیں۔ جیل خانوں میں جا کر مجرم بجائے کچھ نصیحت حاصل کرنے اور بجائے اپنی اصلاح کرنے کے جرائم میں پختہ کار اور عادی مجرم بن کر نکلتے ہیں۔ وہاں جرائم پیشہ لوگوں کی صحبت میں آدمی بجائے اپنی اصلاح کرنے کے متنوع جرائم سیکھ کر نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں تجویز نہیں کیں۔ ورنہ حق تعالیٰ کے لئے ایسا کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم کے عہد نزول میں جیل خانے نہیں تھے۔ اس لئے قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں نہیں دیں۔ خود قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں فرعون کے قید خانہ کا ذکر موجود ہے۔ عرب کے آس پاس ایسی متعدد قومیں موجود تھیں جن کے ہاں جیل خانے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جیل خانہ بنالیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کوئی جیل خانہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن آپ نے لوگوں کو مختلف صحابہ کے محفوظ مکانات میں قید کیا ہے۔ روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ عرب میں جیل خانوں کا رواج نہیں تھا اور وہ جیل خانوں سے واقف نہیں تھے تو جس طرح حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا تھا اور اس کی تعلیم دی تھی کیا مشکل تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیل خانے بنانے کی تعلیم دے دیتے۔ لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ قید و بند کی سزائیں دینا حق تعالیٰ کو منظور ہی نہیں تھا۔ لہذا جن چودہویں میں ہماری پارلیمنٹ نے کاٹنے کا فیصلہ کرے اس کے لئے بجائے قید و بند کی سزاؤں کے کوڑے مارنے کی سزا مقرر کر دینی چاہیئے۔ کہ قرآن کریم نے کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی ہے اور یہ سزا اس نے اخلاقی جرائم ہی میں تجویز کی ہے۔

دافع رہے کہ میں جیل خانوں کی افادیت کا انکار نہیں کر رہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی مجرموں کے لئے جیل خانے مفید مطلب نہیں۔ دوسری انواع کے مجرموں کو قید و بند کی سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ نیز جب تک مقدمات کے فیصلے نہ ہو پائیں اتنے عرصہ تک مجرموں کو قید میں رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسرے عادی مجرموں کے ساتھ انہیں اختلاط کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ ساتھ ہی ہمیں جیل خانوں کی اصلاح کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہیئے تاکہ وہ اصلاح گمر بن سکیں۔ جرائم کی تربیت گاہیں نہ رہیں۔

قطع ید | نیز آیت کریمہ میں قطع ید کا لفظ بھی قابلِ خود ہے
 قطع کے معنی کسی چیز کو کاٹ دینا۔ راعب نے کہا ہے کہ یہ لفظ حسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے قَطَعَ الْخَمْرَ اس نے گوشت کاٹا اور معنوی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے قَطَعَ السَّيِّئَاتِ یعنی ڈاکہ ڈال کر راستہ کو پر خطر بنادینا کہ لوگ ڈر کے مارے سفر نہ کر سکیں قَطَعَ لِسَانَهُ کسی پر احسان طافا کہہ کے اس کی زبان بند کر دینا کہ وہ بدگوئی نہ کر سکے۔ قَطَعَ رَجَسَهُ اس نے قرابت داری کے حقوق کو ادا نہیں کیا۔ قرآن کریم میں ہے۔

يَقْطَعُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِمْ أَنْ يُوْصَلَ (۲۰۸)

ترجمہ ۱۔ وہ ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں اللہ نے ملانے کا حکم دیا تھا۔

یہاں بھی جستی قطع نہیں، بلکہ معنوی قطع مراد ہے۔ قَطَعَ خَصْمَهُ بِالْحِجَّةِ اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو ساکت اور لاجواب کر دیا۔ قَطَعَتْ لِسَانَهُ اس کی زبان جو پہلے بڑی تیز چلا کرتی تھی بند ہو کر رہ گئی۔ قَطَعَتْ يَدَكَ اس کا ہاتھ بے کار ہو گیا۔ قرآن کریم نے سورۃ یوسف میں قَطَعَ يَدَ كَ لفظ ہی استعمال فرمایا ہے۔

وَقَالَ لِسُوءَةٍ فِي الْمَكِيِّنَاتِ الْعَزِيزِ مُرَادُ
فَتَهَا عَنِ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا
فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ
إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مَتَاعًا وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ
مِنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا أَرَأَيْنَهُ
اَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ
مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝

(۲۰۹)

ترجمہ ۲۔ اور شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عجزی (مصر) کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے تاکہ اسے بوجھالے۔ وہ اس کی چاہت میں اپنا دل ہار بیٹھی ہے۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بد چلنی کا شکار ہو گئی ہے۔ جب عزیز

۱ (مصر) کی بیوی نے ان کی مکاری کی یہ باتیں سنیں تو انہیں
 بلوا بھیجا اور ان کے لئے مسندیں آراستہ کیں (اور دستور
 کے مطابق) ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھری عہد دی (کہ کھانا
 کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسف
 سے کہا، ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب یوسف نکل آیا
 اور ان عورتوں نے اسے دیکھا تو (ایسا پایا کہ) اس کی بڑائی
 کی قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور
 بے اختیار پکار اٹھیں۔ سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ہے
 ضرور ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبہ والا فرشتہ۔

یہاں قَطَعْنَ اَیْدِیْھُنَّ کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ انہوں
 نے پہنچوں سے ہاتھ کاٹ کر الگ ڈال دیئے تھے۔ بلکہ اس کے معنی
 یا تو یہ ہیں کہ کھانا کھاتے کھاتے ان کے ہاتھ فرط حیرت سے رگ
 گئے اور جو پھل وغیرہ وہ کاٹ رہی تھیں وہ کاٹنا ہی بھول گئیں
 یا یہ معنی ہیں کہ چھری ان کے ہاتھوں میں تھی وہ فرط حیرت سے بجائے
 پھل کاٹنے کے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر بیٹھیں۔ بہر حال یہاں قَطَعْنَ
 اَیْدِیْھُنَّ کے معنی ہاتھوں کو روک لینے یا زخمی کر لینے کے ہیں
 سورۃ عنکبوت میں قوم لوط کے متعلق ہے۔

اَمْحَکُمۡ لَنَّاۤءُ نَوْنِ التَّوۡجَاۡلِ وَنَقۡطَعُوۡنَ السَّبۡیۡلَ (۲۹)

ترجمہ: کیا تم (شہوت رانی کے لئے) مردوں کے پاس جاؤ
 ہو اور راستہ بند کرتے ہو۔

اس آیت میں قطع السبیل کے معنی یا تو یہ ہیں کہ تم ڈاکے ڈالتے
 ہو اور لوگوں کو سفر کرنے سے روک دیتے ہو یا یہ معنی ہیں کہ تم اپنی

بد عملی یعنی لواطت سے افزائش نسل کی راہیں بند کرتے ہو۔ بہر حال دونوں معنی میں حتیٰ کا ٹٹا نہیں ہے بلکہ معنوی قطع مراد ہے۔ قَطَعَ التَّجَلُّلُ کے معنی ہیں 'آدمی نا اُمید ہو گیا اور عاجز رہ گیا۔

(راغب، ابن فارس، تاج العروس و محیط المحيط)

اس میں دوسرا لفظ يَدٌ ہے۔ ویسے تو اس کے معنی ہاتھ کے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عربی زبان میں نہایت وسیع ہے۔ جیسے اُردو زبان میں ہاتھ کا لفظ نہایت ہی وسیع ہے اسی طرح عربی زبان میں بھی يَدٌ کا لفظ بے شمار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آجاء اور وقار۔ قوت و اقتدار۔ غلبہ و تسلط۔ ملکیت۔ مددگار۔ امداد اور فریاد رسی۔ احسان و انعام۔ حفاظت و صیانت۔ حذاقت و مہارت ندامت و شرمندگی، ذلت و انقیاد جیسے بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے خود قرآن کریم میں یہ لفظ ان میں سے بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:-

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ (۳۳)

ترجمہ:- پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ فضل اللہ کے اختیار اور قبضہ میں ہے۔

بِيَدِ الْخَيْرِ (۳۴)

ترجمہ:- بھلائی تیرے قبضہ میں ہے۔

اَوْ يَعْنُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۳۵)

ترجمہ:- یا وہ معاف کر دے جس کے اختیار میں نکاح کا بندھن باندھنا ہے۔

قُلْ مَنْ يَمْلِكُ مَلَكُوتَ كُلِّ شَيْءٍ (۳۶)

ترجمہ: اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ ہر چیز کی حکومت کس کے
اقتدار میں ہے؟

قَبَارَتِ الَّذِي يَمْدِدُ الْمُلُكُ (۶۸)

ترجمہ: بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضہ و اقتدار میں
حکومت ہے۔

قَالَ يَا بَلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتَ بِمِثْلِي (۶۹)
ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس! تجھے کس چیز نے
روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنی قدرت سے پیدا
کیا تھا؟

وَأَذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ
أُولِي الْأَيْدِي۔ (۷۰)

ترجمہ: اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسمٰعیل اور یعقوب
کا تذکرہ کیجئے جو بڑی قوتوں کے مالک تھے۔

قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے ان معانی پر
رکھنی پڑتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات ہاتھ پاؤں سے منزہ ہے حق تعالیٰ کے ہاتھ
سے کوئی کام ہونے کا مطلب یقیناً یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی قدرت
ارادہ، قبضہ، اقتدار، غلبہ اور تسلط کی بنا پر وہ کام ہوا ہے۔
لہذا قَطْعُ الْيَدِ کے معنی کسی کی قدرت، قبضہ اور اقتدار یا غلبہ
و تسلط کو ختم کر دینے کے بھی ہوں گے۔ نیز قَطْعُ الْيَدِ کے معنی ہاتھوں
کو زخمی اور بے کار کر دینے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ عزیز مصر کی
بیوی نے جب شہر کی خواتین کو بلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو
دیکھ کر فرط حیرت و استعجاب سے مبہوت ہو کر ان کے ہاتھ رک گئے

کھتے یا انہوں نے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیا تھا۔ نیز قطع الید کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاتھ کے کسی حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ پانچوں انگلیوں اور ہتھیلی کو پہنچے سے کاٹ دینا بھی قطع الید کہلا سکتا ہے۔ نیز ہاتھ کی کسی انگلی کو یا انگوٹھے کو کاٹ دینا بھی قطع الید کہلا سکتا ہے۔ بہر حال قطع الید کی یہ تمام صورتیں ہو سکتی ہیں۔ خود ہمارے ہاں اردو زبان کا محاورہ ہے کہ ”تم نے تو دستاویز پر دستخط کر کے اپنے ہاتھ ہی کاٹ لئے۔ یعنی اپنے اختیار کو ختم کر دیا اور اپنے آپ کو پابند اور مجبور و معذور بنا لیا۔ یہ تمام صورتیں قطع الید ہی کی ہیں۔ چوری میں حکومت وقت کو اس قسم کی قانون سازی کرنی چاہیے کہ کتنے بڑے جرم میں اسے قطع ید کی کوئی صورت اختیار کرنی چاہیے۔ بہر حال قطع ید کی یہ صورت کہ ہاتھ کو پہنچے سے کاٹ دیا جائے انتہائی اور آخری سزا ہے جو اسی وقت دی جاسکتی ہے جبکہ کسی آدمی نے بہت بڑی چوری کی ہو۔ اور اسلامی رفاہی حکومت قائم ہو۔ اس کی تمام بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت کر رہی ہو۔ اسے چوری کرنے کی کوئی ضرورت اور احتیاج لاحق نہ ہو۔ اگر ان حالات میں کوئی شخص لاکھ دو لاکھ روپے کی بڑی چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ اس سے کم مقدار کی چوری میں اس کی صرف ایک آدھ انگلی کاٹ دی جاتے۔ اس سے کم میں اس کے ہاتھوں کو صرف زخمی کر دیا جائے۔ اس سے بھی کم مقدار میں کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام نہ لے سکے۔ اس کو قید کر دیا جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کا غلبہ و اقتدار اور قوت و استعداد ناکارہ ہو کر

کیونکہ چوری کرنے والے کو قید کر دینے سے لے کر ہاتھوں کو زخمی کر دینے۔ ہاتھ کا کچھ حصہ مثلاً ایک انگلی کاٹ دینے اور پورے ہاتھ کو پہنچنے سے کاٹ کر الگ کر دینے تک سب قطع ید کی صورتیں ہیں۔ اس کا فیصلہ بھی حکومت وقت کو اپنے احوال و ظروف کے ماتحت کرنا چاہیے۔ نیز اگر حکومت رفاہی نوعیت کی نہیں ہے۔ افراد ملت کی بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت وقت نہیں کر رہی ہے معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں ہیں۔ کوئی لکھتی ہے تو کوئی نان شبینہ کو محتاج ہے۔ ایسی حکومت کو قطعاً اختیار نہیں ہے کہ وہ چوری کی حدود قائم کرے۔ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط سالی کے زمانہ میں سرقہ کی حد کو معطل فرما دیا تھا۔ نیز ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے کہ عباد بن شریلؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے قحط سالی نے ستایا تو میں مدینہ کے باغ میں گھس گیا اور میں نے باغ سے پھل توڑ لئے۔ کھاتے بھی اور کپڑے میں باندھ کر لے چلا۔ باغ کے مالک نے آکر مجھے پکڑ لیا۔ مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا اور مجھے پکڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ وہ ناواقف اور جاہل تھا۔ تم نے اسے بتایا نہیں، وہ بھوکا اور گرسنہ تھا تم نے اسے کھلایا نہیں آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ اس کا کپڑا اسے واپس کرو۔ اور مجھے اپنے پاس سے ایک وسق یا نصف وسق (پیمانہ کا نام ہے) کھانے کی چیزیں عطا فرمائیں۔ (ابوداؤد و نسائی بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۲۱)

یہی ابن عبد الرحمن کا بیان ہے کہ حضرت حاطبؓ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرائی اور اسے کاٹ کر کھا گئے۔ اور حضرت

عمرؓ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اول تو آپؐ نے کثیر ابن الصلتؓ کو حکم دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیں۔ لیکن فوراً ہی حضرت عمرؓ کو خیال آیا اور انہوں نے حضرت عاصؓ سے کہا کہ میرا خیال ہے تم غلاموں کو بھوکا رکھتے ہو۔ میں تم پر اتنا تاوان ڈالوں گا جو تمہیں گراں ہو۔ پھر مزنی سے پوچھا کہ تیری اونٹنی کی کیا قیمت تھی؟ (ابھی مزنی کچھ کہنے نہیں پایا تھا) حضرت عمرؓ نے خود ہی کہا کہ میں اسے چار سو درہم کی فرض کر لیتا ہوں۔ لہذا تم اس مزنی کو آٹھ سو درہم ادا کرو۔
(جمع الفوائد ص ۲۹)

بہر حال ملک و ملت کے حالات و کوائف کو بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اندھا دھند حدود کو نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی نے حالات سے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ وہ بھوکا تھا۔ اس کے بیوی بچے بیمار تھے اسے ان کے علاج کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس نے چوری کی ہے تو حکومت اور معاشرہ اس کی چوری کا ذمہ دار ہے۔ اسے اس کا تاوان دینا چاہیئے۔

چنانچہ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت رافع بن عمروؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ڈھیلے مار مار کر ایک انصاری کے نخلستان سے کھجوریں گرا رہا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ”رافع! یہ تم ان کے درختوں پر کلوخ اندازی کیوں کر رہے تھے؟“ عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ! بھوک نے مجبور کر دیا تھا“ فرمایا، کلوخ اندازی تو نہ کیا کرو، ہاں ادھر ادھر جو کھجوریں خود ٹپک پڑیں وہ کھا لیا کرو، اللہ تمہیں شکم سیر اور سیراب کرے۔“

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رافعؓ کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ پختہ ہو کر خود گر جانے والی کھجوریں کھانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اپنے ایک غلام کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لایا کہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ یہ تمہارا ہی تو خادم ہے اور اس نے تمہارا ہی تو مال چرایا ہے۔

نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مالِ خمس کے غلاموں میں سے ایک غلام نے خمس کے مال ہی میں چوری کر لی تھی۔ اس کا مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا اور فرمایا۔ سب اللہ ہی کا تو مال ہے۔ اللہ کے مال نے اللہ کا مال چرایا ہے تو کیا ہوا۔ (لقد دینی بضع بموالہ جمع الغنائم ۱۲)۔
 • اصحابِ سنن نے حضرت بسر بن ارطاةؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ سفر میں ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے (سفر سے مراد عام سفر اور سفر جہاد دونوں ہیں)۔

بہر حال روایات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ خلفائے راشدین نے ہر چوری پر قطع ید کی سزا نہیں دی، بعض صورتوں میں معاف فرمادیا، بعض صورتوں میں غلام کے مالک سے تاوان دلوایا، بعض صورتوں میں معمولی تعزیر فرمادی اور بعض میں الٹا انعام بھی دیا۔

لیز بعض خاص حالات میں سزائے سرقہ کو معطل ہی فرمادیا

مثلاً سفر میں، قحط میں یا معمولی چیزوں کی چوری پر۔

نیز اصحابِ سنن کی دوسری روایتوں سے جو حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ بھی ثابت ہے کہ غیر محفوظ مال کی سزا قطع ید نہیں اور درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی چوری پر بھی قطع ید نہیں، نیز ایک خاص مقدار سے کم قیمت (نصاب سے کم چوری) پر بھی قطع ید کی سزا نہیں بلکہ ان سب صورتوں میں تعزیر ہے یا دو گنا تاوان یا دونوں۔

عباد بن شراحیل کی روایت ہم پہلے پیش کر چکے ہیں اسے غور سے دیکھئے۔ اس میں ایک بڑا ہی بنیادی نکتہ ملے گا۔ جس باغ سے عباد بن شراحیل نے پھل توڑے تھے اور باغ والے نے انہیں مار پیٹ کر ان کا کپڑا ان سے چمپیں لیا تھا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :-

مَا عَلَّمْتُكُمْ اِذَا كَانَ جَاهِلًا وَلَا اطْعَمْتُهُ اِذَا كَانَ سَلْبًا۔

ترجمہ :- یہ نادان اور جاہل تھا تو تم نے اسے تعلیم نہیں

دی اور یہ بھوکا تھا تو تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی سزا نہیں دی بلکہ

خود باغ والے سے اس کا کپڑا واپس دلایا اور خود اپنے پاس سے اسے

غلہ مرمت فرمایا۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

در اصل ایک بنیادی نکتہ ارشاد فرما دیا ہے۔ یعنی چوری کی سزا۔

پہلے دو چیزیں ضروری ہیں اول ثواب اخلاقی اور دہنی تعلیم و تربیت

اور دوسرے معاشی فراغت۔ ان دونوں چیزوں کے بغیر قطع ید کی سزا

نہیں دی جاسکتی۔

لہذا اگر تعلیم و تربیت سے یہ مرض دور ہو سکے تو —————
 قطعید کے بجائے یہی کرنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ
 اخلاقی تعلیم اور ذہنی تربیت اور ضروریات زندگی مہیا ہونے کے بعد
 بھی اگر کوئی چوری کرے تو وہ اجرائے حد کا مستحق ہوگا۔ یہی صورت
 حدزنا میں بھی ہے۔ جہاں معاشرے نے جائز نکاح میں ہزار طرح کی
 مالی اور رواجی رکاوٹیں ڈال رکھی ہوں اور حرام کاری بہ نسبت
 نکاح کے ہزاروں درجے سہل اور آسان ہو وہاں جرم زنا پر حد
 جاری کرنا کوئی انصاف نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک
 بھوک کے مارے کے لئے کچھ غلہ چرا لینے پر حد سرقہ لگانا قرین عدل
 نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حد وہاں لگتی ہے جہاں جائز وسائل کے موجود
 ہوتے ہوئے ناجائز ذرائع استعمال کئے جائیں اور ایسی حالت میں
 حدود و تعزیر سے پہلو تہی کرنا ہزار قسم کے جرائم اور فساد فی الارض
 کا سبب ہو سکتا ہے۔ لہذا ایسی سوسائٹیاں جہاں —

درمیان قعر دنیا تختہ بندم کردہ
 باز می گوی کہ دامن ترمن ہشیارباش

والی کیفیت ہو، وہاں ایسی سزاؤں کے سلسلے میں انتہائی احتیاط
 کی ضرورت ہے۔ اسی لئے قدیم فقہائے کرام نے اس سلسلے میں بہت ہی
 کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ یعنی وہ بتانا چاہتے تھے کہ شدید محرکات کے
 باوجود یہ سزائیں نافذ نہیں کرنی چاہئیں۔

دو قابل غور نکتے | اس سلسلے میں دو قابل غور نکتے ہیں جن
 پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک نکتہ

تو یہ ہے کہ سرقہ کی حد کے بیان سے چار آیات پہلے ایک بڑا اصولی

اور بنیادی حکم یہ بتا یا گیا ہے کہ ۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا
أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ
يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي
الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

إِلَّا الَّذِينَ قَاتَلُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْرَأَ رُؤُوسَهُمْ
فَانْجَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (۳۳-۳۴)

ترجمہ :- جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے
ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی
سزا بس یہی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی
جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں
یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے ۔ یہ ان کے لئے اس دنیا میں
تور سوائی ہے اور آخرت میں اللہ کے لئے بڑا ہی عذاب ہے
بجز ان لوگوں کے جو قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ، خود ہی
باز آجائیں (اور توبہ کر لیں) تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بڑے
بخش دینے والے اور مہربان ہیں ۔

اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا بالکل وہی مفہوم ہے جو
سبوتاژ (SABOTAGE) کا ہے ۔ چنانچہ ہمارے فقہار کرام نے اس سے
مراد ڈالیتی ، بغاوت اور ہر وہ فتنہ و فساد لیا ہے جو اسلامی معاشرہ
کے خلاف کاری ضرب لگانے کے لئے عمل میں لایا جائے ۔ سود خوری کو
بھی قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے خلاف جنگ قرار دیا ہے ۔

بہر حال بغاوت ہو، ڈاکہ فونی ہو یا جو صورت بھی اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کی جائے وہ چوری کی بہ نسبت زیادہ بڑا جرم ہے اور قرآن کریم نے اس کے لئے چار متبادل سزائیں تجویز فرمائی ہیں۔ قتل۔ پھانسی۔ قطع دست و پا اور نفی من الارض۔ (جس کے معنی ملک بدر کرنا بھی ہیں اور قید کر دینا بھی) اب اہل علم کو سوچنا چاہیے کہ قرآن کریم نے چوری سے بڑے جرم کے لئے چار متبادل سزائیں رکھی ہیں تو اس سے ہلکے جرم یعنی چوری کے لئے صرف ایک ہی سزا کیوں؟ اگر چور بڑے مجرم کو ملک بدر یا قید کیا جاسکتا ہے تو چور کو جو چھوٹا مجرم ہے یہی سزا کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس کے جواب میں یہی کہا جاتے گا کہ قرآن کریم میں ایسا ہی ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی لفظی پیروی ہی ضروری ہے تو چور کی دوسری چوری پر آپ اس کا الٹا پاؤں کیوں کاٹتے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے تو چور کی سزا میں **فَاقْطِعُوا آيِدِيَهُمَا** فرمایا ہے **فَاقْطِعُوا آيِدِيَهُمَا قَدْ أَزْجَلَهُمَا مِنْ خِلَافٍ** تو نہیں فرمایا اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں ایسا ہی آیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد فرما کر یعنی اسی بحاربت کی آیت: **أَوْ تُقَطَّعَ آيِدِيُهُمَا قَدْ أَزْجَلَهُمَا مِنْ خِلَافٍ**۔ (پہا)

ترجمہ: اور مخالف جہت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں

ہی سے استنباط فرما کر یہ حکم دیا ہے کہ ایسے بدظنیت انسانوں کو جو ایک مرتبہ ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی باز نہ آئیں صرف ایک ہاتھ کاٹ دینا کافی نہیں۔ انہیں بے دست و پا کر دینا چاہیے اور اس کی

بہترین شکل میں خلافت ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری گذارش یہی ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاربت کی آیت سے استدلال فرما کر باایاں پاؤں (دوسری چوری میں) کاٹنے کا حکم دیا ہے اور سرقہ کی آیت کی لفظی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا تو اسی آیت سے یہ استنباط بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح ایک معاشرے کو مخرب اثرات سے بچانے کے لئے بڑے جرم (باعنی یا ڈاکو) کو ملک بدری یا قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے اسی طرح اگر قاضی مناسب سمجھے تو چھوٹے جرم (چور) کو بھی یہ سزا دی جاسکتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ملک کا قید خانہ ایسا ہو جہاں تعلیم و تربیت اور نفسیاتی علاج کے ذریعے ذہنی تربیت دے کر اور کسب معاش کے لئے بہتر ہنر سکھا کر اسے اس سرقہ کی عادت سے باز رکھنے کا قوی امکان ہو۔ جب چور کو معافی بھی دی جاسکتی ہے۔ اور بعض اوقات وہ اثاثہ انعام بھی پاسکتا ہے۔ جب بھوک میں کسی کے باغ سے گری پڑی کھجور یا کھانپنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ جب سفر اور قحط میں قطع ید سے احتراز کیا جاسکتا ہے۔ جب خادم کو اس سزا سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے جب ڈنڈ اور معمولی تعزیر پر اکتفا کی جاسکتی ہے اور ان سب حالات میں قطع ید کے قرآنی حکم سے کوئی تعارض یا تناقض لازم نہیں آتا تو کیا صرف ملک بدری اور قید ہی ایک ایسی چیز ہے جو حکم قرآنی کے خلاف جاتی ہے؟

چور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کر لے | دوسری بات اس سلسلے میں یہ بھی قابل غور ہے کہ اوپر کی زیر بحث آیت محاربہ میں ڈاکوؤں، باغیوں یا دوسرے

سبوتا ج کرنے والوں کی سزا بیان فرمانے کے بعد حق تعالیٰ کا ارشاد دیکھ۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَنْ تَقْرَأَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ
أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (۴۴)

ترجمہ :- مگر یہ مجرمین اگر اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ (گرفتار کرو) تو سمجھ لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اب ذرا چور کی سزا بھی سن لیجئے۔ چور کے متعلق حق تعالیٰ کا

ارشاد ہے کہ :-

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءَ
بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○
فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ فَأَصْلَحْ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ
عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (۴۵)

ترجمہ :- چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کرتوت کی سزا بھی ہے اور اللہ کی طرف سے (دوسروں کے لئے) عبرت بھی۔ یقیناً اللہ غلبہ اور حکمت والا ہے۔ پھر جو اپنی زیادتی کے بعد توبہ کر لے اور اپنی اصلاح بھی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ محاربہ (سبوتا ج) عام ہرج منج سے بڑا جرم ہے۔ ایسے محاربہ چاروں قسم کی سزائوں سے محفوظ رہنا چاہئے گے اگر گرفتاری سے پہلے پہلے وہ توبہ کر لیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن اگر سارق سزا پانے سے پہلے توبہ کر لے اور اس کے ساتھ

اصلاحِ حال بھی کرے — بلکہ اگر چوری کا مال واپس بھی کر دے — جب بھی وہ قطعِ ید سے نہیں بچ سکتا۔ سب کے نزدیک اس پر حد جاری کرنا ضروری ہے۔ اس کی وجہ؟ وجہ صرف یہی بتائی جاتی ہے کہ محاربین کی سزا کے بعد حرفِ استثناء **إِلَّا** آگیا ہے اور چوروں کی سزا کے بعد **إِلَّا** کے بجائے **فَمَنْ** آیا ہے۔ یعنی ”**إِلَّا**“ تو استثنا کے لئے آتا ہے اور ”**فَمَنْ**“ اس لئے نہیں آتا۔ لہذا بڑے مجرم کے لئے توبہ سے معافی ہو سکتی ہے۔ لیکن چھوٹے مجرم کے لئے یہ معافی نہیں ہے شیخ الاسلام امام ابو بکر حصاں رازیؒ نے احکام القرآن میں یہ بتانے کی بڑی کوشش فرمائی ہے کہ یہ معافی محارب کے لئے کیوں ہے اور سارق کے لئے کیوں نہیں ہے۔ لیکن بات بن نہیں سکی۔ کم از کم ہماری تسلی تو نہیں ہو سکی۔ وہ صرف اس لئے اس تفریق کے قائل ہیں کہ لوگ ایسا ہی مانتے چلے آئے ہیں اور اس کو معصیث ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہماری تسلی نہیں ہو سکی۔ شاید اس کی وجہ یہاں تصورِ فہم ہو۔ واللہ اعلم

آپ ذرا دونوں مجرموں کے لئے الفاظ کا مقابلہ کر کے دیکھئے۔

(سارق)

فَمَنْ قَاتَلَ مِنْهُمْ بَعْضٌ فَلَهُ مَا يَكْتَسِبُ
وَأَصْلَحَ۔

ترجمہ ۱۔ پھر جو اس مجرم کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے۔
فَوَاقَ اللَّهُ يَتُوبُ عَلَيْهِ۔

(محارب)

إِلَّا الَّذِينَ قَاتَلُوا

ترجمہ ۱۔ مگر جو لوگ توبہ کر لیں۔

(۲) مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْعُدُوا عَلَيْهِمْ۔

ترجمہ ۱۔ گرفتاری سے پہلے۔

(۳) -----

(۳) فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
 ترجمہ :- تو سمجھ لو کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔
 قبول فرمائے گا۔ بیشک اللہ
 إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
 ترجمہ :- بڑا غفور و رحیم ہے۔

خوب غور سے دیکھئے۔ کیا سارق کے لئے ”فَمَنْ“ کا لفظ ٹھیک
 اسی طرح محل استثناء میں نہیں جس طرح محارب کے لئے ”إِلَّا“
 کا لفظ آرہا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اسی جگہ فَمَنْ کا لفظ ہے
 اور جہاں بھی ایک عام کلیہ بیان کرنے کے بعد ”فَمَنْ“ کا لفظ آیا
 ہے وہ محل استثناء ہی میں ہے۔ مُرْدَار، خون، لحم خنزیر، اور
 ماہل لغیر اللہ بہ کا حکم بیان کرنے کے بعد کسی جگہ یوں استثناء
 فرمایا ہے۔

فَمَنِ اضْطَرََّ غَيْرَ بَلَاغٍ وَلَا عَاجٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ۔

(۱۳۳)

ترجمہ :- پھر جو کوئی دلی خواہش اور زیادتی کے بغیر
 حالت اضطرار میں کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

کیا اس آیت کریمہ میں ”فَمَنْ“ بالکل اسی طرح محل استثناء
 میں نہیں ہے جس طرح آیت ذیل میں ”إِلَّا“ ہے۔

----- وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطَرُّتُمْ

(۱۳۴)

إِلَيْهِ۔

ترجمہ :- اور اللہ نے تمہارے لئے ان چیزوں کی تفصیل
 بیان کر دی ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں بجز اس کے جس
 کی طرف تم مجبور ہی ہو جاؤ۔

نیز صوم رمضان کا حکم دینے کے بعد :-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ (سورہ بقرہ ۱۸۳)

ترجمہ :- تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ

تم سے پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ

پیدا ہو جائے۔ یہ روزے چند گننے والوں کے ہیں۔

اس آیت میں ایک عام قانون بیان فرما کر اس کے بعد استثناء

آ رہا ہے :-

فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْهُ

اَيَّامًا اُخْرًا (سورہ بقرہ ۱۸۴)

ترجمہ :- توجو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ

دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر دے۔

اسی سلسلہ میں آگے ایک کلی حکم آ رہا ہے :-

وَعَلَى الَّذِينَ ذَلَّلُوا بِكُمُ طَعَامًا يُشْكِنُ

(سورہ بقرہ ۱۸۵)

ترجمہ :- اور جو لوگ بمشکل روزہ رکھ سکیں ان پر فدیہ

واجب ہے۔ یعنی وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

لیکن چونکہ یہ حکم لازم نہیں ہے اس لئے اس سے پورا استثناء

آ رہا ہے :-

فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهِ (سورہ بقرہ ۱۸۶)

ترجمہ :- بھر جو خوشی سے نیکی کرنا چاہے تو وہ اس کے لئے

بہتر ہے۔

کیا ان تمام آیات میں ”فَمَنْ“ کا لفظ ”إِلَّا“ کی طرح محمول استثناء میں نہیں ہے؟ ایسی بیسیوں مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ سب کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذوق سلیم خود رہنمائی کر دیتا ہے کہ یہ دو مختلف انداز بیان ہیں اور مقصد دونوں کا کوئی استثناء ہی ہوتا ہے۔ لہذا محارب ہو یا سارق، قابو پانے اور گرفتار ہونے سے پہلے پہلے توبہ اور اصلاح کا یقین دونوں کے لئے معافی کا سبب بن سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ چھوٹے مجرم (سارق) کے لئے اس کے امکانات بڑے مجرم (محارب، ڈاکو) کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔

بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ چور پر قابو پالینے، اسے گرفتار کر لینے، اقرار جرم کر لینے، مال مسروقہ کے برآمد ہو جانے کے بعد بھی اگر چوری کی واردات سفر میں، زمانہ قحط میں، اپنے آقا کے گھرمیں یا مال خمس میں ہوتی ہو تو تمام فقہاء متفقہ طور پر چور کو معافی دیدینے کے قائل ہیں۔ لیکن اگر یہ باتیں نہ ہوں البتہ قابو پانے اور گرفتار کئے جانے سے پہلے وہ توبہ کر لے۔ اس کی اصلاح ہونے کا یقین ہو جائے تو ڈاکو اور باغی کو تو معافی دی جاسکتی ہے مگر چور کو معافی نہیں دی جاسکتی۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ آیت سرقہ میں ”إِلَّا“ کا لفظ نہیں آیا بلکہ اسی معنی میں ”فَمَنْ“ کا لفظ آگیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان سزاؤں کا مقصد معاشرہ کی اصلاح ہے یا محض ہمت کٹواتے رہنا؟ خود ہی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ معمولی شبہات کو بھی اجرائے حدود سے بچنے کا بہانہ بنا لیا اور جہاں تک ممکن ہو مجرم کو اجرائے حد سے بچاؤ کیونکہ غلطی سے سزا کو معاف

کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ غلطی سے سزا دیدی جائے۔ لیکن ایک قوی اور معقول شبہ کے ہوتے ہوئے کہ تو بہ کے بعد بڑے مجرم کو معاف کیا جاسکتا ہے تو چھوٹے مجرم کو بطریق اولیٰ معاف کیا جانا چاہیے۔ ہمارے فقہائے کرام سارق کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ قاضی کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ مجرم اجراتے حد سے بچ جائے اور اگر سزا دینی ہی پڑے تو جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات، معاشرہ کے کوائف ساری باتوں کو نظر میں رکھ کر سزا دے، اور ہر جرم میں انتہائی سزا نہ دے البتہ جرم کی انتہائی شکل میں چور کا دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹ دیا جائے گا اور ہاتھ کو کاٹ کر پہلے زمانہ میں لوہے سے داغ دیا جاتا تھا۔ تاکہ خون بند ہو جائے ورنہ مجرم کی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مقصد مجرم کو سزا دینا ہے۔ جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ لیکن آج کل خون کو روکنے کے لئے داغ لگانے کی ضرورت نہیں میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ٹانگے لگا کر خون کو روکا جاسکتا ہے اس میں بہ نسبت داغ لگانے کے اذیت کم ہے۔ لہذا اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

جس شخص کا دایاں ہاتھ چوری میں کاٹا جا چکا ہے اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو فقہائے حجاز اور فقہائے عراق اس کے قائل ہیں کہ اب اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ بعض اصحاب ظاہر اور کچھ تابعین سے نقل کیا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ کے بعد بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے کیونکہ قرآن کریم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ پاؤں کاٹنے کا حکم نہیں

دیا۔ فقہائے حجاز و عراق اس پر اتفاق کرنے کے بعد کہ پہلی چوری میں
دایاں ہاتھ اور دوسری چوری میں بایاں پاؤں کاٹنے کے بعد تیسری مرتبہ
چوری کرنے میں امام سفیان ثوریؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب
کچھ نہیں کاٹا جائے گا۔ قاضی اُسے کوئی دوسری سزا دے اور جس کا
مال اس نے چربایا تھا اسے اس کا تاوان دلوائے۔ امام شافعیؒ اور
امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری کرنے میں بایاں ہاتھ اور
چوبھتی مرتبہ چوری کرنے میں حلیاں پاؤں کاٹا جائے گا۔

(برایۃ المجتہد ص ۲۵۲-۲۵۳)

ہمارے خیال میں اصحاب ظاہر اور بعض تابعین کا یہ قول
اقرب الی القرآن ہے کہ دوسری مرتبہ چوری کرنے پر چوبھ کا بایاں
ہاتھ کاٹنا چاہیے۔ بایاں پاؤں نہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم نے پاؤں
کاٹنے کا قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ لہذا پاؤں نہیں کاٹے جا سکتے
نیز قرآن کریم نے قَاتِلُوْا الَّذِیْنَ یُحَمِّمُوْنَ کَالْفِطْرِ اسْتَعْمَلْ فرمایا
ہے۔ پہلی چوری میں سارق اور سارقہ کے ہاتھ کاٹنے کے لئے یَاۤئِذَا
(ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دینے جائیں) فرمادینا کافی تھا۔ آئِذَا
(ان کے ہاتھ) جمع کے صیغہ کے ساتھ ارشاد فرمانے سے غالباً اسی
طرف اشارہ ہے کہ بعد میں بھی ہاتھ کاٹنے کا عمل نافذ ہو سکتا ہے
جمع کا اطلاق، تین اور تین سے زیادہ پر ہوتا ہے۔ لہذا دوسری
چوری میں بھی ہاتھ ہی کاٹنا چاہیے اور تیسری مرتبہ چوری کا جرم
ثابت ہو جانے پر امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا مذہب
قرآن سے قریب تر ہے کہ اب کچھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ ہاتھوں
کو کاٹنے کا حکم تھا اور دو مرتبہ چوریوں میں دونوں ہاتھ کاٹے

جا چکے ہیں۔ اب ہاتھ ہی نہیں رہے۔ پاؤں کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پاؤں کاٹنے کا حکم قرآن نے نہیں دیا۔ لیکن ویسے بھی بعض ایک دفعہ فریضہ کے بعد کہ دو مرتبہ چوری میں دونوں ہاتھ گنوا دینے کے بعد کوئی شخص تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی چوری کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اگر چوری کئی آدمیوں نے مل کر کی ہے تو ہاتھ کاٹنے کے لئے مسروقہ مال کی جو مقدار مقرر کی جائے۔ اگر ہر چور کے حصہ میں اتنا ہی مقدار آجائے جس پر ہاتھ کاٹے جاسکتے ہیں۔ تو سب کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ اور اگر ہر ایک کے حصہ میں اتنا مال نہیں آتا تو کسی کے بھی ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے۔ پھر ان کو کوڑے مار دیئے جائیں۔ ہم شروع میں یہاں چکے ہیں کہ مال مسروقہ کی وہ مقدار جس پر قطعید کی سزا دلی جائے گی اسلامی مملکت کی مجلس قانون ساز کو ملک کی اقتصادی حالات کے پیش نظر از سر نو متعین کرنی چاہیئے کیونکہ اب وہ اقتصادی حالات نہیں ہیں جو عہد رسالت مآب میں تھے۔ اس کے مطابق جو مقدار مقرر کی جائے اگر جماعت کی صورت میں کچھ لوگوں نے مل کر چوری کی ہے تو یہ دیکھنا

۱۹۵۷ء میں حج کے موقع پر حجاز کے ارباب اقتدار سے پوچھا تھا کہ سعودی گورنمنٹ کے قیام کے بعد سے کتنے چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں تو مجھے بتایا گیا تھا کہ تقریباً انیس سال کے عرصہ میں صرف تیرہ ہاتھ کاٹے گئے ہیں۔ اس سے قطعید کے اثرات کا اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

ہو گا کہ ہر فرد کے حصہ میں اتنا مال آتا ہے یا نہیں جس پر قطع ید کی سزا دی جانی چاہیے۔ اگر ہر فرد کے حصہ میں اتنی مقدار آجاتی ہے تو قطع ید کی سزا دی جاسکتی ہے ورنہ کوئی دوسری سزا دی جائے۔ اور قطع ید کی تعبیر بھی اس مال کی مقدار کے مطابق ہی طے کرنی چاہیے یعنی ہاتھ کی ایک انگلی کا ٹیپا، دو انگلیاں کا ٹیپا یا ہونچے سے ہاتھ کاٹا جائے۔ یہ مال کی مقدار کے مطابق طے کرنا ہوگا۔

شراب کی بوتلیں، خنزیر، اور تمام ناجائز اور حرام چیزیں چوری کر لینے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ شرعاً مال متقوم نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے نسخے، صلیب، شطرنج، نرد، چوسر، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کو بھی فقہاء نے مال متقوم نہیں مانا چنانچہ ان چیزوں کی چوری کر لینے میں وہ قطع ید کی اجازت نہیں دیتے مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ قرآن کریم نے ان کو کہیں حرام نہیں فرمایا کہ انہیں غیر متقوم قرار دیا جاسکے۔ یہ چیزیں غلط طور پر استعمال کرنے سے ناجائز ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کا جائز استعمال بھی تو ہو سکتا ہے۔ لہذا انہیں مال غیر متقوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایسے ادارات سے چوری کرنے میں جو عوام (پبلک) کی ملکیت ہوں مثلاً سرکاری بینک، ڈاکخانے، عدالتیں، ہسپتال وغیرہ سے چوری کرنے میں سرقہ کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ یہ تمام ادارے گو پبلک کی ملکیت ہیں اور چوری کرنے والا متخص خود بھی پبلک ہی کا ایک فرد ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ اس چیز کی ملکیت میں وہ خود بھی شریک ہے۔ لہذا اس نے کوئی ایسی چیز نہیں چرائی جو بالکل غیروں ہی کی ملکیت ہو، بلکہ اس نے ایسی چیز چرائی ہے جس میں

جزوی طور پر وہ خود بھی شریک ہے ، قانونی مویشی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ سوال یہ ہے کہ اسے عرف عام میں چوری کہتے ہیں یا نہیں۔ اس کی شناخت تو عام چوریوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا چوری میں رکھی گئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو چوری ہی کہا جاتا ہے۔ پبلک مقامات سے چوری کرنے کو کچھ اور نہیں کہا جاتا۔ رہی اس کی جزوی شرکت تو وہ انتہائی غیر اہم ہے جس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

اس سلسلہ میں ہمارے فقہاء نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں جن کا قرآن کریم کے فلسفہ سزا سے کوئی تعلق نہیں مثلاً یہ کہنا کہ تین آدمیوں نے مل کر چوری کی۔ ایک نے نقب لگایا۔ دوسرا مکان کے اندر گھسا اور تیسرے نے چوری کا سامان باہر سے پکڑا تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ جس نے نقب لگایا، اس نے چوری نہیں کی جس نے اندر گھس کر سامان باہر پکڑا یا اس نے نقب کردہ مکان سے یعنی ایک غیر محفوظ جگہ سے سامان اٹھایا ہے اور تیسرے شخص نے تو کچھ بھی نہیں کیا صرف سامان پکڑا ہے لہذا چوری کا جرم کسی پر بھی ثابت نہیں ہوا۔ محض قانونی مویشی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نقب لگا کر مکان کو غیر محفوظ بنانا بھی تو چوری کرنے ہی کے لئے تھا۔ اسے چوری کا جزو قرار نہ دینا کون سا قانون ہے ؟ ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ یہ قانون سزا

کو غیر موثر بنانے کی ترکیبیں ہیں جن سے خود قرآن اور اسلام بدنام ہوتے ہیں۔ ایسی سزاؤں سے کیا فائدہ جن پر عمل نہ کیا جاسکے۔

(باب قطع الطریق)

قطع طریق عربی زبان میں ڈاکہ زنی کو کہتے ہیں۔ یعنی ہتھیار کا استعمال کر کے۔ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے اموال چھین لینا چوری کرنے میں جیسا کہ ہم نے کتاب السرقہ میں بتایا ہے چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال لیا جاتا ہے لیکن قطع الطریق (ڈاکہ زنی) میں چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال نہیں لیا جاتا بلکہ علانیہ ڈرا دھمکا کر اسلحہ دکھا کر دوسروں کا مال لیا جاتا ہے۔ یہ جرم سرقہ سے زیادہ شدید ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔

۱۔ نَمَاجَزَاءُ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَيَمْعُونَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يَقْتُلُوا أَوْ يَكْلَبُوا
أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ
يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا
وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۴۴)

ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور

زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے یا انہیں سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں سرزمین اسلام سے شہر بدر کر دیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہوئی اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں الَّذِیْ مِنْ مَّحَادِ بُؤْنَ اللّٰہِ وَرَسُولِہٖ دَیْسَعُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا کا فقرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عربی زبان میں حَرْب کے اصل بنیادی معنی ویرانی، تباہی و بربادی، تلف، سلب و نہب کے آتے ہیں۔ (محیط المحیط) ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھیننے کے ہیں۔ یہ لفظ مِثْمَم (امن و صلح) کی ضد ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوا کرتا ہے۔ (کتاب الاشتقاق)

اسی وجہ سے حَرْب کے معنی لڑائی اور جنگ کے ہوتے ہیں حَادِبَہٗ اس نے اس سے جنگ کی۔ نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضَرَارًا وَكُفْرًا وَتَفَرُّجًا
بَيْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَارْصَادًا لِّلْبَیِّنِ حَارَبَ اللّٰہُ

وَرَسُولُهُ مِنْ قَبْلُ

(۲۹)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو باہم ضرر پہنچانے
کفر کرنے اور مؤمنوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان لوگوں کو
جو اللہ اور رسول کے خلاف سرکشی اختیار کرتے ہیں۔
تاک لگانے اور گھات میں بیٹھنے کا اڈہ بنانے کے لئے
پہلے سے ایک مسجد بنا ڈالی ہے۔

میں حادِ ب کے معنی سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں۔ لہذا
سورہ مائدہ کی آیت (۲۴) میں الَّذِينَ يَمْحَدُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا کے معنی صرف ڈاکہ ڈالنے ہی کے
نہیں ہیں بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع معنوں
کی حامل ہے۔ ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہمارے فقہاء نے قطع الطریق
کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم نے بھی سورۃ العنکبوت میں
قوم لوط کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے،

أَمْنَكُمْ لَتَأْتُونَ النِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ

(۲۹)

وَتَأْتُونَ فِي مَادٍ يَكْمُ الْمَكْرُ

ترجمہ: کیا تم (نفسانی خواہشات کے لئے) مردوں
کے پاس آتے ہو اور ڈاکہ ڈالتے ہو اور اپنی مجلس میں
ناروا باتیں کرتے ہو۔

چنانچہ اس آیت میں صرف ڈاکہ زنی کے لئے قطع سبیل کا
لفظ استعمال فرمایا ہے۔ بہر حال ڈاکہ ڈالنا حکومت کے قانون
کو طاقت کے ذریعہ سے توڑنا اور سرزمین اسلام میں فتنہ و فساد

پھیلا نا ہے جس میں ڈاکہ ڈالنا بھی شامل ہے لہذا اس کی وہی سزا ہے جو ایک باغی کی سزا ہوا کرتی ہے۔ اگر ایسے مجرموں کو اس سے پہلے کہ وہ کسی کا مال چھین سکیں یا کسی کو قتل کر سکیں گرفتار کر لیا گیا تو ان کو حکومت وقت اسلامی مملکت سے ملک بدر کر سکتی ہے خلفائے راشدین کے وقت میں ایسے مجرموں کو ملک بدر کر دینے کے بعد یہ سزا چونکہ ان کے ارتداد پر منتج ہوئی۔ لہذا خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورہ سے ایسے مجرموں کو بجائے ملک بدر کرانے کے قید کر دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ آج کے حالات میں بھی ملک بدر کر دینا ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ اگر اپنے ملک سے ان کو نکال دیا گیا تو وہ کہیں جائیں گے جبکہ پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں ہر ملک کی طرف سے عائد ہیں۔ لہذا اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ایسے مجرموں کو جیسا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کیا گیا تھا قید کر دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں جیلیں اور قید خانے جرائم کی تربیت گاہیں بن گئے ہیں اس لئے یا تو ان کی مناسب اصلاح کی جائے یا پھر بجائے جیل بھیجنے کے حکومت وقت کوڑوں کی سزا تجویز کرے۔ اگر ایسے لوگ دل سے توبہ کر لیں اور آئندہ ایسی حرکت کے اعادہ نہ کرنے کا یقین دلائیں اور حکومت کو اطمینان حاصل ہو جائے تو ان کو رہا کیا جاسکتا ہے۔

اگر ان ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال لے لیا ہے لیکن کسی کو قتل نہیں کیا۔ اور اتنا مال لیا ہے کہ ہر ایک ڈاکو کے حصہ میں اتنا مال آجاتا ہے جس پر حد جاری ہونی چاہیے (موجودہ حالات میں

حکومت وقت کو اس کی مقدار متعین کرنی ہوگی۔ دو، تین، یا دس درہموں پر محدود جاری نہ کر دینا آج کے حالات میں صحیح نہیں ہے) تو ایسے مجرموں کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دینے چاہئیں لیکن یاد رہے کہ یہ انتہائی سزائیں ہیں۔ جرم کی سنگینی اور حالات کے تقاضوں کے علاوہ تھوڑے سے گورٹ کو یہ سزائیں دینی چاہئیں۔ اگر ان ڈاکوؤں نے مال تو کچھ نہیں لیا البتہ کچھ لوگوں کو قتل کر دیا ہے تو ایسی صورت میں ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ قتل کرنا بطور قصاص کے نہیں ہے بلکہ بطور حد کے ہے۔ لہذا اگر مقتولین کے ورثہ معاف کرنا چاہیں تو معاف نہیں کر سکتے نہ ہی خوں بہا لے سکتے ہیں اس پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے اور اگر ڈاکوؤں نے مال بھی چھینا ہے اور قتل بھی کیا ہے تو حکومت کو اختیار ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ کر انہیں قتل کر دے۔ یا انہیں پھانسی دیدے۔ خواہ ان کو صرف قتل کر دے۔ خواہ ان کو صرف پھانسی دیدے۔ جرائم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے کورٹ مناسب فیصلہ کرے۔ امام محمدؒ کا ارشاد ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔

اگر پھانسی دی جائے تو شاہراہ عام پر ان کی لاش لٹکادی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو سکے۔ لیکن تین دن سے زیادہ لاش کو نہ لٹکایا جائے۔ کیونکہ تین دن کے بعد لاش گلنی سٹینی شروع ہو جاتی ہے جس سے لوگوں کو اذیت ہوتی ہے اور شہر کی ہوا

بھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ اَلَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ
 وَرُسُلَہٗ دَیْسَعُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَاَدَاکَ کے معنی صرف ڈاکہ
 ڈالنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے
 نہایت وسیع معانی کو حامل ہے۔ مثلاً مملکت اسلامی کے خلاف
 بغاوت کرنا، تخریب کاری کرنا، سول نافرمانی کرنا وغیرہ وغیرہ
 اس لئے ان پر ہم اپنے مقامات پر بحث کریں گے۔

(باب القصاص والجنايات)

الجنايات، جناية کی جمع ہے۔ جناية عربی زبان میں شرا انگیزی کو کہتے ہیں۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں خصوصیت کے ساتھ اس شرا انگیزی کو کہتے ہیں جس کا نشانہ انسانی جان یا انسانی اعضاء بنیں۔ یعنی کوئی شخص کسی کو قتل کر دے۔ اس کا کوئی عضو (مثلاً ہاتھ پاؤں) کاٹ دے یا دانت وغیرہ توڑ دے۔

میں چیزیں انسان کی عزیز ترین متاع کہلاتی ہیں۔ جان، مال، آبرو۔ اسلام جیسا کہ انسانی مال اور آبرو کو اہمیت دیتا ہے، ایسی طرح وہ انسانی جان کو بھی انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں ایک آدمی کو بھی قتل کر دینا پوری نوع انسانی کو قتل کر دینے کے مرادف ہے۔ کیونکہ جو آدمی کسی ایک انسان کو قتل کرتا ہے وہ انسانی خون کی حرمت کو پامال کرتا اور وہ مرحۃ الموتوں کو اس فعل شنیع کی جرأت دلانے کا سبب بنتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔

وَمَنْ أَجْلٌ ذَلِیْلٌ ۖ كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِیْلَ آتَةً

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ
فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا
فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵۰)

ترجمہ :- اسی وجہ سے توہم نے بنی اسرائیل پر (تورات میں) لکھ دیا تھا کہ جو کوئی کسی شخص کو بغیر کسی نفس (کے بدلے) کے یا زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کے قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جو کوئی کسی کو مرنے سے بچالے تو اس نے پوری نوع انسانی کو مرنے سے بچالیا۔

کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کے لئے ایک مثال قائم ہو جاتی ہے اور اس طرح انسانی خون کی عزت و حرمت ختم ہوتی ہے سورہ نسا میں ہے :-

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعِدِّيًا فَجَزَاؤُهُ كَجَزَاءِ
خَالِدٍ فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَهُ
وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ○ (۵۱)

ترجمہ :- اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے، اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اللہ اس پر لعنت فرمائے گا اور اللہ نے اس کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حق تعالیٰ نے اتنی اہمیت کسی جرم کو نہیں دی جتنی قتلِ عمد کے جرم کو دی ہے کہ اس کے لئے پوری پانچ سزائیں بیان فرمادی ہیں

(۱) اس کی سزا جہنم ہوگی۔ (۲) وہ جہنم میں ابد الابد تک رہے گا۔
 (۳) اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا۔ (۴) اس پر اللہ تعالیٰ
 کی لعنت اور پھٹکار برے گی۔ (۵) اور اللہ نے اس کے لئے
 بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ابدی جہنم کی سزا سوائے کافر اور قاتل عمد کے کسی کے لئے
 نہیں ہے۔ خود قرآن کریم نے اس سے پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ
 ایک مومن کا یہ کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی مسلمان کو عمدًا
 قتل کر دے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً۔

(۴۳)

ترجمہ :- اور کسی مومن کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کسی
 مومن آدمی کو قتل کر دے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے :-
 وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔

ترجمہ :- اور جس جان کو اللہ نے حرام قرار دیا
 ہے اسے قتل نہ کرو۔ البتہ حق کے ساتھ قتل کر سکتے ہو۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حجۃ الوداع میں
 ایک لاکھ تین سو تیس ہزار نفوس کو قتل کرنے سے منع فرمایا تھا۔
 لہذا اگرچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ حدیث صحیح ہے مگر اس میں
 اختلاف ہے کہ کیا اس میں شامل وہ بھی ہیں جو کفر یا فحشاء کے باعث قتل کیے گئے۔

رِقَابَ بَعْضٍ - (بخاری، مسلم، ابوداؤد، رزین
عن ابی بکرۃ بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۵۱ و طبرانی
عن کلثوم بن جبیر بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۹۳)
ترجمہ :- دیکھو، میرے بعد کافر ہو کر اسلام سے نہ
پھر جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔
نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-
سَبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ - (بخاری
مسلم، ترمذی، نسائی عن ابن مسعود بحوالہ جمع الفوائد
ص ۱۵۹)

ترجمہ :- کسی مؤمن کو گالیاں دینا فسق ہے اور کسی مؤمن
سے لڑنا کفر ہے۔

مذکورہ بالا آیت (۱۶۴) ہی میں ہے :-
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِعَوْلَتِهِمْ سُلْطٰنًا
فَلَا يُسْرَفُ فِي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنصُورًا ○ (۱۶۴)
ترجمہ :- اور جو مظلوم کر کے قتل کر دیا جائے تو ہم نے
اس کے وارث (ولی) کے لئے قانونی غلبہ رکھ دیا ہے۔ لہذا
وہ خود قتل کرنے میں کوئی زیادتی نہ کرے۔ بلاشبہ اس کی
مدد کی جائے گی۔

یعنی خود اسلامی حکومت کی یہ ڈیوٹی اور فریضہ ہو گا کہ وہ
قانونی کارروائی کر کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ لہذا
مقتول کے ورثہ کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر قاتل سے انتقام

لینے میں کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔ بلاشبہ ان کی پوری پوری مدد کی جائے گی۔ ہم نے یعنی اسلام نے مقتول کے ورثاء کا انتقام کا حق تسلیم کیا ہے (جَعَلْنَا لَكُمْ لِسُلْطَانًا) لہذا انہیں اس کا بدلہ ضرور دلوا یا جائے گا۔ انہیں از خود کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔

یہی مضمون سورۃ بقرہ میں بھی بیان فرمایا گیا ہے جہاں ارشاد فرمایا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى - (۲/۱۷۸)

ترجمہ:- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے سلسلہ میں بدلہ دلانا تم پر فرض کیا گیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مقتول سے بدلہ لینا مقتول کے ورثاء کی ذمہ داری قرار نہیں دی گئی۔ بلکہ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ یعنی پورے مسلم معاشرے کو جس کی نمائندہ اسلامی مملکت ہوتی ہے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ لہذا قتل کا جرم کسی فرد کے خلاف نہیں ہے کہ وہ قاتل سے بدلہ (یعنی قصاص) لیتا پھر یہ جرم اسلامی مملکت کے خلاف ہے۔ وہ خود اس کا انتقام لے گی۔ کیونکہ اس نے معاشرہ کے تمام افراد کے جان، مال، آبرو کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری قبول کی ہوتی ہے۔ لہذا مملکت کا فرض ہے کہ وہ خود اقدام کرے۔

سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اسے مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اگر انتقام کا اندیشہ ہوتا تھا تو اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ آگے چل کر جب اخلاقیات کا تصور پیدا ہوا تو قبیلہ سے باہر اور قبیلے کے اندر دونوں جگہ اس کی برائی تسلیم کر لی گئی۔۔۔۔۔ ملزم کی دولت مند ی اور تنگ دستی و فقر و فاقہ کی وجہ سے سزا میں فرق کیا جاتا تھا۔ پہلے اور دوسرے جرم میں بھی سزا کے اعتبار سے فرق کیا جاتا تھا۔ البتہ بعد کے جرائم میں قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ پہلی چوری میں ایذا دی جاتی تھی۔ دوسری چوری میں انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں اور تیسری چوری میں ہاتھ اور ہونٹ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اور چوتھی چوری میں جان سے مار ڈالتے تھے۔۔۔۔۔ بعض قبائل میں جھوٹی گواہی دینے پر زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ عام دستور تھا کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قصاص بالمثل کا رواج تھا۔ یعنی ہاتھ کے بدلے ہاتھ، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون رائج تھا۔“

یہودی قانون اور حمورابی کے قانون میں قصاص کی سزا دی جاتی تھی۔ بعض قبائل میں انتہائی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ صاحب اقتدار لوگ جو اپنے آپ کو خدا ہی سمجھتے تھے ایک حاکم

میں تو محض ہاتھ لگانے کی سزا بھی موت ہوا کرتی تھی۔ بعض قبائل میں زنا کے جرم میں مرد کو مقطوع کر دیتے تھے۔ اور عورت کے چہرہ کو عیب دار بنا دیتے تھے۔ اور بار بار زنا کے جرم میں عورت کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن عام طور سے مرد اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ چوری کی سزا عام قبائل میں قتل تھی۔ نیز شہر بدر کر دینا تھی۔۔۔۔۔ اگر کوئی چوری کرتا تھا اور اس کے پاس مال ہوتا تھا تو جس کی چوری کی گئی تھی اسے سارق کے مال سے دو گنا اور بعض مرتبہ دس گنا زیادہ تک دلوا یا جاتا تھا۔

حمورابی کے قانون میں قذف (تہمت لگانے) کی سزا بھی موت تھی۔ بغیر گواہوں کے چیز خریدنے کی سزا بھی موت تھی۔ کسی کے گھر میں جا کر چوری کرنے اور کسی کا بچہ اٹھا لینے کی سزا بھی موت تھی۔ قتل خطار (بلا ارادہ) میں دیت دی جاتی تھی۔ آزاد آدمی کی دیت نصف مانا چاندی۔ غلام اور باندی کے لئے ایک تہائی (۱/۳) مانا چاندی دی جاتی تھی۔ عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کی دیت برابر تھی۔ اگرچہ وہ باقی تمام معاملات میں مردوں اور عورتوں میں مساوات کے قائل نہیں تھے۔ لیکن دیت کے مسئلہ میں مساوات پر عمل کرتے تھے۔ ڈاکٹر یا حکیم کی بے احتیاطی کی وجہ سے کسی کی موت واقع ہو جاتی تھی تو ڈاکٹر یا حکیم کے ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ اگر ایک غلام کی آنکھ ضائع کر دی جاتی تھی تو اس کی

آدھی دیت دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں چوری کی سزا موت تھی۔ البتہ اگر ملازم نے سبزی چروالی یا گھر سے کھانے کی چیزیں چوری کر لیں تو ملازم کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔

چینی تہذیب میں قتل، زنا، چوری کے لئے مستقل قوانین نافذ تھے۔ کوڑے لگانے کی سزا بھی دی جاتی تھی جو بید سے دی جاتی تھی، چڑے کے کوڑے سے نہیں۔ بید مارنے میں وہ اس قدر ماہر ہوتے تھے کہ اگر چاہتے تو تین کوڑوں ہی میں مجرم کی کھال ادھیڑ دیتے تھے اور اگر چاہتے تو ہزار کوڑوں میں بھی جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ قتل، ڈاکہ، بغاوت، جعلی سکے بنانے، آگ لگانے کی سزا موت تھی۔ بارہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں سے زنا کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ نیز نمک اسمگل کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ سزا کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آدمی کو ایک پنجرے میں قید کر دیا کرتے تھے۔ صاحب عزت اور مقتدر لوگوں کو سخت سزائیں نہیں دی جاتی تھیں۔ عورتوں کو قید و بند کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ عورت اگر زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو شوہر کو اجازت تھی کہ اسے قتل کر دے۔

یونانیوں میں جرم کا تصور اللہ کی نافرمانی کا تھا۔ ان کے ہاں قتل کرنے کے جرم میں عاقبت کی سزا اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے گھر بار سے نکل جائے اور ملک بدر ہو جائے۔ البتہ اگر مقتول کے ورثہ دیت قبول کر لیں تو وہ اپنے گھر بار میں رہ سکتا تھا۔ یونانیوں میں دیت کا رواج

عام تھا۔ لیکن قتل خطا (بلا ارادہ قتل) میں سزا میں کمی اور تخفیف ہو سکتی تھی۔

یہودیوں میں قصاص تھا۔ دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون رائج تھا۔ قتل عمد اور قتل خطا میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔

ہندوؤں میں مشہور تھا کہ سزا اور قصاص سے زندگی بڑھتی ہے اور اگر سزا اور قصاص نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں گے۔ جرمانے زیادہ تر کئے جاتے تھے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کا رواج تھا۔ قذف (تہمت لگانے) کی سزا زبان کاٹ دینا تھی۔ البتہ برہمنوں کو سخت سزائیں نہیں دی جاسکتی تھیں۔

عرب میں قبل از اسلام جرم کو ایک قسم کی گندگی سمجھا جاتا تھا اور سزا سے صفائی ہو جاتی تھی۔ عربوں میں انتقام میں ایک کے بدلے کئی کئی آدمیوں کو مار ڈالنے کا دستور تھا اور دیت کا طریقہ بھی رائج تھا۔

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایٹھکس بانی جیمس ہیٹنگز جلد چہارم ”کراؤنڈ اینڈ پنشنمنٹ“ اسلام سے پہلے عربوں میں انتقام اور بدلہ لینے کی بڑی اہمیت تھی۔ تاریخ العرب قبل الاسلام میں ہے کہ:-

”اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں انتقام لینے کا تعلق ان کے عقیدہ سے تھا جو مقتول اور مقتول کے اہل و عیال سے متعلق تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں مقتول کی روح کو اس وقت تک قرار نہیں آتا تھا اور نہ اسے سکون حاصل ہو سکتا تھا جب تک اس کے خون کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ اس کی قبر پر (اس کی روح کا) ایک پرندہ برابر پھڑپھڑاتا رہتا تھا جو یہی پکارتا تھا ”میری پیاس بجھا دو! میری پیاس بجھا دو!“ اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیا جاتا اور قاتل کا یا قاتل کے خاندان کے کسی فرد کا قاتل کے بجائے خون نہ بہا لیا جاتا وہ بیتاب و بیقرار رہتا تھا۔ لہذا انتقام لینا محض عزت و شرف، حسب و نسب یا عرف اجتماعی کی بات ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس کا تعلق ان کے عقیدہ اور دینی رائے سے بھی تھا۔ مقتول کی روح برابر بے چین اور بے قرار رہتی تھی۔ لہذا جب قاتل یا اس کے اعضاء اور خاندان سے انتقام نہ لیا جاتے خود مقتول کے اعضاء اقرباء اور خاندان کی سلامتی کے لئے خطرہ رہتا تھا۔ اور اس ذہنی پریشانی سے نجات کے لئے ضروری تھا کہ ہر ممکن طریقہ سے ضرور ہی انتقام لیا جائے۔ لہذا وہ اس کے لئے ہر بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

رہ گئی دیت تو اگرچہ وہ وقتی طور پر مخالفت و عداوت کو روک دیتی تھی لیکن اس سے نہ تو خون دھل سکتا تھا اور نہ دلوں

کو سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ بلکہ دیت کو قبول کر لینا کمزوری اور
 مسکنت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ خون کا عوض مال نہیں ہو سکتا تھا
 اور نہ وہ دیت کے چند اونٹوں سے دھل سکتا تھا اس کے لئے
 تو خون ہی ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مقتول کے اعزاء دیت
 کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے اور خون کے سوا کسی بات
 پر راضی نہیں ہوتے تھے جب تک قاتل کا خون بھی اسی طرح
 نہ بہا لیا جائے جیسے مقتول کا خون بہا یا گیا تھا۔ اکثر مقتول
 اپنے گھردالوں اور اپنے خاندان کو قسم دے جاتے تھے کہ وہ
 اس کے خون کو ضرور دھوئیں اور دیت قبول کر کے کسی کوتاہی
 کا ثبوت نہ دیں خواہ اس کے لئے انہیں کتنے ہی طویل زمانہ
 تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔“

تاریخ العرب قبل الاسلام ص ۳۴۱ مطبع المجمع العلمی
 عراق مطبوعہ ۱۹۵۶ء

اسلام سے پہلے عربوں میں اگرچہ انتقام کی بڑی ہی اہمیت
 تھی تاہم خاص حالات میں دیت کا رواج بھی موجود تھا اور اس
 پر عمل بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ مصر کے مشہور مؤرخ جرّجی زیدان
 کہتے ہیں کہ۔

”د زخمی جب زخم سے مر جاتا تھا اور آزاد ہوتا تھا تو دیت
 نصف من چاندی ہوا کرتی تھی اور اگر وہ آزاد کردہ غلام ہوتا
 تھا تو ایک تہائی من چاندی دیت ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی طبیب
 کسی بیمار کا علاج کرتا اور اس کے ہاتھ پر اس کی موت ہو جاتی تو آ

وہ آزاد ہوتا تھا تو طبیب کو دس شواقل چاندی دینی پڑتی تھی اور اگر مریض آزاد کردہ غلام ہوتا تھا تو طبیب کو پانچ شواقل چاندی دینی پڑتی تھی اور اگر مریض غلام ہوتا تھا تو طبیب کو دو شواقل چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا۔ اگر کوئی کسی آزاد آدمی کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو بدلہ میں اس کی ہڈی بھی توڑ دی جاتی تھی۔ اور اگر آزاد شدہ غلام کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو توڑنے والے کو ایک من چاندی کا تاوان میں ادا کرنی پڑتی تھی اور اگر جس کی ہڈی توڑی گئی ہے وہ غلام ہوتا تو نصف من چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا (عربی میں من کے معنی وہ نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں ہوتے ہیں عربی میں من ایک سیر کو کہتے ہیں) باقی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ تورائے کے زمانہ میں یہودیوں میں بھی کچھ ایسا ہی قانون رائج تھا،

(العرب قبل الاسلام ج۲ ج۱ زیدان ص ۵۹ مطبوعہ دارالہلال قاہرہ)

دیت کے سلسلہ میں دائرۃ معارف اسلامیہ میں ہے کہ:

”آئین دیت کی تاریخی اصل زمانہ قبل اسلام کے رواجی دستور میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشری نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی۔ ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا۔ بلکہ کسی قبیلہ میں علیحدہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا جس میں کسی حد تک پنچایت کے فیصلے کو بھی دخل ہوتا تھا۔ قتل کی صورت میں شخصی طور پر بدلہ (شار) (رک قصاص)

لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے باختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیت لینا منظور کر لے۔ اس دیت کی مقدار اصولاً سوا اونٹ مقرر تھی۔ کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا۔ اگرچہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس قاعدے پر عمل کرنے میں قبیلے کے تمام افراد کا بالقوہ اور بالفعل قوی اتحاد کام کرتا تھا۔ سارا قبیلہ مجموعی طور پر دیت کے ادا کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی۔ قرآن مجید کی مختلف عبارتیں اس کی صراحت تصدیق کرتی ہیں۔ لیکن ان آیات میں بعض ترمیمات پائی جاتی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قتل خطا میں بھی دیت ادا کرنا واجب ہوگا۔

داردو دائرۃ معارف اسلامیہ ۵۲۴ تا ۵۲۸

مطہرۃ دانش گاہ لاہور

پہلے ساری تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اسلام سے پہلے مختلف اقوام میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں کیا قوانین نافذ تھے اور خود عربوں میں جہاں کوئی متحدہ حکومت قائم نہیں تھی بلکہ تمام قبیلتوں کے ماتحت ہی وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کیا رواج نافذ تھے۔ اسلام نے انہی روایات اور قوانین کو بنیاد بنا کر اپنے قوانین نافذ کیے تھے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چھٹے خطبہ میں اجتہاد کے سلسلہ پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ

رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ”لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان احادیث کو جن کی حیثیت متراسر قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے تعلق نہیں (یعنی فقہی اور غیر فقہی احادیث کو مترجم) پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہو گا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، یا جس میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی، کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا اکتشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم و رواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم و رواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، خواہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمالی اس پر کیا صحیح معرکہ ہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں، اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جاتے ہیں گے نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی

اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کار فرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقعہ پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں۔ (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہوں گے پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ الخ

(تشکیل جدید الہیات اسلامیہ خطبہ ششم ص ۲۶۵-۲۶۶)

ترجمہ سید نذیر نیازی مطبوعہ بزم اقبال۔ کلب روڈ۔ لاہور
علامہ اقبالؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہما کے اقتباس سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں ان کے بیان میں ذرا سا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جناب علامہ قرآن کریم کے بیان فرمودہ احکام اور قوانین کو بھی ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے واجب العمل نہیں سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سید نذیر نیازی مرحوم کو اسی بنا پر حاشیہ میں کہنا پڑا ہے:-

”یہاں شاہ صاحبؒ کی عبادت سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے، لہذا اس امر کی صراحت ناگزیر ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں تو یہی ”عالمگیر شریعت“ نازل ہوئی جس کی طرف شاہ صاحبؒ اشارہ فرما رہے ہیں۔ رہا اس کے اطلاق میں قوموں کے احوال و خصائص کا مسئلہ سو یہ قانون کا مسئلہ ہے، شریعت کا نہیں۔ قرآن پاک کا صاف و صریح ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَ
الَّذِي آوَحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ
وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا

فِيهِ۔ (۱۳۰) مترجم (حوالہ بالا)

بہمالا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تمام دنیا کے لئے ہے وہ صرف عربوں کے لئے نہیں ہے۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی زمانہ کی تخصیص نہیں کی جاسکتی وہ اللہ کا آخری پیغام ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا پیغام آنے والا نہیں ہے اس لئے اس کی ہدایات ابد الابد تک کے لئے ہیں۔ البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کو جو عملی جامہ پہنایا ہے وہ عربوں کے معاشری حالات اور ان کے احوال و ظروف کے مطابق ہی پہنایا ہے۔ ہر نئی الہی ہدایات کے مطابق بطور ترمیم کے کسی ایک قوم ہی کو تیار کرتا ہے تاکہ باقی اقوام کے لئے ان کے ذریعہ سے ہدایت کا سامان ہم پہنچائے تو ایک نبی کی یہ عملی تشکیل ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے صورتہ بھی لازمی

نہیں ہوتی۔ الہی ہدایات کی یہ عملی تشکیل مختلف اقوام و ملل اور مختلف زمانوں میں صورت مختلف ہو سکتی ہے جب کہ ان ہدایات الہیہ کی روح اور اسپرٹ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔

[تفصیل کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کی کتاب

”شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ“ ملاحظہ ہو]

صورت زیر بحث میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے قصاص کا حکم دیا ہے اور دیت کا حکم بھی دیا ہے لیکن دیت (خون بہا) کیا ہوگی اور کس مقدار میں ہوگی اسے قرآن کریم نے متعین نہیں فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جزئیہ کی عملی تشکیل عربوں کے معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر فرمائی اور سوانٹ دیت کے سلسلہ میں مقرر فرمادئے۔ کیونکہ عربوں میں اونٹ بکثرت ہوتے تھے اور یہی ان کے ہاں مال کی صورت تھی۔ لیکن دنیا کے ہر خطہ میں اونٹ نہیں ہوتے اور نہ وہ ہر علاقے میں مالی معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہذا ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس کے معاشرتی حالات کے اعتبار سے دیت کی شرح مقرر کرنی پڑے گی اور جو قوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تربیت سے تیار کی تھی وہ دوسری قوموں میں ان کے معاشرتی حالات کے مطابق ہی اس کی تعیین اس طرح کرے گی کہ قرآنی ہدایت کی روح اور اسپرٹ تو وہی رہے گو دوسری قوموں کے حالات و گوائف کے مطابق اس میں صورت تبدیلی ہو جائے جو قریب قریب ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہ

تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

دائرہ معارف اسلام میں ہے۔

”تاہم بہت عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ قانون مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لئے عملاً سازگار نہ رہا۔ معاشرہ ترقی کر کے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منظم ریاست کی صورت میں نمودار ہوئی۔ ان مخالفانہ مطالبات کے زیر اثر کام کرتے ہوئے ماہرین قانون نے دیت (اور ذاتی انصاف کے قانون (رک - قصاص) کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر مختلف میلانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً سنی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔“

دیت کی موجودہ صورت | موجودہ زمانہ میں دیت کا نظام دو خاص شکلوں میں مقامی حالات کے مطابق باقی نظر آتا ہے۔

بدوی قبائل میں جو بالطبع ہر نظام حکومت سے دلی مخالفت رکھتے ہیں ذاتی انتقام کا طریقہ ابھی تک جاری ہے جس کے ساتھ ساتھ دیت سے بھی حسب موقع کام لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد چند خصوصیات کے لحاظ سے ایسے رسم و رواج پر ہے جو قدم عرب کے رسم و رواج سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ ہر قبیلے میں اس کی صورت الگ الگ ہے۔

متعلقہ حکومتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں کہ ان

جماعتوں کے طریق عمل پر چند پابندیاں عائد کر دیں جن کا دائرہ اثر بھی محدود ہے۔

چنانچہ مصر، اردن اور شام میں یہ رسم تقریباً عام ہے کہ قتل عمد کے سوا ہر صورت میں دیت واجب ہے۔ دیت کے اجزائے ترکیبی میں قبیلے قبیلے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ صرف چالیس تر اوٹ یا چالیس تراوٹ اور ایک دوشیزہ لڑکی یا نذر روپیہ (مثلاً مصر میں ۴۰۰ مصری پونڈ یا ۳۰۰ مصری پونڈ یا ۱۰۰ مصری پونڈ وغیرہ) عورت کی دیت مرد کی دیت سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض قبائل میں اس کی مقدار مرد کی دیت سے چار گنا یا آٹھ گنا تک زیادہ ہوتی ہے۔ اثبات جرم کے لئے آگ یا پانی سے گزرنے کا امتحان اکثر عمل میں آتا ہے۔ بعض قبائل میں عمل قسامت بھی دیکھا جاتا ہے۔

زیادہ ترقی یافتہ اور سیاسی حیثیت سے زیادہ منظم قوموں میں دیت دراصل اس لئے باقی رہی کہ اس کی نوعیت مذہبی حکم کی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مخصوص مثال حکومت عثمانیہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہاں انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب زمانہ حال کے مطابق قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور نقصان رسیدہ کے معاوضے کا قانون (معاوضے کے صحیح معنوں کے لحاظ سے) نافذ کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے مطابق قانون عامہ باقاعدہ معمول بہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اہل مقدمہ کے قصاص کا اور آگے چل کر دیت کے مطالبہ کا حق باقی رکھا گیا۔ خاص طور پر

۸۶۳ھ کے قانون تعزیرات میں سرکاری طور پر دیت کی مقدار دو سو چوبیس تر کی پونڈ معین کی گئی تھی۔

اب عملی طور پر یہ سب باتیں، دستور سازی سے غائب ہو چکی ہیں۔ لیکن پہلے حالات کے آثار جن کا مٹنا سخت مشکل ہے ابھی تک باقی ہیں۔ بعض مالک جیسے شام میں عدالتیں اگرچہ قانون کی ظاہر و باطن پابند ہیں اور دیوانی اور فوجداری قوانین زمانہ حال کے تقاضے کے مطابق ۱۹۴۹ء سے جاری ہیں۔ پھر بھی وہ دیات ادا کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جس کی مقدار قتل انسان کی صورت میں یکمشت رقم ہوتی ہے اور اس کی کمی بیشی قتل عمد یا قتل خطا کے لحاظ سے معین کی جاتی ہے۔

(اردو دائرۃ معارف اسلامیہ جلد نہم ص ۵۲۲ تا ۵۲۸)

مطبوعہ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور

قصاص اور دیت کے اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم قرآن کریم کی فقہی جزئیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

(القصاص)

قصاص کا مادہ قصص (ق ص ص) ہے۔ اس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں۔ کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ (تاج العروس) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کرنے کے ہیں۔ سورہ کہف میں ہے،

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّ اَعْلٰى اَثَارِهِمَا قَصَصًا ۝ (۱۸)

ترجمہ: موسیٰ نے کہا: اسی کو تو ہم تلاش کر رہے تھے چنانچہ دونوں اپنے نشاناتِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے واپس لوٹے۔

سورہ قصص میں ہے،

وَقَالَتْ لِاُخْتِهِ قُصِّیْهِ فَبَصَّرَتْ بِهٖ ۚ عَنْ جَنۢبٍ وَهُمۡ لَا يَشْعُرُوۡنَ ۝ (۲۸)

ترجمہ: ام موسیٰ نے موسیٰ کی بہن سے کہا: اس کے

پیچھے پیچھے جاؤ، چنانچہ وہ کنارہ سے اسے دیکھتی ہوتی پلٹی
رہی اور فرعون کے لوگوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

قَصُّ عَلَيْهِ الْخَبْرَ قَصًّا۔ اسے وہ خبر بتادی، اس پر
اسے مطلع کر دیا۔ چونکہ واقعہ کے متعلق اس کے وقوع پذیر
ہونے کے بعد ہی بتایا جاتا ہے اس لئے اس میں پیچھے چلنے
کے معنی پاتے جاتے ہیں۔ سورۃ یوسف میں ہے۔
فَخَصَّ بِهَا مِثْلَ نَضُفَتَيْ يَوْمَئِذٍ (۱۳)

ترجمہ: اے پیغمبرا ہم آپ سے بہترین قصہ بیان
کرتے ہیں۔

چنانچہ الْقَصَّةُ معاملہ، خبر اور واقعہ کو کہتے ہیں جو وقوع
پذیر ہو چکا ہے اور اس کے بعد ہی لوگوں سے بیان کیا جائے
گا۔ قَصُّ الشَّعْرِ اس نے بال کاٹے۔ اَلْقَصَصُ قِیَمٰی کو کہتے
ہیں جس سے بال کاٹے جاتیں۔ بال کاٹنا بھی بال پیسا ہو جانے
کے بعد ہی عمل میں آتا ہے۔ اگر کسی کے بال ہی نہ ہوں تو کیا کاٹا
جائے گا۔ اَلْقِصَاصُ مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے
جرم کی سزا مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا۔
قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔ اس کی تلاش اور جستجو
کرنا۔ راغب نے اس کے معنی خون کے پیچھے خون بہا (مالی بدلہ
دیت) کا آنا کئے ہیں۔ (مفردات) قرآن کریم نے اس لفظ کو
خصوصیت کے ساتھ جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال
کیا ہے۔ اس میں خون کے بدلے خون اور خون کے بدلے دیت

دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ان معنوں کے لحاظ سے قصاص کا لفظ جرم قتل کی سزا کے لئے ہوگا۔ خواہ وہ موت کی سزا ہو یا بدت ہو۔ پھر کثرت استعمال سے اس کے معنی جرم کے بدلے کے لئے جانے لگے۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں آئی ہے۔
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَكُنْ عَلَيْكُمْ الْقُصَاصُ
 فِي الْقَتْلَى (۱۷۸)

ترجمہ: اے پیروان دعوت ایمانی! مقتولین کے بارے میں تم پر قاتل کا پیچھا کرنا یا قتل کا بدلہ لینا اور سزا دینا فرض کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثہ اور اولیاء کو نہیں فرمایا گیا ہے، بلکہ خطاب جماعت مؤمنین کو یعنی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل کا پیچھا کرے اس کی تلاش اور جستجو کرے اور اسے اس کے جرم کی سزا دے۔ جس کو تکلیف اور اذیت پہنچانی گئی ہے اسے اس کا بدلہ دلایا جائے۔ مجرم کو پونہچانہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی انسان کو قتل کر کے یا اسے اذیت پہنچا کر دندنا تا پھرے اور اپنے کمر توڑ کی سہارا بنا سکے قصاص کے معنی ہمارے ہاں عام طور پر صرف سزائے موت کے کر دیئے جاتے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے۔ قصاص کے معنی قتل کے مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا اور اس کی

تلاش و جستجو کرنا ہیں تاکہ اسے اس کے جرم کی سزا دی جاسکے
صرف سزائے موت کے نہیں ہیں۔ وہ سزائے موت بھی ہو سکتی
ہے، سزائے دیت بھی ہو سکتی ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان
کے بدلے کان، ناک بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت کی
سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسلام سے پہلے دنیا بھر میں یہ رواج تھا کہ قتل کے مجرم
سے انتقام لینا مقتول کے ورثاء اور اس کے خاندان کی ذمہ داری
سمجھی جاتی تھی۔ یعنی وہ خود مجرم کا پیچھا کریں، اس کو تلاش کریں
اور اس سے انتقام لیں۔ اس دور میں عموماً منظم حکومتیں نہیں
تھیں۔ زیادہ تر قبائلی نظام رائج تھا۔ جہاں کسی درجہ میں منظم
حکومتیں قائم بھی تھیں وہاں بھی وہ اپنی ابتدائی شکل میں تھیں
لیکن عرب میں تو ابتدائی شکل میں بھی منظم حکومت کا کوئی وجود
نہیں تھا۔ لہذا اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ اس قسم کی جنایات
کی سزا کی ذمہ داری حکومت کی قرار دی جائے۔ چنانچہ مقتول
کے ورثاء اور اولیاء خود ہی قاتل کو تلاش کرتے اور اس سے
انتقام لیتے تھے۔ اجتماعی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے افسردہ
کے لئے یہ کام آسان نہیں تھا کہ وہ اصل مجرم کو تلاش کر لیں اور
اسی سے انتقام لیں۔ لہذا اس سلسلہ میں بڑی زیادتیاں ہوتی
تھیں۔ معصی قاتل نہ مل سکے تو قاتل کے خاندان کے کسی بھی
آدمی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ نیز اگر مقتول کا خاندان متمول اور
طاقتور ہوتا تھا تو ایک آدمی کے بدلے ایک ہی آدمی کو قتل نہیں

کرتے تھے بلکہ ایک آدمی کے بدلے دس دس آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اگر مقتول غلام یا عورت ہوتی تھی تو چونکہ مقتول طاقتور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کے بدلے میں قاتل کے خاندان سے آزاد آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ رواج عزت، حسب و نسب اور عزت اجتماعی کی وجہ سے ہی نہیں تھا بلکہ یہ ان کے عقیدہ اور دینی و مذہبی رائے کی وجہ سے بھی تھا۔ تاریخ العرب قبل الاسلام کا اقتباس اس سلسلہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

چونکہ عربوں میں مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کر دینا ضروری نہیں تھا بلکہ قاتل کے گھریا خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا اس لئے قرآن کریم نے مذکورہ بالا آیت (۲۸۱) میں ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ یہ رواج غلط ہے۔ مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کیا جانا چاہیے۔ اس کے گھریا خاندان کے کسی دوسرے آدمی کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ جس نے جرم کیا ہے اسی کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

أَلْحَسْرَةُ لِلَّذِينَ ظَنُّوا أَنَّهُمْ بِمِلَّةِ رَبِّهِمْ يَكُونُونَ خَالِدِينَ

(۲۸۱)

ترجمہ: آزاد قاتل کی جگہ اسی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔
قاتل غلام کی جگہ اسی غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل عورت کی جگہ اسی عورت کو قتل کیا جائے گا۔

چنانچہ شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ: ”اور حق تعالیٰ کا ارشاد اَلْحَيُّ يَمْوِي الْحَيَّةَ اسی کا بیان ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور اسی کی تاکید ہے حق تعالیٰ نے اس میں اس حال کو بیان فرمایا ہے جس کے لئے یہ کلام صادر ہوا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو شعبیؒ اور قتادہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ عرب کے دو خاندانوں میں جنگ چلتی آرہی تھی۔ ان میں ایک خاندان کو دوسرے خاندان پر برتری حاصل تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اس کے بغیر راضی نہیں ہو سکتے کہ اپنے ایک غلام کے بدلے میں تمہارے آزاد آدمی کو اور اپنی عورت کے بدلے تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔ تو حق تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے یہ حکم نازل فرمایا کہ — مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص (بدلہ) فرض کیا گیا ہے آزاد کی جگہ وہی آزاد اور غلام کی جگہ وہی غلام قتل کیا جائے گا (جس نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا ہے) — اس سے اس کا ابطال کیا گیا ہے جو وہ چاہتے تھے اور ان کو تاکید کی گئی ہے کہ قصاص کی فرضیت قاتل ہی پر ہے کسی دوسرے پر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیر قاتل کو قتل کر دیتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرمادیا ہے اسی مضمون کی وہ روایت بھی ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ — اللہ کے

نزدیک قیامت کے دن ظالم ترین شخص تین آدمی ہوں
 گے۔ (۱) وہ آدمی جو قاتل کے بجائے کسی دوسرے
 آدمی کو قتل کر دے (۲) وہ آدمی جو حرم میں کسی کو
 قتل کر دے اور (۳) وہ آدمی جو عہد جاہلیت کا انتقام
 وصول کرے الخ

احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۵۱ مطبوعہ

المطبعة البہیة المصریة ۱۳۲۷ھ

اسلام نے عرب میں پہلی مرتبہ ایک منظم حکومت قائم فرمائی
 اور قبائلی نظام حکومت کو ختم کیا۔ اور اس طرح قانونی فرماں برداری
 کی بنیاد رکھی۔ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثاء کو
 نہیں فرمایا گیا بلکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو خطاب فرمایا
 گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ
 فِي الْقَتْلَى - (۱۷۸)

ترجمہ :- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے
 بارے میں قصاص (قاتل کی تلاش، جستجو، پیروی اور
 اس سے بدلہ لینا) تم پر (تمہاری ہیئت اجتماعیہ پر) فرض
 کیا گیا ہے۔

یعنی قتل کا جرم کسی فرد کے خلاف نہیں ہے کہ وہ مجرم کا
 پیچھا کرے اور اگر اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ مجرم کو پکڑ کر اس
 سے انتقام لے سکتا ہو تو اس سے بدلہ لے لے۔ اور اگر مجرم کوئی

بڑا آدمی ہو جس پر مقتول کے ورثہ کو دسترس نہ ہو سکے تو وہ صبر کر کے بیٹھ رہیں بلکہ یہ جرم مسلمانوں کی پوری ہیئت اجتماعیہ اور اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے۔ لہذا معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کرے اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے۔ پورے معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل سے مقتول کا بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ قتل عمد کی صورت میں قتل اور قتل خطا کی صورت میں خوں بہا وصول کرے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جرم قابل دست اندازی پولیس ہے۔ اس میں مستغیث مقتول کے ورثہ نہیں بلکہ خود اسلامی حکومت ہوتی (CROWN VS-) ہے۔ ورثہ جرم کے شاہد ہو سکتے ہیں مستغیث نہیں ہوں گے۔

جو چیز کسی پر فرض کی جاتی ہے اس کی ادائیگی وہی کرتا ہے جس پر وہ فرض کی گئی ہے: کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶) کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقَصِيَّةُ (۲/۲۱۸) کی وجہ سے صیام، قتال اور وصیت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ لہذا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۲۱۷) کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ قصاص تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اگر قصاص کے معنی صرف سزائے موت کے لئے جائیں تو ظاہر ہے تمام مسلمانوں پر سزائے موت تو فرض نہیں ہے۔ سزائے موت تو قتل عمد کے مجرم ہی پر فرض ہے مگر یہاں اس کی فرضیت تمام مسلمانوں پر فرمائی گئی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ قصاص کے

معنی سزائے موت کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی قاتلوں کو تلاش کرنے۔ ان کی جستجو کرنے، ان کا تعاقب کرنے، انہیں کیفر کردار تک پہنچانے، اور ان سے مقتول کا بدلہ وصول کرنے کے ہیں، کیونکہ یہی چیزیں تمام مسلمانوں پر فرض ہو سکتی ہیں اور فرض ہیں۔ سزائے موت تو تمام مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطا۔ قتل عمد یہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر کسی کو بالارادہ قتل کر دے اس کی سزا، سزائے موت ہے اور قتل خطا یہ ہے کہ غلطی سے کوئی آدمی کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جائے مثلاً کسی نے ایک ہرن پر گولی چلائی اور وہ غلطی سے کسی انسان کو لگ گئی۔ اس صورت میں قاتل کو خون بہا یعنی دیت دینی لازم ہے۔

(قتل عمد)

قتل عمد یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے آدمی کو کسی ہتھیار سے یا کسی ایسے طریقے سے قتل کر دے جس سے عموماً قتل کیا جاتا ہو تو اسے قتل عمد کہا جائے گا کسی کو خاصے بڑے پتھر سے مار ڈالنا یا آگ سے جلا دینا بھی قتل عمد میں شامل ہے غرضیکہ کسی ایسے طریقے سے کسی کی جان لے لینا جس سے عام طور پر قتل کا کام لیا جاتا ہو قتل عمد کہلائے گا خواہ کسی آلہ کے ذریعہ سے ہو یا بغیر آلہ کے مثلاً زہر پلا دینا یا گلا گھونٹ دینا یا جھڑکرا

سے ایسی ضرب لگانا۔ یا پانی میں ڈبو دینا وغیرہ جس سے دوسرے کی موت واقع ہو جائے۔

قتل عمد کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً
(۴/۹۳)

ترجمہ :- اور مؤمن کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کر دے (۴/۹۳) کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔
اس سے آگے ہے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ جَهَنَّمَ
خَالِدًا فِيهَا وَكَغَضَبِ اللَّهِ عَلَيْهِ وَكَعَذَابٍ
لَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ (۴/۹۴)

ترجمہ :- اور جو کوئی کسی مؤمن کو جان بوجہ قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب اس پر نازل ہوگا اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار اس پر برے گی اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اسی سلسلہ میں سورۃ مائدہ میں ہے۔
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ
بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْحَ بِالْجُرْحِ وَالَّذِينَ تَبَدَّلُوا
بَيْعَهُمْ فَهُمْ كَمَا تَبَدَّلُوا لَهُمْ وَمَنْ لَمْ يَجِدْكُمْ بِمَا اتَّخَذَ

اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُظْلِمُونَ ○ (۵۸)

ترجمہ ۱۔ اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت کی سزا دی جائے اور زخموں کا بھی بدلہ ہو۔ تو جو کوئی معاف کر دے تو اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو وہی لوگ تو ظالم ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اگرچہ جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ بنی اسرائیل کے لئے ہیں لیکن چونکہ ان احکام کی جہد ملی یا نسخ کو نہ قرآن کریم نے بیان کیا اور نہ سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اس لئے یہ احکام ہمارے لئے بھی ایسے ہی واجب العمل ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے واجب العمل تھے کیونکہ شرائع من قبلنا ہمارے لئے بھی ایسے ہی حجت ہوتی ہیں جیسا کہ وہ گذشتہ ام کے لئے حجت ہوتے تھے بجز اس صورت کے کہ قرآن کریم نے یا سنت نبوی نے ان کو تبدیل نہ کر دیا ہو۔ لہذا جو شخص کسی مسلمان کو جو محفوظ الدم ہو عمدًا قتل کر دے اس کو مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

آزاد آدمی غلام کے بدلے میں | اسی طرح اگر کوئی شخص جو آزاد ہو کسی غلام کو قتل کر دے تو اس غلام کے بدلے میں اس آزاد آدمی کو قتل

کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور غلام اور آزاد میں مساوات موجود نہیں ہے۔ حنفیہؒ کا خیال ہے کہ قصاص میں جیسا کہ آزاد آدمی مَعْصُومُ الدَّمِ ہوتا ہے ایسے ہی غلام بھی معصوم الدم ہوتا ہے۔ عصمت دم جیسا کہ دین سے حاصل ہوتی ہے ایسے ہی دار سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ آزاد آدمی اسلامی مملکت (دار الاسلام) کا باشندہ ہے ایسے ہی غلام بھی اسلامی مملکت کا باشندہ ہے۔ لہذا وہ بھی معصوم الدم ہے۔ خون کی عصمت میں دونوں برابر ہیں۔ لہذا مساوات قائم ہے۔ لہذا قصاص نہ لینے کی کوئی منعقول وجہ نہیں ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ حنفیہؒ ملہم اللہ تعالیٰ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (جان کے بدلے جان) فرمایا ہے اور انسانی جان جیسے آزاد آدمی میں ہے ایسے ہی غلام میں بھی ہے۔ لہذا آزاد اور غلام میں فرق و امتیاز نہیں برتا جاسکتا۔

ذمی کے بدلے میں مسلم | اگر ایک اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی غیر مسلم (ذمی) کو قتل کر دے تو امام شافعیؒ کے نزدیک غیر مسلم کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا خیال یہی ہے کہ چونکہ دونوں میں مساوات نہیں ہے۔ ایک مسلمان ہے

اور دوسرا کافر۔ مسلمان اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔ لہذا قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرات حنفیہؒ کا خیال یہاں بھی وہی ہے کہ چونکہ دونوں اسلامی مملکت (دارالاسلام) کے باشندے ہیں۔ لہذا عصمت دار دونوں کو حاصل ہے اور غیر مسلم کی حفاظت وصیانت کا حکومت نے عہد کیا ہوا ہے۔ لہذا اس کی جان کی حفاظت بھی حکومت کا فریضہ ہے۔ لہذا دونوں میں قصاص ہونا چاہیے۔ قرآن کی رو سے ہم فقہائے حنفیہؒ کی تائید کریں گے۔ ہماری دلیل وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کر دی ہے۔ کہ قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے (یعنی جان کے بدلے جان) انسانی جان جیسی ایک مسلمان میں ہوتی ہے۔ غیر مسلم میں بھی ہوتی ہے۔ لہذا مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ امام شافعیؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ ۔

لَا يُمْتَلَكُ مَوْمِنٌ يَكْفِرُ۔

ترجمہ :- کوئی مومن کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔

اس ارشاد کو امام بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابوداؤد وابن ماجہ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو سے اور بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حنفیہؒ نے ارشاد قرآنی کے ساتھ

(ملاحظہ ہو جصاص) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال فرمایا ہے جسے دارقطنی، بیہقی، امام محمدؒ امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذمی اور معاہد کے بدلے میں مسلمان کو قتل فرمایا تھا۔ اور ارشاد فرمایا تھا کہ :-

أَنَا أَحَقُّ وَأَوْلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِذِمَّتِهِ۔

ترجمہ :- میں اس کا زیادہ حق دار اور اقرب ہوں کہ اپنے عہد اور ذمہ داری کو وفا کروں۔

ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کریم سے قریب تر ہے۔ رہ گئی پچھلی حدیث تو وہ بھی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مؤمن ایسے کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا جو عربی اور غیر معاہد ہو۔

(مذکورہ بالا احادیث کے لئے اللہ ربہ تعالیٰ تخریج احادیث

الہدایہ ص ۵۶۴ بر حاشیہ ہدایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی

اور اعلام السنن ص ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس

فریئر روڈ کراچی ملاحظہ فرمائیے۔)

مستأمن کے بدلے میں | اگر کوئی غیر مسلم امان لے کر اسلامی مملکت میں آیا ہو

اور اسے کوئی مسلمان قتل کر دے تو فقہائے حنفیہ بھی اس کے قاتل ہیں کہ اس کے بدلے میں مسلمان قاتل کو قصاص میں قتل نہیں

کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یہ دلیل دی ہے کہ امن حاصل کر کے آنے والا غیر مسلم مستقل طور پر یا ابدی طور پر محفوظ الدم نہیں ہے۔ لہذا اُسے کوئی مسلمان یا ذمی اگر قتل کر دے تو اس میں قاتل کو سزائے موت نہیں دی جاسکتی قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ :-

وَاِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاجْوِهْ
حَتّٰى يَسْمَعَ كَلِمَةَ اللّٰهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَا مَنَعَهُ
ذٰلِكَ بِمَا نَحْنُ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۹)

ترجمہ :- اگر مشرکین میں سے آپ سے کوئی پناہ مانگے تو آپ اسے پناہ دے دیجئے، حتیٰ کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن (حفاظت) کی جگہ تک پہنچا دیجئے۔ یہ حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی مشرک بھی تم سے امان طلب کرے اور تم اسے دینا مناسب سمجھو تو ضرور امان دو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایسے محفوظ مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اگلی آیتوں میں مشرکین ہی کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان سے تو کوئی معاہدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو وہ نہ تو تمہارے کسی رشتہ کا لحاظ کریں گے نہ کسی معاہدہ کا۔ ایسے

لوگوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے کہ اگر وہ امان یا پناہ مانگیں اور تم مناسب سمجھو تو انہیں امان دیا جائے اور ان کی پوری حفاظت کی جائے اور ان کو ان کے محفوظ و مامون مقام تک پہنچایا جائے۔ لہذا یہ کہنا کہ وہ مستقل طور پر محفوظ الدم نہیں ہیں۔ اس لئے اگر کوئی انہیں قتل کر دے اور قتل کرنے والا مسلمان یا ذمی ہو تو قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا قرآن کے خلاف ہے۔ حضرات فقہائے کرام کے زمانے میں جو حالات ہوں سو ہوں مگر موجودہ حالات میں ویزالے کر جو غیر مسلم ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی حکومتوں کو ہماری مملکت تسلیم کرتی ہے۔ اور ان سے ہمارے معاہدے ہیں جن کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ جن حکومتوں کو ہم تسلیم نہیں کرتے مثلاً اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومتیں ان کے لوگ ویزالے کر بھی ہمارے ملک میں نہیں آسکتے۔ وہ اس ضمن میں آتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے محولہ بالا آیت میں حکم دیا ہے کہ اگر وہ بھی امان حاصل کرنا چاہیں تو انہیں امان دے سکتے ہو، ان کی حفاظت کی جائے اور کلام اللہ کو سننے کے بعد انہیں ان کے محفوظ مقام تک پہنچایا جائے۔ باقی تمام مستامن (ویزالے کر آنے والے) معاہدہ ہیں اور ان کے متعلق قرآن کریم کا صریح ارشاد ہے کہ:

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رُسُلِهِ إِلَّا الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ عَهْدَهُ ثُمَّ يَتَّبِعُونَ الْفِتْنَةَ

الْحَرَامَۃَ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَعْتِمُوا
لَهُمْ دَانَ اللّٰهُ يَحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ كَيْفَ وَاَنْ
يُظْهِرُوا عَلَيْنَكُمْ لَا يَنْفَعُوكُمْ اِلَّا اَنْ لَا
ذِمَّةٌ يَرْصُقُكُمْ بِاَنْفُسِهِمْ وَتَاَجَلِ
قُلُوبُهُمْ ۝ وَآكَلْتُمْ مِمَّا فِىْ سِقْوَةِ ۝ (سورہ
ترجمہ: مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے
نزدیک کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جن
سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر لیا تھا۔ تو جب تک
وہ تمہارے لئے معاہدہ کی پابندی کریں تم بھی ان کے لئے
معاہدہ کی پابندی کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ (عہد شکنی سے)
پرہیز کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (ان سے جدید
معاہدے کیسے ہو سکتے ہیں، اور وہ اگر تم پر غالب
آجائیں تو تمہارے بارے میں وہ نہ کسی رشتہ داری کا
محافظ کریں گے اور نہ کسی معاہدہ کا۔ وہ اپنے منہ سے
(نکلی ہوئی باتوں سے) تمہیں خوش کرتے ہیں لیکن ان
کے دل ان کی باتوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور ان میں سے
اکثر فاسق ہی ہیں۔

سورۃ توبہ کی یہ آیات مشرکین عرب کے متعلق ہیں جن
کے متعلق تمام فقہاء بالاتفاق اس کے قائل ہیں کہ ان سے کسی
قسم کا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ ان سے یا تو اسلام قبول کیا جاسکتا
ہے یا وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ان کو ذمی بنا کر نہیں رکھا جاسکتا

لیکن ان کے متعلق بھی حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ پناہ طلب کریں اور تم انہیں پناہ دیدو تو ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ حتیٰ کہ کلام الہی سنانے کے بعد انہیں ان کے محفوظ و مامون مقام تک پہنچا دینا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ عرب کے سوا دوسرے نو مسلموں کے لئے بھی بدرجہ اولیٰ اس کی پابندی ضروری ہوگی۔ ویسے عالم جنگ میں بھی کوئی مسلمان اگر کسی کافر کو پناہ دیدے تو اس امان کا احترام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جسے کسی مسلمان نے پناہ دیدی ہو، پناہ دینے والا مرد ہو یا عورت ہو یا غلام ہو، اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ اگر کوئی عورت بھی مسلمانوں کی طرف سے کسی کافر کو پناہ دیدے تو یہ پناہ دینا جائز ہوگا۔ یعنی اس کی پابندی سب کو لازم ہوگی۔

(بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۱۲ مطبوعہ مطبعہ خیر یہ میرٹھ)

بخاری اور مسلم میں ہے کہ،

فتح مکہ کے موقع پر حضرت ام بانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ اس وقت غسل فرما رہے تھے۔ آپ نے پوچھا ”یہ کون ہے؟“ ام بانی نے کہا کہ ”میں ام بانی ہوں۔“ پھر حضرت ام بانی نے عرض کیا۔ ”اے اللہ کے رسول! میرا ماں جایا بھائی (حضرت علیؓ) کہتا ہے کہ وہ ہمیرہ کے لڑکے (یعنی میرے شوہر) کو قتل کر دیں گے۔“

حالاںکے میں اسے پناہ دے چکی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے جس کو پناہ دیدی ہم نے بھی اسے پناہ دیدی۔“

(صحیح بخاری۔ کتاب الغسل، باب التتر فی الغسل۔
و کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی الثوب الواحد عن امیہ
و صحیح مسلم کتاب الحیض)

اس سے ظاہر ہے کہ جب عین میدان جنگ میں کسی بھی مسلمان کب پناہ دیدینے کے بعد چاہے پناہ دینے والی عورت ہی کیوں نہ ہو اس کا احترام تمام مسلمانوں پر فرض ہے تو جو لوگ خود حکومت وقت کی امان کے بعد اسلامی حکومت میں داخل ہوں اس کا احترام کیوں ضروری نہیں ہوگا۔ موجودہ حالات میں جو کفار اسلامی حکومت میں امان کے ساتھ (ویر لے کر) داخل ہوتے ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت تمام مسلمانوں کا فرض ہے اور ان کا حکم وہی ہونا چاہیے جو ان کفار کا ہوتا ہے جو مستقل طور پر ذی کی حیثیت سے دارالاسلام میں رہتے ہوں۔ لہذا ایسے مستأمن کو اگر کوئی مسلمان قتل کر دے تو قصاص میں ایسے قاتل کو قتل کیا جانا چاہیے۔ ہذا مارأیتہ واللہ اعلم۔

قصاص میں کوئی امتیاز نہیں تمام فقہاء متفق ہیں کہ اگر مقتول عورت

ہو یا بچہ ہو، اندھا ہو، پاہنج اور معذور ہو، لنگڑا یا لونجا ہو یا مجنون ہو تو اس کے قاتل کو جو مرد ہو، بالغ ہو، بیٹا ہو، صحیح

الاعضاء ہو اور عاقل ہو تو اگر قاتل نے عمدہ قتل کیا ہے تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ قاتل اور مقتول کے درمیان ان تفاوتوں کا لحاظ کرنے سے قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا اور لوگوں کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان -

(الْكَفَى بِالنَّفْسِ) کا حکم دیا ہے اور جان جیسے ایک مرد میں ہوتی ہے عورت میں بھی ہوتی ہے، جیسے ایک عاقل و بالغ میں ہوتی ہے ایک مجنون اور نابالغ بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ جیسے ایک تندرست اور توانا آدمی میں ہوتی ہے ایک نابینا اور اچا بچ اور معذور میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جان اور جان میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم کا یہی ارشاد ہے۔

بیٹے کے بدلے میں باپ | اگر باپ یا ماں نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا ہو یا دوا، دادی

نے اپنے پوتے کو اور نانا، نانی نے اپنے نواسے کو قتل کر دیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی نے بچہ کو واقعی فتنہ کیا ہو تو انہیں قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ البتہ اگر انہوں نے تادیب کوئی چیز پھینک کر ماری اور وہ کسی نازک مقام پر لگ گئی جس سے بچہ کی موت واقع ہو گئی تو چونکہ تادیب و تنبیہ کا شبہ موجود ہے اس لئے ان کو قصاص میں قتل نہیں کیا

جائے گا۔ جمہور فقہاء نے حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے جس میں آنحضرت ﷺ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس حدیث کو دارقطنی، ترمذی اور حاکم و بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے اہل جاز اور اہل عراق سب نے اس حدیث کو قبول فرمایا ہے۔

(اعلام السنن ص ۱۸۶ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریروڈ کراچی)

چونکہ باپ، ماں، دادا، دادی اور نانا، نانی میں شفقت پوری مادری کے باوجود اس کا امکان بہت ہی بعید ہے کہ وہ عمداً اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ لہذا زیادہ تر احتمال اسی کا ہے کہ باپ ماں وغیرہ کے ہاتھوں اگر اولاد کا قتل عمل میں آیا ہے تو وہ خطاً ہی ہوا ہوگا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے بھی فرمادیا ہوگا کہ باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کے جوار شادات نقل کئے گئے ہیں وہ مخصوص واقعات و حالات سے متعلق ہو سکتے ہیں انہیں عام قانون نہیں کہا جاسکتا۔ فقہاء کی طرح حضور اکرم ﷺ نے بھی فرماتے تھے بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آجاتا تھا اور اس کا حکم آپ سے دریافت کیا جاتا تھا تو صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے

اس کا حکم آپ بیان فرمادیا کرتے تھے۔ لہذا عین ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس واقعہ میں یہ ارشاد فرمایا ہو اس میں تنبیہ و تادیب کا شعبہ موجود ہو اس لئے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا ہو۔ قرآن کریم نے عام مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھود کرید کرنے سے منع فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃ مائدہ میں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنَ أَشْيَاءَ
إِن تَبَدَّلَ لَكُم مِّنْهُنَّ
(۵۱)

ترجمہ:- اے پیروان دعوت ایمانی! تم (فرضی چیزوں کے متعلق سوالات نہ کیا کرو کہ اگر ان کا حکم ظاہر کر دیا جائے تو تمہارے لئے تکلیف کا باعث بن جائے۔

اسی آیت میں اس کے بعد ہے:

وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلَ الْقُرْآنُ تُبَدِّلْكُمْ
عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ قَدْ
سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكَ ثُمَّ اصْبَحُوا بِهَا
كَفُورِينَ ○ (۵۲-۵۱)

ترجمہ:- اور اگر تم قرآن کے نزول کے زمانہ میں ان کے متعلق سوالات کرو گے تو تمہیں ان کے احکام بتلائیے جائیں گے۔ اللہ نے تمہیں اب تو معاف فرمادیا (لیکن آئندہ احتیاط رکھو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت فرمانے والے اور بڑے ہی بردبار ہیں۔ تم سے پہلے بھی ایک

قوم (بنی اسرائیل) نے ایسے ہی سوالات کئے تھے پھر نبی ابن
کوان کا حکم بتا دیا گیا تو وہ ان کے منکر بن گئے۔

احادیث کا شان نزول | خود حق تعالیٰ نے اپنے اصول
اور احکام، مسائل کی صورتیں
فرض فرما کر نازل نہیں فرمائے۔ بلکہ جب تک کوئی مسئلہ واقعی طور
پر پیش نہیں آگیا اس کا حکم نہیں بنایا۔ چنانچہ کتاب الہی کی تکمیل
میں تیس سال کا عرصہ لگ گیا۔ حق تعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں
تھا کہ وہ ایک دفعہ ہی پوری کی پوری کتاب نازل فرما دیتا۔ مگر
حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ تدریجی طور پر احکام نازل فرمائے
کہ جب کوئی حادثہ پیش آگیا تو اس کا حکم نازل فرمادیا۔ اور
مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھوج کر یاد کرنے سے منع فرمادیا۔
تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لامحالہ اسی سنت الہی کی پیروی
فرمانا تھی۔ آپ نے بھی جو احکام بیان فرمائے ہیں لامحالہ وہ بھی
یونہی فرضی طور پر بیان نہیں فرمائیے ہوں گے۔ بلکہ واقعات
وحادثات کے بعد ہی بیان فرمائے ہوں گے۔ مگر ہماری یہ
غلط نگہی حیرت ناک ہے کہ کتاب الہی کے متعلق تو جو قانون
کی کتاب (Text Book) ہے۔ اس کے بیان فرمودہ احکام
واصول میں تو ہم ان واقعات و حوادث (شان نزول) کی
تلاش و جستجو اور چھان بین کرتے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ
اصول و احکام نازل ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تشریح و تبیین میں
جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں ہم قطعاً اس کی فکر نہیں کرتے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تشریح و تبیین کب فرمائی تھی۔ کن حالات میں فرمائی تھی۔ کس واقعہ میں فرمائی تھی۔ حالانکہ قانون کی جو اصولی اور بنیادی کتاب (Text Book) ہے۔ اس میں ہمیں اس کی جستجو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ قانون کے تو الفاظ دیکھے جاتے ہیں کیونکہ قانون کا ہر لفظ اپنے معنی اور اپنا مقصد رکھتا ہے۔ وہ واقعات و حوادث کا پابند نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے یہ فیصلہ فرما رکھا ہے کہ۔

أَلْعِبْرَةُ لِعُمُومِهِمُ إِلَّا لَفَظًا لِّلْخُصُوصِ الْمَوْجِدِ۔

ترجمہ :- الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا۔ مخصوص واقعہ

کا جس میں وہ وارد ہوا ہے کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

کیونکہ ایک قانون کی حیثیت ہی یہ ہونی چاہیے اور ہوتی ہے لیکن قرآنی احکام کے لئے تو ہم شان نزول کی تلاش کرتے ہیں لیکن ان واقعات و حوادث کی ہم کوئی فکر ہی نہیں کرتے جن پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ان اصول و احکام کو منطبق (APPLY) فرمایا تھا۔ چنانچہ ارشادات نبوی کے متعلق ہمیں نہ ان کی تاریخ معلوم ہے۔ نہ وہ واقعہ یا حادثہ معلوم ہے جس پر آپ نے قرآن کریم کے کسی حکم کو منطبق فرمایا تھا۔ اس طرح ہم نے اصل قانون کو فرع بنا ڈالا ہے اور فرع کو اصل بنا ڈالا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نے فقہ میں بڑی ہی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔

بہر حال اس مسئلہ میں ہم امام مالکؒ کے قول کو ترجیح

دیتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو کسی خاص واقعہ پر محمول کرنے پر مجبور ہیں جس میں تنبیہ و تادیب کا شبہ موجود تھا لہذا وہ قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطا تھا۔ واللہ اعلم۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ایسے والدین کا وجود بھی غنقا نہیں ہے جو اپنی توہم پرستانہ شقی اقلبی کا بدترین نمونہ ہیں۔ اخبارات اس کے شاہد ہیں کہ باپ نے بیٹے کو کسی جنسی اشتعال میں یا خواب میں بیٹے کو قربان کرتے ہوئے دیکھ کر بیٹے کو پوری شقاوت کے ساتھ ذبح کر ڈالا۔ کیا ایسے باپوں کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ باپ نے شفقت و مرحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹے کو ذبح کر دیا تھا۔ ایسے والدین یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ انہیں عبرتناک سزا دی جائے اور تختہ دار پر لٹکا دیا جائے۔

مجھے ان حضرات پر حیرت ہوتی ہے جنہوں نے اپنے موقف کی تائید میں یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ باپ ماں تو بچہ کی حیات کا سبب ہیں ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اولاد کو قتل کر دیں گے۔ لہذا ماں باپ کو اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات نے کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہوتا ہے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یقیناً والدین کو ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ لیکن سوال تو اس کا ہے کہ اگر وہ قتل کر دیں تو کیا ان کو اس کی سزا دی جائے گی یا نہیں۔

کون نہیں جانتا کہ عربوں میں دختر کشی کا رواج تھا اور لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ کیا لڑکیاں اولاد نہیں ہوتی تھیں۔ خود قرآن کریم نے اس قبیح رسم کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے مثلاً :-

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۖ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۖ

(۴)

ترجمہ :- اور خیال کرو جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی۔

ایسے درندہ صفت انسان ہر زمانہ اور ہر معاشرہ میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ تو اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اسے سزا یقیناً دی جانی چاہیے۔ قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کا عام قانون بیان کیا ہے۔ اس نے کہیں ماں باپ، دادا دادی، اور نانا نانی کا استثناء نہیں فرمایا عدالت کو دیکھنا چاہیے کہ بچہ کا قتل عمدًا ہوا ہے یا کسی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر عمدًا قتل ہوا ہو تو قتل عمد کی سزا دی جائے اور خطا قتل ہوا ہے تو قتل خطا کی کارروائی کی جائے۔

اپنے غلام مدبر اور مکاتب کے بدلے فقہاء نے ایک مسئلہ یہ بھی بیان

کیا ہے کہ اپنے غلام یا مدبر یا مکاتب کے بدلے میں مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ اقسام اب موجود نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یہ اقسام وجود پذیر ہو جائیں تو ہمارا

خیال ان کے متعلق بھی یہی ہے کہ مالک کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ مالک اگر اپنے غلام یا مدبر یا مکاتب کو قتل کر دے تو مالک کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ مالک قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۲۹۵)

حنفیہ میں سے امام زفرؒ کا بھی یہی خیال ہے۔

(اعلام السنن ص ۹۲)

ہمارا خیال ہے کہ امام نخعیؒ اور امام زفرؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے۔ اور جان غلام اور مدبر اور مکاتب میں بھی ہوتی ہے۔ لہذا اس قرآنی حکم میں غلام اور مدبر و مکاتب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس کی یہ دلیل دی ہے کہ غلام مدبر اور مکاتب کے قصاص کے حق کا ولی خود مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کو اگر صاحب حق کی اجازت سے تلف کر دیا جائے تو ضمان ساقط ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تو خود صاحب حق ہی تلف کرنے والا ہے۔ لہذا قصاص ساقط ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص کسی آدمی سے خواہش کرے کہ مجھے قتل کر دو اور وہ آدمی اسے قتل کر دے تو قتل کرنے والے آدمی پر قصاص نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے خود مقتول کی خواہش پر اسے قتل کیا ہے۔ (اعلام السنن ص ۹۲ مطبوعہ مپرائٹ پریس کراچی)

لیکن یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے خیال میں یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ غلام، مدبر اور لکاتب کے حق قصاص کا ولی خود اس کا مالک ہوتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یقیناً ایسا تھا۔ لیکن اسلام کے آجانے کے بعد حق قصاص کی ولی خود اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ کوئی فرد واحد نہیں ہوتا۔ اس پر ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے خواہش کرے کہ تو مجھے قتل کر دے اور اس اجازت کی وجہ سے قاتل، جرم قتل سے بری الذمہ ہو جائے۔ آدمی کی جان حق تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ لہذا اس کے خون کی ولی بھی اسلام کی نمائندہ حکومت ہی ہوتی ہے۔ لہذا کسی کے کہنے سے اگر کوئی آدمی جرم کرے تو جرم پھر بھی جرم ہی رہے گا۔ اگر کسی نے کسی کے کہنے پر کسی آدمی کو قتل کر دیا تو قتل پر اس کے سناے والا بھی مجرم ہے اور قتل کرنے والا بھی۔ مجرم یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو فلاں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ لہذا مجرم وہ ہے جس نے مجھے قتل کرنے کو کہا تھا۔ لہذا اسے قصاص میں قتل کیا جائے۔ ایسے ہی مذکورہ صورت میں بھی مجرم دونوں ہیں۔ جس نے قتل کیا وہ بھی مجرم ہے اور جس نے خواہش کی تھی کہ مجھے قتل کر دو وہ بھی مجرم ہے۔ خواہش کرنے والا چونکہ مرتکب ہے اس لئے اس سے قصاص تو نہیں لیا جاسکتا۔ وہ عذاب الہی کا مستحق ہوگا اور قاتل چونکہ زندہ ہے۔ اس لئے اس سے قصاص

لیا جائے گا۔

دوسرے کے غلام کے بدلے | اگر کسی شخص نے کسی
قتل کر دیا تو امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ،
ابو ثورؒ اور لیثؒ کا قول یہ ہے کہ قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا
کیونکہ قاتل اور مقتول ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ نیز قرآن کریم
نے فرمایا ہے کہ نہ

كَتَبَ عَلَيْكُمْ الْقصاصُ فِي الْقَتْلِ الْحَرْبِيِّ
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَى بِالْأُنْثَى۔ (۱۷۸)

ترجمہ: تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین کے سلسلہ
میں۔ آزاد، آزاد کے بدلے میں۔ غلام، غلام کے بدلے میں
اور عورت، عورت کے بدلے میں۔

لہذا آزاد آدمی کو آزاد آدمی کے بدلے ہی میں قتل کیا جاسکتا
ہے۔ غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کا یہ
استدلال اگر صحیح ہے تو پھر غلام اگر کسی آزاد آدمی کو قتل کرے
یا کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو قتل کر دے تو وہاں
بھی قصاص نہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ کا وہ مطلب
نہیں ہے جو یہ حضرات اس سے نکال رہے ہیں۔ بلکہ آیت کا
مطلب یہ ہے کہ جس آزاد آدمی نے قتل کیا ہے وہی قتل کیا جائے
گا۔ وہ اپنے بدلے میں اپنے کسی غلام یا معتقد کو قتل کے لئے پیش
نہیں کر سکتا یا جس غلام نے قتل کیا ہے وہی غلام قتل کیا جائیگا۔

جس عورت نے قتل کیا ہے وہی عورت قتل کی جائے گی۔ زمانہ جاہلیت میں جو یہ دستور تھا کہ وہ قاتل کے خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیتے تھے وہ غلط تھا۔ نیز قوی اور زور آور خاندان والے قاتل کے خاندان سے اپنے غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو، عورت کے بدلے میں مرد کو اور ایک مقتول کے بدلے دس دس آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے وہ بھی غلط تھا۔ قصاص میں صرف اسی آدمی کو قتل کیا جاسکتا ہے جس سے جرم کا ارتکاب ہوا ہو۔ دوسروں کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور نخعیؒ اس کے قائل ہیں کہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی کے غلام کو قتل کر دیا ہے تو قاتل کو قتل عمد میں قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ ہم اسی قول کے حق میں ہیں۔ کیونکہ انسانی جان قابل احترام ہے اور اس کو قتل کرنا حرام ہے۔ وہ آزاد ہو تب بھی اور غلام ہو تب بھی۔
(بدایۃ المجتہد ص ۳۹۹)

اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو | ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص

نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور اس بیوی کا وارث اس کا بیٹا ہے جو قاتل (شوہر) کا بھی بیٹا ہے۔ تو چونکہ حق قصاص کا وارث بیٹا ہے۔ لہذا قصاص ساقط ہو جائے گا کیونکہ بیٹا اپنے باپ سے قصاص نہیں لے سکتا۔ ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے۔ ہم اس بنیاد کو تسلیم نہیں کرتے کہ حق قصاص کا وارث اور ولی

مقتولہ کا بیٹا ہے۔ ہمارے نزدیک حق قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہوتی ہے نہ کہ مقتول کے ورثاء۔ لہذا حکومت ہی مدعی ہوتی ہے اور وہی حق قصاص کی وارث ہوتی ہے۔ لہذا بیٹے اور باپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مقتول کے ورثاء اگر نابالغ ہوں | ہمارے بعض فقہاء کا خیال ہے کہ اگر

مقتول کے ورثاء نابالغ ہوں یا کوئی ایک وارث یا چند وارث نابالغ ہوں تو چونکہ حق قصاص کے ولی مقتول کے وارث ہوتے ہیں۔ لہذا جب تک ورثاء بالغ نہ ہو جائیں یا جو ورثاء نابالغ ہوں وہ بالغ نہ ہو جائیں اس وقت تک قصاص کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یہ ورثاء قصاص کو معاف کر دیں۔ لہذا ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ بالغ ہو جانے کے بعد وہ بھی اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص کا فیصلہ ہو سکے گا اور اگر وہ معاف کر دیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ جو ورثاء بالغ ہیں وہ اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص کا فیصلہ کر دیا جائے گا، نابالغوں کے بالغ ہو جانے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ ہم امام ابو حنیفہؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک حق قصاص کے ولی مقتول کے ورثاء نہیں ہیں کہ اگر بالغ ورثاء قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص لیا جائے۔ حق

قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہے۔ لہذا اور ثامہ کے بالغ یا نابالغ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پانی میں ڈبو کر مار ڈالنا اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر کسی بچہ کو یا بڑے آدمی کو پانی میں ڈبو کر مار ڈالا تو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قصاص نہیں لیا جاسکتا کیونکہ پانی کوئی ایسی دھار دار چیز نہیں ہے جس سے عادتہ قتل کیا جاتا ہو۔ لہذا قتل عمد نہیں ہوا۔ لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نیز امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قتل عمد ہے۔ لہذا قصاص میں ڈبونے والے کو قتل کیا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی گردن اڑادی جائے گی۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قاتل کو اسی طرح پانی میں ڈبو کر قتل کیا جائے گا جس طرح اس نے مقتول کو ڈبو یا تھا۔ ہمارے نزدیک اس صورت میں قصاص جاری ہونا چاہیے۔ عدالت کو اختیار ہے کہ وہ قتل کی جو صورت چاہے اختیار کرے۔ اگر لوگوں کو عبرت اور سبق دینا ضروری ہو تو وہ اسے پانی میں غرق کر کے بھی مار سکتی ہے اور اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کی گردن بھی اڑا سکتی ہے اور تختہ دار پر بھی چڑھا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ ارشاد دراصل قتل عمد کی اس غلط تعریف پر مبنی ہے کہ قتل عمد اسے کہتے ہیں کہ قاتل بالارادہ کسی کو کسی دھار دار آلہ، یا دھار دار آلہ کے قائم مقام کسی آلہ سے مثلاً دھار دار لکڑی سے، دھار دار بانس کے پٹھے

سے یاد دھار دار پتھر کے ٹکڑے سے قتل کر دے یا آگ میں جلا دے
یہ تعریف صحیح نہیں ہے۔ قتل عمد کی تعریف میں ہر وہ قتل
داخل ہے جس سے قاتل کا مقصد کسی کو قتل کرنا ہو، خواہ وہ
دھار دار آ لہ ہو یا کوئی اور ذریعہ ہو۔ مثلاً زہر دیدینا۔ آگ
سے جلا دینا، پانی میں غرق کر دینا، بڑے پتھر سے کچل دینا۔ بلند
مکان سے گرا دینا، جو ڈو کر اٹے سے کسی ایسی رگ پر ضرب لگانا
جس سے مضروب مر جائے۔ باکسنگ میں کسی نازک مقام پر
ضرب لگانا جس سے مضروب کی جان چلی جائے۔ سب صورتیں
اس میں داخل ہیں۔ قتل عمد کی تعریف ہی چونکہ فقہاء نے غلط
کی تھی اس لئے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ فیصلہ
فقہاء کو منسوب کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ
رحمۃ اللہ علیہ نے تمام فقہی جزئیات خود مرتب نہیں فرمائیں انہوں
نے اصول مرتب فرمائے تھے۔ بعد کے فقہاء نے ان کے اصول
پر جزئیات کی تخریج فرمائی ہے۔ اور چونکہ یہ تخریجات ان کے
اصول پر فرمائی گئی ہیں اس لئے ان کی نسبت امام صاحب کی
طرف کر دی گئی ہے۔

قصاص میں سزائے موت کا طریقہ | قتل عمد میں سزائے

تو سزائے موت کس طرح دی جائے؟ اس میں بھی اختلاف ہے
امام ابو حنیفہؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سزائے موت کا طریقہ صرف
یہی ہے کہ قاتل کا سر تلوار سے قلم کر دیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ

امام محمدؒ، ثوریؒ اور عطاءؒ کا یہی مذہب ہے۔ اس کے برخلاف امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کو قتل کیا تھا بالکل اسی طرح قاتل کو قتل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ طریقہ ناجائز اور حرام نہ ہو، مثلاً کسی نے نابالغ لڑکی سے جبراً زنا کیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی تو اس میں مماثلت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کسی نے کسی بچہ کو غرق کر کے مار ڈالا، زہر دے کر مار ڈالا، پتھر سے سر کچل کر مار دیا تو ان طریقوں میں مماثلت ممکن ہے۔ لہذا وہی طریقہ اختیار کئے جائیں گے جو قاتل نے مقتول کو قتل کرنے میں اختیار کئے تھے۔ ان حضرات نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے بھی استدلال فرمایا ہے جو سورۃ بقرہ میں ہے کہ :

فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ
مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (۱۶۴)

ترجمہ : توجو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کر سکتے ہو جیسی اس نے زیادتی کی ہے۔
اور سورۃ شوریٰ میں ہے :

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ
فَاجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ط (۳۲)

ترجمہ : اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ توجو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔

نیز سورہ یونس میں ہے :-
وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا.

(۳۲)

ترجمہ :- اور جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں تو برائی کا بدلہ اسی کے مثل کے ساتھ دیا جائے گا۔

ان تمام آیات کریمہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ جیسا کچھ کسی نے کیا ہے اسی طرح اس سے بدلہ لیا جائے۔ جس طرح قاتل نے کسی کو قتل کیا ہے بعینہ اُسی طرح قاتل کو بھی قتل کیا جائے۔ فقہائے حنفیہ کا خیال ہے کہ یہ مماثلت طریقہ قتل میں ضروری نہیں ہے۔ یہ مماثلت اس میں ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کی جان لی ہے ایسے ہی قاتل کی جان بھی لی جائے۔ مماثلت صرف جان لے لینے میں ہے۔ جان لینے کے مخصوص طریقہ میں نہیں ہے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ ایک بچہ کو پتھر سے ایک مرتبہ سر کچل کر مارا جاسکتا ہے۔ لیکن اتنے ہی بڑے پتھر سے قاتل (بڑے آدمی) کا سر ایک مرتبہ کچل کر اسے نہیں مارا جاسکتا اگر ایک مرتبہ سر کچلنے کے بعد قاتل نہ مرا تو کیا اس کا سر دوبارہ کچلا جائے گا۔ اگر دوبارہ کچلا جائے گا تو مماثلت نہ رہی اور اگر قاتل کو اس کے بعد ربا کر دیا جائے تو اس میں خون مسلم کو رائیگاں کرنا ہے جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :-
لَا قَوْلَ إِلَّا بِاللَّيْفِ۔

ترجمہ :- سزائے موت تلوار ہی سے دی جاسکتی ہے۔

یہ حدیث مختلف طریقوں سے احادیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-
لَا أَقْتُلُكُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ ۔

ترجمہ :- جب تم کسی کو قتل کرو تو خوبی کے ساتھ قتل کرو۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نشانہ بنا کر مار ڈالنے اور صورت و ہیئت کو بگاڑنے (مُتْلَکَہُ) سے بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔

(ان تمام احادیث کے لئے دیکھئے اعلام السنن ص ۱۸۹، مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

جانوروں کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-

اللہ نے ہر چیز پر احسان فرمانے کا حکم دیا ہے۔ لہذا جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی چھری کو خوب تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔ (مسلم - کتاب الصيد والذبائح)

ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب میں کسی بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں بکری پر ترس آتا ہے تو حق تعالیٰ بھی تم پر رحم فرمائے گا۔

(مسند احمد ابن حنبل ۷/۳۳۳)

قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بے شمار مقامات پر حسنِ عمل اور احسان کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ہم جو کام بھی کریں خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ کریں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نزلتے موت کے لئے جو تلوار کی تخصیص فرمائی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح مقتول کی جان آسانی سے جلد نکل جاتی ہے اور اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں آسان ترین طریقہ قتل یہی تھا کہ جس سے مقتول کو کم سے کم اذیت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قیامت تک کے لئے ہم اسی طریقہ کے پابند ہو جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جنگی اسلحہ میں تیر و تلوار اور نیزے وغیرہ بہترین جنگی اسلحہ تھے۔ لہذا آپ نے ان ہتھیاروں کا استعمال سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن آج جنگی اسلحہ توپ و تفنگ، بمبار طیارے اور ٹینک و میزائل ہیں آج کے حالات میں وہی احکام جو اس عہد میں تیر و تلوار نیزوں اور منجینیق کے لئے تھے، اب موجودہ اسلحہ پر منطبق کرنا ہوں گے مقصد یہ ہے کہ قاتل کی جان تولی جائے مگر آسان ترین طریقے سے لی جائے۔ آج اگر دوسرے طریقے تلوار سے بہتر ہو سکتے ہیں تو یقیناً ان کو اختیار کرنا ہوگا۔ پھانسی دینا۔ بجلی کے جھٹکے سے مار ڈالنا۔ گردن اڑا دینا۔ توپ دم کر دینا۔ گولی مار دینا، سب اس میں داخل ہیں۔ حکومتِ وقت کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان میں سے کون سا طریقہ آسان تر ہے۔ مقصد سزا دینا ہے۔ شقاوتِ قلبی

کا مظاہرہ کرنا نہیں ہے۔ لیکن اگر حاکم وقت لوگوں کی تادیب اور عبرت کے لئے قاتل کو اسی طریقہ سے سزا دینا چاہیے جس طرح اس نے مقتول کو قتل کیا تھا تو عدالت کو اس کا حق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کو پتھر سے سر کچل کر مروا دیا تھا کیونکہ اس نے بھی ایک مسلمان بچی کو اسی طرح قتل کیا تھا۔ اسے طحاوی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(اعلار السنن ص ۱۸۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)
 ہمارے خیال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیب و عبرت کی خاطر ایسا کیا تھا لہذا اس طرح کی حدیثوں کو تعزیریہ پر محمول کرنا چاہیے۔

کسی نے ہل سے کسی کو قتل کر دیا | کسی شخص نے کسی
 ہل سے مار ڈالا تو اگر اس نے ہل کے پھل سے اُسے مارا تھا جو لوہے کا ہوتا ہے اور اس میں دھار ہوتی ہے تو اگر اس نے دھار کی طرف سے مارا ہے اور مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قاتل کو سزائے موت دی جائے گی۔ اور اسے قتل عمد شمار کیا جائے گا اور اگر اس نے لوہے سے دھار کی طرف سے نہیں مارا بلکہ اس کی پشت کی طرف سے مارا ہے تو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ یہ قتل عمد ہے اور قاتل سزائے موت کا مستحق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قتل عمد شمار ہوگا ورنہ

قتل خطا شمار ہوگا اور سبائے سزائے موت کے دیت واجب ہوگی۔ لیکن اگر قاتل نے ہل کی لکڑی سے مارا ہے تو یہ قتل خطا شمار ہوگا۔ اور دیت واجب ہوگی۔

— ہمارا خیال ہے کہ یہ تفصیل قطعاً غیر قرآنی ہے۔ ان تمام صورتوں میں جہاں قاتل نے عمداً قتل کیا ہے، اسے قتل عمد ہی سمجھنا چاہیئے اور قاتل کو سزائے موت ہی دی جانی چاہیئے آلہ قتل کا لوہے کا بنا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو دو پتھروں کے درمیان سر کچل کر مروایا تھا۔ اور سزائے موت ہی دی تھی (روایت اوپر گزر چکی ہے) پتھر نہ لوہے کا بنا ہوا ہوتا ہے نہ اس میں لوہے کی طرح دھار ہوتی ہے۔ اگر قتل عمد میں یہ شرط رکھ دی جائے کہ وہ صرف دھار دار آلہ سے قتل کرنے ہی میں ہوتا ہے تو لازم آتا ہے کہ زہر دے کر مار ڈالنے میں، پانی میں غرق کر کے مارنے میں، آگ سے جلا کر مار ڈالنے میں بھی سزائے موت نہ دی جاسکے بلکہ دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ اس طرح تو خونِ مسلم کی ارزانی ہو جائے گی اور لوگ دوسرے ایسے طریقوں سے قتل کرنا شروع کر دیں گے جن میں وہ قتل عمد کی سزا سے بچ سکیں اور دیت ادا کر کے چھٹکلا حاصل کر لیں جو قانون کا مقصد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطا۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ قاتل کا ارادہ واقعی قتل ہی کرنے کا تھا یا اس کا مقصد محض تادیب تھی اور بلا ارادہ

مقتول کی موت واقع ہو گئی۔

مختلف اسباب سے موت واقع ہونا | اگر کسی شخص نے خودکشی کی

کوشش کی اور اپنے کو زخمی کر لیا۔ اس کے بعد اس پر شیر نے بھی حملہ کر کے زخمی کر دیا، یا اسے سانپ نے ڈس لیا۔ پھر اس کے بعد کسی دشمن نے بھی اس پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ اب یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی موت کا اصل سبب کیا تھا۔ اس نے خودکشی کی بھی کوشش کی تھی اور خود کو زخمی کر لیا تھا۔ اسے شیر نے بھی زخمی کر دیا تھا یا سانپ نے بھی ڈس لیا تھا۔ پھر اس پر اس کے دشمن نے بھی حملہ کیا۔ اب معلوم نہیں کہ موت کا اصل سبب کیا تھا۔ ایسی صورت میں قاتل پر ایک تہائی دیت واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل بھی دیا جائے اور اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی جائے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل تو دیا جائے مگر اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ کیونکہ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ لہذا تعزیراً اس کی نماز جنازہ نہ ہونی چاہیے کیونکہ اس نے خودکشی کر کے حرام موت مرنے کی کوشش کی تھی۔

ہم امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ خودکشی سے مرنا یقینی نہیں ہے جب کہ دوسرے دو اسباب بھی موجود ہیں۔

جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہو جائے | اگر مسلمان کفار سے جنگ کر رہے ہوں۔ گمسان کی جنگ ہو رہی ہو۔ دورانِ جنگ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان ہی کے ہاتھوں سے قتل ہو جائے۔ قاتل نے یہ سمجھا کہ میں جس کو قتل کر رہا ہوں وہ کافر ہے تو قاتل پر نہ تو سزائے موت واجب ہوگی نہ دیت البتہ اسے قتل کا کفارہ دینا چاہیئے۔

کوئی مسلمانوں پر تلوار سونت لے | اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار سونت لے اور مسلمانوں کو قتل کرنا چاہے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسے قتل کر دیں۔ اس کا خون معاف ہے۔ اس کو قتل کرنے والے کو نہ سزائے موت دی جاسکتی ہے اور نہ اس پر دیت واجب ہوگی نہ کفارہ۔ یہ شخص باغی ہے اور اس پر باغیوں کے احکام نافذ ہوں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَنْ شَهِرَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ سَيْفًا فَقَدْ أَطْلَعَ دَمَهُ۔
(بخاری عن عبد اللہ بن مسعود عن ابی ہریرۃؓ وابو نعیم عن انسؓ)

ترجمہ: جو مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھالے تو اس نے اپنے خون کو مباح کر دیا۔
نیز آپ کا ارشاد ہے:

مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(بخاری و مسلم عن ابن عمر عن ابی موسیٰ و مسلم عن ابی ہریرۃ و مسلم
من حدیث سلمۃ مَنْ سَلَّ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

بخوالہ الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ص ۵۶ ہدایہ مطبوعہ کلام کہنی کراچی

اگر کوئی پاگل یا کوئی نابالغ بچہ کوئی ہتھیار اٹھالے اور
کسی مسلمان پر حملہ کرنا چاہے یا کوئی جانور کسی پر حملہ کر دے
اور اسے کوئی مار دے تو حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ اسے قتل کرنے
والے پر دیت واجب ہوگی اور امام ابو یوسفؒ کے خیال میں
جانور کی صورت میں مالک کو اس کی قیمت (تاوان میں) ادا
کرنی ہوگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان تمام صورتوں میں
قاتل پر کچھ بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس نے مدافعت میں
اسے قتل کیا ہے ورنہ وہ اسے مار ڈالتا۔ ہم امام شافعیؒ کے قول
کی تائید کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ اگر کوئی عاقل و بالغ مسلمانوں پر ہتھیار
اٹھالے اور انہیں قتل کرنے کے درپے ہو تو فقہاء فرماتے ہیں
کہ اسے قتل کر دینا واجب ہے اور اس کو قتل کرنے میں نہ سزلے
موت واجب ہوتی ہے نہ دیت لیکن اگر یہی حرکت کسی دیوانہ
یا نابالغ بچہ یا چوپایہ سے سرزد ہو تو دیت یا چوپائے کی قیمت
تاوان میں دلوائی جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ دیوانہ، نابالغ بچہ
اور چوپایہ مرفوع القلم تو ہیں مگر اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم
ان سے اپنی مدافعت کے حق سے بھی محروم ہو جائیں۔ مرفوع القلم

ہونے کے صرف یہ معنی ہیں کہ آخرت میں اُن سے متواخذہ نہیں ہوگا۔ مگر ہمیں اپنی حفاظت اور مدافعت کرنے کا بہر حال حق ہے اور ہونا چاہیئے۔

(قصاص فیما دون النفس)

اگر کسی نے کسی کی جان تو نہیں لی۔ لیکن کسی کے کسی عضو کو نقصان پہنچا دیا ہے تو اس میں بھی مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ
بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْمَ قِصَاصٌ وَمَنْ تَصَدَّقَ
بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا
أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (۲۵)

ترجمہ :- اور ہم نے بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا برابر کا بدلہ ہے تو جو کوئی شخص معاف کر دے تو وہ (قیامت میں، اس کے گناہوں کا) کفارہ بن جائے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل فرمودہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کرے تو وہی لوگ

ظالم ہیں۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر تورات میں یہ حکم نازل فرمایا تھا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو جان کے بدلے جان کا قانون نافذ ہوگا نیز اگر کسی کی آنکھ بیکار کر دے تو مجرم کی آنکھ کو ویسا ہی نقصان پہنچایا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کی ناک کاٹ لی ہے تو اس کی بھی ناک کاٹی جائے گی۔ اگر کسی نے کسی کا کان کاٹ لیا ہے تو اس کا بھی کان کاٹا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کا دانت توڑ دیا ہے تو اس کا بھی دانت توڑا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کو زخمی کر دیا ہے تو زخم کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔ یعنی اس کو بھی ویسا ہی زخم پہنچایا جائے گا۔ حق تعالیٰ کے ان احکام کی پابندی لازمی ہے۔ اگر کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرتا تو ایسے ہی لوگ ظالم کہلائیں گے۔

یہ حکم تورات کا تھا اور اس کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔ لیکن فقہاء کا یہ اصول ہے کہ شرائع من قبلنا ہمارے لئے بھی حجت اور واجب العمل ہوتے ہیں جب تک ان احکام کا نسخ ثابت نہ ہو جائے۔ شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازی اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

”اس آیت کریمہ میں قصاص کے متعلق جو کچھ بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کیا گیا تھا اس کی خبر دی گئی ہے کہ نفس اور اعضاء مذکورہ میں بدلہ (قصاص) کا حکم تھا۔ اور امام ابو یوسفؒ

نے اس آیت کے ظاہر سے استدلال فرمایا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان قصاص کا قانون نافذ ہو گا۔ یعنی عورت کی جان کے بدلے مرد کی جان لی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے (یعنی جان کے بدلے جان) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا مذہب یہی ہے کہ شراخ من کان قبلنا (پچھلی امتوں کی شریعتیں) ان کا حکم ثابت رہتا ہے جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد یا نص قرآنی سے اس کا نسخ معلوم نہ ہو جائے۔ اور آیت کریمہ کے ذیل میں حق تعالیٰ کا ارشاد وَمَنْ لَّيْسَ بِكَفٍ بِمَا آتٰهُ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ، اس آیت کے نازل ہونے کے وقت اس حکم کے ثابت ہونے کی دلیل ہے۔ اول تو یہ کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ حکم ان احکام میں سے ہے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا۔ اور اس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں فرمائی گئی تو یہ حکم تمام زمانوں میں ثابت رہنا چاہیے جب تک اس کو منسوخ کرنے والی کوئی آیت وارد نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت بنی اسرائیل پر ظلم اور فسق کا وصف بیان فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت پیروی نہیں کرتے تھے۔ یا تو وہ اس کا انکار کرتے تھے یا جو اللہ نے ان پر فرض کیا تھا اس پر اپنی سستی اور مفاد پرستی کی بنا پر انہوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قصاص (بدلے)

کا قانون تمام نفوس (اور اعضاء) میں نافذ ہونا چاہیے جب تک اس کے نسخ یا تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔
 احکام القرآن ص ۵۳۴-۵۳۵ مطبوعہ مطبعہ بہیہ
 مہرہ ۱۳۲ھ)

لیکن آیت کریمہ میں ایک جملہ وَالْجَمْعُ قِصَاصٌ بھی آ رہا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زخموں میں بدلہ کا قانون برابر سرابز یعنی مساوات پر مبنی ہونا چاہیے۔ لہذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی نے کسی کے عضو کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا ہی اسے بھی نقصان پہنچایا جاسکے۔ اس میں کمی اور زیادتی نہ ہو اس آیت کے علاوہ سورۃ بقرہ میں ہے:-

مَنْ اِغْتَدٰی عَلٰی عَدُوِّكَ فَاَعْتَدَ وَاَحْلٰیوْ بِمِثْلٍ
 مَا اِغْتَدٰی عَلٰیكَ۔ (۱۳۳)

ترجمہ:- جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی تھی۔

سورۃ شوریٰ میں ہے کہ:-

وَجَزَاؤُ سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۱۳۴)

ترجمہ:- برائی کا بدلہ برائی ہے، اسی کے برابر۔

نیز سورۃ یونس میں ہے:-

وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّئَاتِ جَزَاؤُ سَیِّئَةٍ اِیْسٰیہَا

(۱۳۵)

ترجمہ:- اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے،

انہیں برائی کا بدلہ اس جیسا ہی دیا جاسکتا ہے۔
 ان تمام آیات کا تقاضا یہی ہے کہ کسی بھائی کا انتقام لیا جائے
 تو اس میں مساوات ضروری ہے۔ کسی قسم کی کمی اور زیادتی نہیں
 ہو سکتی۔

ہمارا خیال ہے کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قطعی مساوات
 قائم رکھنا خاص خاص صورتوں کے علاوہ تمام صورتوں میں
 ممکن نہیں ہے۔ البتہ جہاں قطعی مساوات ممکن ہو وہاں بدلہ دلایا
 جائے لیکن جہاں کمی اور زیادتی کا احتمال ہو وہاں بجائے
 صورتہ انتقام کے اگر خون بہا پر زخمی شخص خود راضی کیا جاسکے تو
 اس کی کوشش کرنی چاہیے۔ یا عدالت کو کوئی تعزیری سزا
 دینی چاہیے۔

پہنچے یا کہنی یا بغل سے ہاتھ کاٹ دینا کسی نے

کا ہاتھ اس کے پہنچے سے یا کہنی سے یا شانہ کے جوڑے کاٹ دیا
 تو چونکہ اس نے جوڑے سے ہاتھ کو کاٹا ہے۔ اس میں مماثلت ممکن ہے
 لہذا مجرم کا ہاتھ بھی اسی جوڑے سے کاٹا جاسکتا ہے۔ یہاں بدلے
 یعنی قصاص کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ مجرم کا ہاتھ بھی کاٹا
 جاسکتا ہے۔ لہذا اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مجرم نے
 جوڑے سے ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ بازو کے یا ذراع کے درمیان سے
 ہاتھ کو توڑ دیا ہے جس میں بعینہ مماثلت ممکن نہیں ہے تو اس
 صورت میں دیت یعنی خون بہا پر فیصلہ کرنا چاہیے۔ ابن ابی شیبہ

نے حضرت عمرؓ سے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ”ہم پڑیوں میں قصاص نہیں لیں گے۔ نیز حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ ”پڑیوں میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے۔ لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ سندوں کا ضعیف ہونا اس سلسلہ میں مضرت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے ان احادیث سے استدلال نہیں کیا۔ بہم استدلال قرآن کریم کی اُن آیات سے ہے جو ہم نے اوپر نقل کر دی ہیں۔ ضعیف احادیث سے تائید کا کام لیا جاسکتا ہے۔

(اعلام السنن ۱/۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریڈوڈ

کراچی۔ ہدایہ ص ۶۹ مع درایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

آنکھ اگر نکال دی جائے | اگر کسی نے دوسرے آدمی کی آنکھ کا ڈھیلا جڑ سے

نکال دیا تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ اس میں قصاص (بدلہ) نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ آنکھ کے ڈھیلے کو نکال دینے میں مثلت ممکن نہیں ہے۔ اور اگر آنکھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن اس کی روشنی جاتی رہی یعنی بصارت عائب ہو گئی تو اس میں قصاص یعنی بدلہ لیا جائے گا اس کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ مجرم کے چہرہ پر بھیگی ہوئی روئی رکھ دی جائے اور جس آنکھ کی بصارت زائل کرنی ہو اس کے سامنے آئینہ گرم کر کے سامنے کر دیا جائے۔ آنکھ کی روشنی زائل ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے جو حکم ابن عتیبہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کے تھپڑ مارا جس سے اس کی بصارت

زائل ہو گئی۔ آنکھ کا ڈھیلا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے قصاں کا مطالبہ کیا۔ لیکن کبھی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح بدلہ دلایا جائے۔ اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اُدھر سے گذرے تو انہوں نے بتایا کہ اس کے چہرے پر روئی رکھی جاتے۔ پھر آفتاب کے سنائے اس کے چہرے کو کر دیا جاتے اور اس کے قریب آئینہ کر دیا جاتے اور اس کا عکس آنکھ پر ڈالا جاتے اس کی بصارت زائل ہو جاتے گی اور آنکھ اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ اس روایت کی تخریج ذیلیعی نے کی ہے۔ لیکن اس کی سند جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے قال عبد الرزاق قال اخبرنا محمد بن رطل عن الحكم بن عتيبة۔ اس کی سند میں معمر کے استاد حن سے وہ روایت نقل کرتے ہیں ایک مہول آدمی ہیں اور حکم ابن عتیبہ کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوئی لہذا حدیث منقطع بھی ہے۔

(اعلام السنن ج ۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریڈرڈ کراچی)

صاحب ہدایہ نے حنفیہ کا مسلک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے مطابق نقل کیا ہے۔ اور ذیلیعی نے بتایا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیش آیا تھا اولاً انہوں نے صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا تھا۔

(ہدایہ ج ۵ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی ص ۱۵۹)

لیکن ابن رشد نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پتھر مار دیا اور اس کی آنکھ پھوٹ دی یا کوڑے سے مارا اور جس کو مارا تھا اس کی آنکھ پھوٹ گئی یا کچھ ایسا ہی کوئی اور عمل کیا جس سے آنکھ پھوٹ گئی جس سے بظاہر کسی عضو کو تلف کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا جیسے پتھر مارنا اور آنکھ پھوٹ جانا تو جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ شبہ عمدہ ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے اور اس میں مکمل دیت (خون بہا) دینا ہوگی۔ اور یہی امام مالکؒ سے اہل عراق کی روایت ہے۔ لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ یہ عمدہ ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) دلانا ہوگا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۲۲۲ مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی
مصر۔ ادیشن دوم)

اس سلسلہ میں جمہور فقہاء کا مذہب بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جو روایت صاحب ہدایہ اور اعلام السنن کے مصنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش فرمائی ہے وہ علاوہ اس کے کہ ضعیف اور منقطع ہے اس میں یہی صورت بیان کی گئی ہے کہ کسی نے دوسرے آدمی کے پتھر مارا تھا جس سے مضروب کی آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ پتھر مارنے سے آنکھ پھوٹ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوتا۔ لہذا اسے عمدہ شمار کرنا اور بدلہ دلوانا قابل حیرت ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اس قسم کے فیصلے کی نسبت صحیح ہو سکتی ہے۔ اسی روایت کی بناء

پر فقہاء نے یہ فیصلہ فرمادیا اور اس کے مضمرات پر غور نہیں فرمایا۔
حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

نے تحریر فرمایا ہے کہ ”میں کہتا ہوں کہ بعض کے استاد مجہول ہیں اور حکم عین علی
منقطع ہے لیکن اس کا کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ قیاسی
ہے۔ اور ضعیف روایت تائید اور تقویت کے لئے درست ہو سکتی
ہے۔“ (اعلام السنن ص ۱۸ مطبوعہ سیر آرٹ پریس کراچی)

اگر یہ مسئلہ واقعی قیاسی ہے تو قیاس تو اس فیصلہ کے
خلاف جاری ہے جو مشہور مذہب کے مطابق فقہائے کرام نے
فرمایا ہے۔ قیاس تو مجہول کے قول کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ
تھمر مارنے سے آنکھ کا پھوڑ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوا کرتا۔
اسے عمد کہنا قیاس کے خلاف ہے۔ ہذا مارا یتہ واللہ اعلم
دانت توڑ دینا اگر کسی نے دوسرے کو پتھر یا کسی دوسری
چیز سے مارا اور اس کا دانت ٹوٹ گیا
تو اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو فقہائے حنفیہ کا خیال
ہے کہ جتنا مجروح کا دانت ٹوٹا ہے اتنا ہی دانت ریتی سے
گھس دیا جائے اور اگر پورا دانت جڑ سے نکل گیا ہے تو اس
میں قصاص (بدلہ) اس طرح لیا جائے گا کہ مجرم کا دانت بھی
جڑ سے نکال دیا جائے۔ لیکن بعض فقہاء کا خیال ہے کہ جڑ
سے دانت نہیں نکالا جائے گا بلکہ دیت (خون بہا) دلو لیا
جائے گا۔ کیونکہ دانت کو جڑ سے نکال دینے میں اندیشہ ہے کہ

مجرم کا دانت خراب ہو جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اسے ریتی سے جرثنگ گھس دیا جائے۔

(ہدایہ ص ۵۶۹ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)
حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو سال بھر تک انتظار کیا جائے گا اگر وہ دانت سال بھر میں سیاہ پڑ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پورا دانت بیکار ہو گیا۔ لہذا بدلے یا دیت کا فیصلہ سال بھر تک انتظار کرنے کے بعد کیا جائے اور اگر دانت سال بھر میں سیاہ نہیں پڑا تو جتنا دانت مجروح کا ٹوٹا ہے اس کے بقدر اس کے دانت کو ریتی سے گھس دیا جائے یا اس کے بقدر اس کے نقصان کی تلافی خوں بہا (دیت سے) کر دی جائے۔

(اعلام السنن ص ۱۸۱ مطبوعہ آرٹ پریس کراچی)
ممکن ہے کہ حضرات فقہائے کرام کے زمانہ میں جرث سے دانت نکال دینے میں کوئی قباحت پیش آتی ہو اور دانت کا کچھ حصہ ریتی سے گھس دینے میں سہولت ہوتی ہو۔ لیکن ہمارے عہد میں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ پورا دانت جرث سے نکال دینے میں آج کوئی قباحت نہیں ہوتی بلکہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے۔ البتہ دانت کا بعض حصہ ریتی سے گھس دینے میں واقعی قباحت ہے اور اس میں پوری مماثلت مشکل ہے۔ بہر حال قرآن کریم نے آیت نمبر (۵/۵) میں اَلْسِنَۃٌ یَّا لَیْسَ کا حکم صادر فرمایا ہے

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پورا دانت جڑ سے ٹوٹ گیا ہے۔ یا دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا اور سیاہ پڑ گیا ہے اور پورا دانت ہی خراب ہو گیا ہے اور مجرم نے بالقصد ایسا کیا ہے تو مجرم کا پورا دانت نکال دیا جانا چاہیے۔ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے اور مجرم کا دانت اسی قدر گھس کر کم کیا جا سکتا ہے تو عمدہ کی صورت میں اس کا بدلہ بھی دلا دیا جائے اور اگر پوری مماثلت مشکل ہو تو دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انسؓ ابن مالکؓ کی پھوپھی ربیعہؓ نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا تھا۔ قوم نے قصاص (بدلے) کا مطالبہ کیا اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ لے کر آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص (بدلے) کا حکم صادر فرمایا۔ اس پر حضرت انسؓ ابن مالکؓ کے چچا انسؓ ابن النضرؓ نے عرض کیا۔ اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی قسم اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے انسؓ! کتاب اللہ کا حکم قصاص ہی کا ہے۔ لیکن اس کے بعد قوم راضی ہو گئی اور انہوں نے دیت (خون بہا) لینا منظور کر لیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو حقی تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ عن

انس ابن مالک و کتاب الجہاد باب قول اللہ عزوجل

”من المؤمنین رجال صدقوا“

یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور قرآن کریم کے مطابق ہے
لہذا ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں | اگر کسی نے دوسرے

دئی ہے تو اس میں قصاص (بدلے) کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا
کیونکہ ہڈی کو توڑ دینے میں قطعاً مماثلت ممکن نہیں ہے۔ ایک
شخص نے کسی کے لاسٹی یا اور کوئی چیز مار دی جس سے اس کے
ہاتھ پاؤں یا پسلی وغیرہ کی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس کا بدلہ دلانا
ممکن نہیں ہے۔ اس کا امکان نہیں کہ قصاص دلانے کے لئے
جرم کو ضرب پہنچائی جائے تو بالکل اتنی ہی ہڈی ٹوٹے اور وہیں
سے ٹوٹے جہاں سے اس نے توڑی تھی لہذا اس صورت میں
دیت کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے
نقل کیا ہے کہ :-

”ہم ہڈیوں میں قصاص (بدلہ) نہیں دلا سکتے“

نیز ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ :-

”ہڈیوں میں قصاص نہیں ہے“

ان دونوں روایتوں کو زیلعی نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے
درایہ میں کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ضعیف اور
منقطع ہے اور ابن عباسؓ کا قول بھی ضعیف ہے۔ لیکن اول

تو ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ کیونکہ ابن حجرؒ نے حجاج کی وجہ سے ان حدیثوں کو ضعیف کہا ہے مگر حجاج ضعیف کے نزدیک ضعیف نہیں بلکہ حسن الحدیث ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا استدلال ان احادیث سے نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے حکم وَالْجَوْفَ قِصَاصٌ (زخم برابر برابر ہیں) سے ہے۔ ہڈیوں کو توڑنے میں چونکہ بعینہ مماثلت ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہاں بجائے قصاص (بدلے) کے دیت کے قاتل ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم

مادون النفس میں شبہ عمد نہیں ہوتا | قتل نفس میں
 تین قسموں کے قاتل ہیں۔ قتل عمد۔ قتل شبہ عمد۔ قتل خطا
 لیکن قرآن کریم نے صرف دو قسمیں ہی بیان فرمائی ہیں۔ قتل
 عمد اور قتل خطا۔ تیسری قسم یعنی قتل شبہ عمد بیان نہیں
 کی۔ یہ قسم قرآن کریم پر اضافہ ہے جس کے ہم قاتل نہیں ہیں
 کیونکہ ہم قرآن کریم پر کسی خبر واحد سے اضافہ کرنے کو صحیح
 نہیں سمجھتے۔ لیکن مادون النفس میں ہمارے فقہاء بھی شبہ
 عمد کے قاتل نہیں ہیں جو قطعاً صحیح اور قرآن کریم کے مطابق
 ہے جس کی ہم تائید کرتے ہیں۔

عورت اور مرد، آزاد اور غلام | اگر کسی مرد نے کسی
 عورت کی آنکھ بھوڑ دی، ٹانگ توڑ دی
اور دو غلاموں میں قصاص

دانت، پسلی یا ٹانگ توڑ دی یا اور کوئی زخم پہنچا دیا، یا کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے ساتھ یہی حرکت کر دی یا دو غلاموں نے آپس میں ایک دوسرے کو فیہ دون النفس کوئی زخم پہنچا دیا تو فقہائے حنفیہ^{۱۷} اس کے قائل ہیں کہ ان تمام صورتوں میں قصاص یعنی بدلے کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ صرف دیت دلائی جاسکتی ہے۔ امام شافعی^{۱۸} اس کے خلاف قصاص کے قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانی اعضاء کا حکم بھی وہی ہے جو انسانی نفس کا ہے البتہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے عضو کو نقصان پہنچایا ہے تو قصاص (بدلہ) کا قانون جاری نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد، آزاد اور غلام یا غلام اور غلام میں کسی قسم کا فرق کرنا صحیح نہیں ہے۔ عورت اور مرد کی صورت میں ہم امام شافعی^{۱۹} کے مسلک کی تائید کرتے ہیں اور آزاد اور غلام اور غلام اور غلام کی صورت میں ہم امام شافعی^{۲۰} سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں ہر انسان قابل احترام ہے۔ اس کی جان اور اس کے تمام اعضاء محترم ہیں مثلاً

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ - (۱۵)

ترجمہ:- ہم نے اولادِ آدم کو مکرم و محترم بنالیا ہے۔ اور

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵)

ترجمہ:- ہم نے انسان کو بہترین توازن اور استواری

میں پیدا کیا ہے۔

ایک عورت بھی اسی طرح اولادِ آدم اور انسان ہے جس طرح ایک مرد اولادِ آدم اور انسان ہوتا ہے۔ ایک آزاد آدمی اور غلام بھی یکساں آدم کی اولاد اور انسان ہے۔ لہذا ان میں کسی قسم کا فرق و امتیاز برتنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حنفیہ کی طرف سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ اعضاء کا حکم اموال کا حکم ہے۔ چنانچہ مرد کے ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار مقرر کی گئی ہے اور عورت کے ہاتھ کی قیمت اس کا نصف ہے۔ لہذا اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ مرد کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے پانچ سو دینار کا نقصان کیا ہے اور عورت کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے ڈھائی سو دینار کا نقصان پہنچایا ہے۔ چونکہ دونوں صورتوں میں نقصانات برابر نہیں ہیں اس لئے قصاص (بدلے) کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ جس بنیاد پر یہ دلیل قائم ہے ہمارے خیال میں وہ بنیاد ہی صحیح نہیں ہے۔ قیمت کا یہ فرق خود متنازعہ فیہ ہے۔ اس پر ہم دیات کے باب میں بحث کریں گے۔ بہر حال قرآن کریم کا حکم نہایت واضح اور دو ٹوک ہے۔

إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ
بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ
وَالْجُرُوحَ قِصَاصًا (۵)

تو جسدہ بہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ،

ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخم برابر برابر ہیں۔

قرآن کریم نے عورت اور مرد آزاد اور غلام کی جان اور اعضاء میں کسی فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھا تو ہمیں کسی فرق و امتیاز برتنے کا حق کہاں سے مل گیا۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے واضح احکام میں تخصیص نہیں کی جاسکتی۔

کافر اور مسلم میں قصاص | اگر کسی مسلمان نے کسی کوئی نقصان پہنچا دیا یا مستأمن اور معاہدہ کافر کے کسی عضو کو نقصان پہنچا دیا تو ہم لوگ فقہاء قصاص (بدلے) کے قائل ہیں۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک ایک مسلمان عورت اور ایک مسلمان غلام ایک ذمی کافر سے بھی کم تر ہے کہ ذمی کافر کے سلسلہ میں وہ بدلے کے قائل ہیں لیکن مسلمان عورت اور مسلمان غلام کے سلسلہ میں بدلے کے قائل نہیں ہیں۔ یا للعجب!

نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینا | اگر کسی نے دوسرے کا ہاتھ نصف بازو یا زخم جائفہ پہنچا نا۔ (ساعد) سے کاٹ دیا

تو اس میں قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت (خون بہا) دلایا جائے گا کیونکہ یہ ہڈی کو مجروح کرنا ہوا اور ہڈیوں میں چونکہ مساوات ممکن نہیں ہے۔ اس لئے قصاص (بدلہ) نہیں دلایا جاسکتا۔

ایسے ہی لگہ کسی نے دوسرے کو ایسا زخم پہنچا دیا جو اندر تک
 مہرایت کو گیا یعنی ہیٹ میں خنجر یا لیزہ گھونپ دیا یا سینہ میں
 برچی ملو دی اور وہ اندر تک پہنچ گئی یا کمر اور معدہ میں چاقو
 مار دیا جو اندر تک پہنچ گیا۔ اور وہ خلاف معمول کچھ عرصہ بعد
 اچھا ہو گیا تب بھی قصاص (بدلہ) کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا
 کیونکہ ایسے زخم عموماً اچھے نہیں ہوا کرتے بلکہ جان لیوا ثابت
 ہوتے ہیں۔ اگر مجرم کو ایسا ہی زخم لگا یا گیا تو زیادہ تر اسی کا
 احتمال ہے کہ وہ اس زخم سے مر جائے گا۔ چونکہ مجروح اچھا
 ہو گیا ہے اس لئے مجرم کو سزا دے موت تو نہیں دی جاسکتی۔
 کوئی ضروری نہیں کہ مجرم بھی اس زخم سے اچھا ہو جائے۔
 لہذا دیت پر فیصلہ کرنا ہو گا۔ مجرم کو اتنا ہی زخم پہنچایا
 جاسکتا ہے جتنا اس نے مجروح کو پہنچایا ہے۔ اسے ایسا زخم نہیں
 پہنچایا جاسکتا جس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔

کسی لوٹے یا ناقص البید شخص | اگر کسی آدمی نے جس کا
 ہاتھ شل ہے یا اس کا ہاتھ ناقص ہے یعنی اس
 نے اچھے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا | اگر کسی آدمی نے جس کا
 کی کچھ انگلیاں کٹی ہوئی ہیں ایک ایسے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا جو
 تندرست ہے تو جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے یا تو مجرم کا ناقص ہاتھ
 ہی کاٹنے پر راضی ہو جائے یا اس کی دیت لے لے اسے دونوں
 باتوں کا اختیار ہے۔ اس کی رضامندی کے مطابق حاکم وقت
 فیصلہ کر سکتا ہے۔

قتل عمد میں قصاص حق حکومت ہے | ہمارے حضرات

نے فرمایا ہے کہ اگر قاتل اور اولیاء مقتول میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور جس مقدار مال پر مصالحت ہوئی ہے وہ قاتل کو ادا کرنا ہوگا۔ مال کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو، اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ حضرات فقہاء کرام نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ
فِي الْقَتْلِ ط أَلْحَوْا بِالْحَيِّ وَالْعَبْدَ بِالْعَبْدِ
وَالْأَنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ
شَيْعٌ فَأَتْبَاعُهَا لِمَعْرُوفٍ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ
بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ
فَمَنِ احْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

(۱۱۱)

ترجمہ :- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر مقتولین کے بارے میں بدلہ (جانی یا مالی) فرض کر دیا گیا ہے اگر لڑکی جگہ وہی آزاد، غلام کی جگہ وہی عورت کی جگہ وہی عورت (جس نے قتل کا ارتکاب کیا ہے) قتل کیا جائے گا۔ تو جسے (مالی بدلہ میں) اس کے بھائی (ولی مقتول) کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے تو دستور کے مطابق اس کا پیچھا کرنا اور حسن کارنامہ انداز

میں اس کی ادائیگی کرنا ضروری ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے۔ توجہ شخص اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں قِصَاصٌ کا لفظ قابل غور ہے ”القصاص“ کے باب میں اس کی لغوی تحقیق تفصیل سے بیان کر چکے ہیں وہاں ہم نے بتایا تھا کہ ”قصاص“ کے معنی مطلق بدلے کے ہوتے ہیں۔ بدلہ جانی بھی ہو سکتا ہے اور مالی بھی اور یہ دونوں بدلے ”قصاص“ کے مفہوم میں داخل ہیں بلکہ ہم نے مفرداً راعب سے نقل کیا تھا کہ انہوں نے قِصاص کے معنی خون کے پیچھے خوں بہا (مالی بدلہ اور دیت) ہی کے کئے ہیں۔ لہذا قِصاص کے مفہوم میں مالی بدلہ بھی داخل ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسانی جان غیر متجزی اور غیر منقسم ہے جس کے اجزاء نہیں ہو سکتے البتہ مالی بدلہ متجزی اور منقسم ہے۔ یعنی اس کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ لہذا قِصَاصٌ لَدُنْكَ مِنْ آخِذٍ شَيْءٍ سے مراد مالی بدلہ ہی ہو سکتا ہے جانی بدلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جاتے سے واضح ہے کہ جانی بدلہ میں سے کچھ معاف کر دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جان میں سے کچھ حصہ معاف نہیں کیا جاسکتا البتہ مالی بدلہ میں سے کچھ معاف کیا جاسکتا ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطاء۔ قتل عمد میں قاتل کو قتل کیا جاتا ہے یعنی مقتول کا جانی بدلہ اس کے ورثاء کو دلایا جاتا ہے۔ اور قتل خطاء میں مقتول کے ورثاء کو مقتول کا مالی بدلہ یعنی دیت (خون بہا) دلایا جاتا ہے۔ لہٰذا فَمَنْ عَفَىٰ لَهُ، مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ قتل عمد سے متعلق نہیں ہے بلکہ قتل خطاء سے متعلق ہے۔ قتل خطاء میں دیت واجب ہوتی ہے جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ مقتول کے ورثاء میں کوئی وارث اپنا حصہ معاف کر سکتا ہے۔ یا تمام ورثاء دیت کی رقم میں سے کچھ رقم معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آدھی جان، تہائی جان اور چوتھی جان معاف نہیں کی جاسکتی۔

امام ابو بکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ:-
اور ابن عباسؓ سے مروی ہے جس کی سند ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قتل عمد میں قتل کیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف کر دے۔ اور سلیمان ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ عمر ابن الخطابؓ سے حد ثنا عبد الباقي بن قانع قال حد ثنا موسیٰ ابن زکریا التستری قال حد ثنا سهل بن عثمان العسکری ابو معاویۃ عن اسفعل بن مسلم عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(احکام القرآن ۱۵۹/۲ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ ۱۳۳۷ھ)

دینار نے بیان کیا طاؤس سے انہوں نے ابن عباس سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص انبؤہ میں قتل کر دیا جائے اور قاتل معلوم نہ ہو یا تیرا فگنی میں یا خشت باری میں پتھر، کوڑے یا لالٹھی سے مارا جائے تو اس کی دیت قتل خطاء کی دیت ہوگی اور جو عمداً قتل کیا جائے تو جان لی جائے گی۔ پھر جو شخص قاتل اور وراثہ مقتول کے درمیان روک بن جائے (اور قاتل کو قتل نہ کرنے دے) تو اس پر اللہ کی اور ملائکہ کی اور تمام آدمیوں کی لعنت برے گی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حدیثوں میں بتلایا ہے کہ قتل عمد میں واجب صرف قَوْد (قتل کرنا) ہی ہے۔ اور اگر وراثہ کو دیت لینے کا بھی اختیار ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیت کا بیان کئے بغیر صرف قَوْد (قتل کرنے) کے بیان پر اکتفا نہ فرماتے۔ کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ مقتول کے وارث کو دو چیزوں (قتل اور خوں بہا) میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا حق ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیت کا بیان نہ فرمائیں اور صرف قَوْد (قتل) کے بیان پر اکتفا فرمائیں۔ کیونکہ اس سے تو اس تخمیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد اس میں تخمیر کو بھی قبول کر لیا جائے تو وہ پہلے حکم کا نسخہ ہوگا۔

(احکام القرآن ص ۱۶۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ
 انسانیہ کیلئے پیدا
 آف ریلمین اینڈ

ایتھاکس بائی جیمس ہیٹنگز جلد چہارم باب کراٹمز اینڈ پینٹمنٹ
 کے حوالہ سے اصل یہودی کتب سے ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں
 کہ

یہودیوں میں قصاص تھا، دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے
 جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے
 دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون
 رائج تھا۔ قتل عمد اور قتل خطا میں فرق نہیں کیا جاتا تھا
 چونکہ یہودیوں میں قتل عمد اور قتل خطا میں کوئی فرق
 نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے دونوں میں فرق کیا۔ قتل عمد
 میں قود (قتل) اور قتل خطا میں دیت کی اجازت مرحمت
 فرمادی۔ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے ایک
 تخفیف اور رحمت تھی کہ اس نے قتل خطا میں تخفیف فرمادی
 اور دیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ سہولت بنی اسرائیل
 کو حاصل نہیں تھی۔ ان کے ہاں قتل میں صرف ایک ہی سزا
 — قود — یعنی قتل کر دینا تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے
 حضرت ابن عباس کی روایت

ایک روایت نقل کی جاتی ہے جسے شیخ الاسلام امام ابوبکر
 جمصاص رازی نے بھی نقل کیا ہے۔ حد شاعبد الباقی بن

قانع قال حدثنا الحمیدی قالہ حدثنا سفیان الثوری
 قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت مجاہد یقول
 سمعت ابن عباس یقول (کی سند کے ساتھ) بنی اسرائیل
 میں قصاص (قَوْدَ یعنی قتل) کا حکم تھا اور ان میں دیت
 نہیں تھی۔ تو حق تعالیٰ نے اس امت سے فرمایا۔ ”اے
 پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین
 کے بارے میں“ اپنے اس ارشاد تک۔ ”تو جسے اس کے
 بھائی کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے“

ابن عباسؓ نے کہا۔ ”عفو یہ ہے کہ وہ قتلِ عمد میں
 دیت کو قبول کرے“ اور یہ کہ۔ ”اور دستور کے مطابق
 اس کا پیچھا کرنا ہے اور حسن سلوک کے ساتھ اسے دیت
 ادا کرنی ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تحقیف اور
 رحمت ہے (اس میں جو تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا) تو
 جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب
 ہے۔“ ابن عباسؓ نے کہا کہ یعنی دیت قبول کر لینے کے
 بعد قتل کر دے“

راحکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۲۶ مطبوعہ مطبعہ

(بہیہ مصریہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب
 یہ ہے کہ قتلِ عمد میں بنی اسرائیل کے لئے صرف قَوْدَ یعنی قتل
 کا حکم تھا اور امتِ محمدیہ پر حق تعالیٰ نے یہ سہولت فرمادی کہ

قاتل کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے اور اس سے دیت (خون بہا) بھی لی جاسکتی ہے اگر مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا غالباً یہ خیال تھا کہ قتل خطا میں بنی اسرائیل کے لئے بھی دیت کی سہولت موجود تھی لیکن قتل عمد میں دیت کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اور قرآن کریم کے ارشاد ذیلہ تَخْفِیْفٌ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَرَحْمَةٌ مِّنْ رَبِّکُمْ سے مراد یہ ہے کہ امت محمدیہ کو قتل عمد میں بھی اگر ورثاء راضی ہو جائیں دیت (خون بہا) کی سہولت عطا فرمادی گئی۔ اسی بات کی طرف حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے تخفیف اور رحمت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خود تو اسرائیلی کتب کے عالم نہیں تھے۔ انہوں نے کعب الاحبار وغیرہ جیسے علمائے بنی اسرائیل سے معلومات حاصل کیں اور انہی معلومات کو بیان فرمادیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ معلومات صحیح نہیں تھیں یہودیوں میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے وہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم تو نہیں تھے۔ مگر یہودی ہونے کی وجہ سے مسلمان ان کی باتوں پر اعتماد کر لیتے تھے۔ ان یہودی علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو غلط معلومات بہم پہنچائیں خواہ قصداً خواہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اور چونکہ وہ بظاہر مسلمان تھے اس لئے ان پر اعتماد کر لینا اور ان کی معلومات کو صحیح سمجھ لینا کچھ مستبعد نہیں تھا۔ لیکن اس ذرا سی

غلط بیانی نے ملاحظہ فرمائیے ، مسئلہ کو کس قدر الجھا دیا ہے۔
 ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۚ کا تقاضا یہ تھا کہ بنی اسرائیل
 کے مقابلہ میں امت محمدیہ کو سہولت بہم پہنچا نا حق تعالیٰ کا ارشاد
 ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو سہولت
 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بتائی گئی اس سے مسئلہ کی
 نوعیت ہی بدل گئی۔ حق تعالیٰ نے جو تخفیف اور رحمت فرمائی
 تھی وہ تو یہ تھی کہ قتل خطار میں بنی اسرائیل کے لئے دیت
 کی سہولت موجود نہیں تھی وہ امت محمدیہ کو عطا فرمادی گئی
 لیکن بتانے والے نے یہ بتایا کہ قتل عمد میں بھی دیت کی سہولت
 دیدی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خون مسلم کو وہ اندازنی حاصل
 ہو گئی جو حق تعالیٰ کا مقصد نہیں تھا اور مال دار اور دولت مند
 آدمیوں کے لئے کچھ مشکل نہ رہا کہ وہ جسے چاہیں قتل کر دیں اور
 مقتول کے ورثاء کی عزت اور ناداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
 گمراہانہ رقوم کی پیشکش کر کے ستراسے بچ جائیں۔ البتہ اگر قاتل
 غریب ہے تو وہ تختہ دار پر چڑھا دیا جائے۔ خیال تو فرمائیے
 کہ یہ بات حق تعالیٰ کا مقصد کیسے ہو سکتی ہے۔ اور اس سے
 عدل و انصاف کے تقاضے کہاں تک پورے ہو سکتے ہیں۔ اگر
 قانون کی حکمرانی کا یہی تصور ہے کہ دولت مند اپنی دولت
 کے بل بوتے پر انصاف خرید سکتے ہیں اور تختہ دار پر چڑھنے
 کے لئے صرف غریب اور نادار لوگ ہی ہیں تو ایسے طرز عمل کو
 قانون کی حکمرانی کہنا حق و انصاف کا منہ چرانا نہیں تو یہ اور

کیا ہے۔

اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایٹھکس کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ اس کی بیان کردہ تفصیلاً اصل (اور سخیل) مآخذ پر مبنی ہیں اور اس کے تفصیلات دینے والے خود بھی اپنے مضامین میں سند (AUTHORITY) ہوتے ہیں۔ جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ انہیں یہ معلومات کس یہودی سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ عالم آدمی تھا یا عامی آدمی تھا۔

اس یہودی تفصیل کے بعد اس مسئلہ پر غور فرمائیے جو ہم نے ہدایہ سے نقل کیا ہے۔ اس مسئلہ کو دوبارہ سامنے لے آئیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ

”اگر قاتل اور مقتول کے اولیاء میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص (بدلہ) ساقط ہو جائے گا اور مال کی جس مقدار پر مصالحت ہوئی ہے، وہ قلیل مقدار ہو یا کثیر ہو وہ قاتل کو ادا کرنی ہوگی۔ اس کی پابندی ضروری ہے؟“

(۱) اس کا مطلب ایک تو یہ ہوا کہ مال دار آدمی اپنی دولت کے بل پر سزا سے صاف بچ سکتا ہے اور صرف نادار غریب لوگ ہی سزایاب ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ خون مسلم کی ذمہ داری حکومت کی کچھ بھی نہیں یہ مقتول کے وراثت کا حق ہے۔ وہ جسے چاہیں معاف کر دیں اور جس سے چاہیں اپنے مقتول کے خون کا سودا کر لیں۔ حکومت

مجبور ہے کہ وہ مقتول کے ورثہ کی مرضی کے تابع فیصلے کرے
 حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ آیت کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے
 ”اے پیروانِ دعوتِ اسلامی! مقتولین کے بارے میں ،
 تم سب پر قصاص فرض کیا گیا ہے“ — یعنی اس حکم کی مخاطب
 پوری جماعت مؤمنین ہے۔ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ہے۔
 یعنی حکومت ہے۔ قصاص (بدلہ) لینا مقتول کے ورثہ کا فریضہ
 نہیں بلکہ حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے جس کی ادائیگی
 حکومتِ اسلامیہ کو کرنی ہے لیکن اس روایت ابن عباسؓ
 نے حکومت کے تمام اختیارات مقتول کے اولیاء کو سونپ
 کر حکومت کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ یہ عجیب صورت حال
 ہے کہ جس پر قرآن کریم ایک فریضہ عائد کر رکھا ہے اسے کوئی
 اختیار نہ ہو بلکہ اختیارات اسے ہوں جس کا فریضہ نہیں ہے۔
 رہ گئی وہ دونوں روایتیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ
 عنہ سے ابو بکر جصاص رازیؒ نے نقل فرمائی ہیں اور جس میں
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ الفاظ منسوب فرمائے
 گئے ہیں کہ ”قتل عمد میں قتل ہی کیا جائے گا بجز اس
 صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف فرمادے“ — اس روایت
 میں یہ ٹکڑا کہ ”بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف
 کر دے“ — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا قول معلوم
 ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر روایتیں مرسل

ہیں۔ کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بہت کم سن تھے۔ انہوں نے زیادہ تر روایات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنیں۔ بلکہ دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سن سن کر بیان کی ہیں۔ ایک روایت جو ان سے اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہے وہ بھی کسی ایسے صحابی سے مروی ہے جو فی الحقیقت یہودی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے۔ یہودیت سے اسلام کی طرف آنے والے صحابہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم نہیں تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ دونوں روایتیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کس صحابی سے سنی تھیں۔ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ یہ روایتیں بھی انہوں نے کسی ایسے ہی صحابی سے سنی ہوں گی جو یہودی کتب کے عالم نہیں تھے اور انہوں نے ایک غلط بات اپنی لاعلمی کی وجہ سے بیان کر دی ہو۔ نیز یہ بھی امکان ہے کہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب جو نیک پچھلی روایت کی وجہ سے یہی تھا کہ قصاص حق حکومت نہیں بلکہ حق وراثتے مقتول ہے اس لئے انہوں نے اپنی معلومات کی بنیاد پر ایسا ہی بیان فرمایا ہو اور بعد کے راویوں نے اسے مرفوع نقل کر دیا ہو۔ یعنی اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دی ہو۔ چونکہ ان روایات میں یہ احتمالات موجود ہیں۔ اس لئے ہمیں ان سے استدلال نہیں کرنا چاہیئے۔

إذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

ترجمہ ۱۔ جب کسی بات میں مخالف احتمال پایا جائے تو اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

هَذَا مَارَأَيْتَهُ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

اگر ورثاء میں کوئی معاف کر دے | مقتول کے ورثاء میں سے اگر وارث

خون معاف کر دے یا اپنے حصہ کے بقدر مال پر صلح کر لے تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور باقی ورثاء کو بھی بقدر ان کے حصص کے دیت میں سے رقم وصول کرنی پڑے گی۔ یہ مسئلہ بھی اسی مسلمہ اصول پر مبنی ہے کہ قصاص حق ورثاء رہے۔ حق مملکت نہیں۔ اگر کسی ایک وارث نے اپنا حق قصاص معاف کر کے ساقط کر دیا یا مال پر صلح کر کے ساقط کر دیا تو باقی ورثاء کا حق بھی ساقط ہو گیا کیونکہ قَوْدُ (جان کے بدلے جان) کی تجزی یعنی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کی کمزوری ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک قَوْدُ (یعنی جان کے بدلے جان) کا قانون اور اس کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ مقتول کے ورثاء کی نہیں ہے۔ مال کی کسی مقدار پر صلح یا معافی (خصوصی حالات میں) حکومت ہی کر سکتی ہے ورثاء نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے دلائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں اور فقہاء کے دلائل پر بحث کر چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر کوئی جماعت کسی کو قتل کر دے | اگر لوگوں کی ایک جماعت کسی ایک

آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے (قَوْد) میں پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چونکہ مقتول ایک فرد واحد ہے تو اس کے بدلے میں ایک آدمی ہی کو قتل کیا جائے باقی کو رہائی مل جائے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے اپنے مؤطا میں اور امام شافعیؒ نے اپنی مسند میں امام مالک عن یحییٰ ابی سعید ابن المسیب کی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پانچ یا سات آدمیوں کو ایک آدمی کے بدلے (قَوْد) میں قتل فرمادیا تھا جسے انہوں نے خفیہ طور پر قتل کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر اس کے قتل میں تمام صنعاء کے باشندے شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ اس روایت کو دارقطنی نے بھی مغیرہ ابن شعبہ عن اسعد بن زرارہ بن جمرہ اور طبرانی نے بھی نقل کیا ہے نیز امام بخاری نے عن نافع عن ابن عمرؓ اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے نیز ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

(دیکھیے درایہ بر حاشیہ ہدایہ ص ۵۷۲ مطبوعہ کلام کمپنی

کراچی)

ہمارے ناقص خیال میں فقہاء کا یہ مسلک قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ کیونکہ جرم قتل میں سب شریک ہیں اور ان سب کو سزا ملنی چاہیے۔

کسی ایک آدمی نے جماعت کو قتل کر دیا اگر کسی ایک

پوری ایک جماعت کو قتل کر دیا اور اس سب کے ورثے نے حکومت سے فریاد کی تو ان سب کے بدلے (قود) میں قاتل کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مثلاً دس آدمیوں کے بدلے میں صرف ایک قاتل کے قتل کو ناکافی سمجھا جائے اور مقتولین کے ورثہ کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دلایا جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی مقتولین کے بدلے میں اس سے ہر ایک کا خوں بہا وصول کیا جائے گا جو باقی مقتولین کے ورثہ کو دلایا جائے گا اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلا مقتول کون تھا تو قاتل کو تمام مقتولین کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور سب مقتولین کی دیتیں بھی وصول کی جائیں گی جو سب میں مساویانہ تقسیم کر دی جائیں گی یا قرعہ اندازی کی جائے گی جس کے نام کا قرعہ نکل آیا اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی کو دیتیں دلوائی جائیں گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ قتل کرنے والا ایک آدمی ہے اور مقتول ایک جماعت ہے لہذا ایک جماعت کے بدلے میں جب ایک ہی آدمی کو قتل کیا جائے تو مماثلت نہیں پائی گئی۔ حالانکہ قصاص میں مماثلت ضروری ہے اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ قاتل اگر جماعت ہو اور مقتول ایک ہی آدمی ہو تو ایک مقتول کے بدلے میں جماعت کو قتل کر دیا

جاتا ہے تو ماثلت تو وہاں بھی نہیں پائی جاتی تو امام شافعیؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہاں حکم شرعی (حضرت عمرؓ کے ارشاد) کی بنا پر قیاس کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے عکس کے لئے کوئی حکم شرعی موجود نہیں ہے۔ لہذا اس میں قیاس پر عمل کیا جانا چاہیئے۔

حیرت ہے کہ امام شافعیؒ کی طرف یہ مسئلہ کیسے منسوب کر دیا گیا۔ حالانکہ بالکل بدیہی امر ہے کہ ہر مقتول کی طرف سے حکومت الگ الگ مدعی ہے اور ہر دعویٰ قاتل کو قتل کرنے ہی کا ہے لہذا قاتل کا قتل مستقل طور پر ہر جرم کے مساوی اور ماثل ہے لہذا ماثلت پائی جا رہی ہے۔ کوئی دعویٰ بھی قاتل کو قتل کرنے کے سوا کسی اور چیز کا مدعی نہیں ہے۔ لہذا تمام دعوے ایک ہی چیز کے ہیں اور قاتل کو قتل کرنے سے ہر دعوے کی سزا پوری ہو جاتی ہے۔ لہذا ایک ہی قتل سے تمام دعووں کی تکمیل ہو جاتی ہے اور یہ قتل ہر دعوے کے لئے الگ الگ ماثل ہے۔ ہم حنفیہ کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

قاتل اگر اپنی موت سے مر جائے | اگر قاتل عمد کا قاتل قَوْدَ (سزائے موت)

سے پہلے ہی مر جائے تو قصاص ساقط ہو جاتے گا۔ حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قتل عمد میں قَوْدَ (سزائے موت) اور دیت دونوں میں سے ایک لازم تھی۔ قَوْدَ (سزائے موت) تو ساقط ہو گئی لیکن اس کا بدل یعنی دیت ساقط نہیں

ہوتی لہذا قاتل کے ورثہ سے دیت وصول کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک حنفیہ کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ قتل عمد میں صرف قَوْد واجب ہوتی ہے اور قتل خطا میں صرف دیت۔ چونکہ قَوْد (سزائے موت) کا محل باقی نہیں رہا اس لئے قصاص ساقط ہو گیا۔ تفصیل پہلے گزری چکی ہے۔

اگر دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا | اگر دو آدمیوں

کا ہاتھ کاٹ دیا تو فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ ہاتھ کی دیت دلائی جائے گی اور دونوں نصف نصف دیت ادا کریں گے۔ کیونکہ کسی ایک نے بھی پورا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ ہاتھ کا کچھ حصہ ہر ایک نے کاٹا ہے۔ لہذا قطع ید کا مکمل جرم کسی ایک سے بھی سرزد نہیں ہوا کہ بدلہ دلایا جائے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اعضائے انسانی کا حکم نفس انسانی کے تابع ہے۔ اگر دو آدمی مل کر کسی کو قتل کر دیں تو دونوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ لہذا دو آدمی اگر ہاتھ کاٹتے ہیں تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ ہمارے نزدیک امام شافعی کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ حنفیہ کا یہ فرمانا کہ قطع ید کا جرم کسی ایک سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا قابل قبول نہیں۔ کیونکہ قتل کی صورت میں جب دو آدمی مل کر کسی کو قتل کریں تو بھی یہی کچھ کہا جاسکتا ہے کہ قتل جرم کسی ایک

سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں قاتلوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

کسی نے کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی مر گیا | کسی نے ایک آدمی پر گولی چلائی اور وہ مر گیا لیکن اس

کے ساتھ ہی گولی کسی دوسرے آدمی کو بھی لگ گئی اور وہ بھی مر گیا۔ تو جس شخص پر اس نے عمداً گولی چلائی تھی اس کے بدلے میں اسے قَوْد (جان کے بدلے جان) میں قتل کیا جائے گا اور جس کو ساتھ ہی گولی لگ گئی اور وہ مر گیا اس کے لئے اس سے دیت وصول کی جائیگی۔ کیونکہ یہ قتل خطا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اس نے شکار پر گولی چلائی اور وہ کسی آدمی کو لگ گئی اور وہ مر گیا تو یہ قتل خطا ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں دونوں قتل، قتل عمر ہیں۔ اور دونوں کے بدلے اسے قتل ہی کیا جائے گا۔ دوسرے آدمی کے لئے اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ غور فرمائیے کہ اگر یہ صورت پیش آجائے کہ زید نے عمرو پر عمداً گولی چلائی اور وہ عمرو کو نہیں لگی بلکہ بکر کو لگ گئی تو کیا اسے قتل خطا کہا جائے گا؟ اور قاتل کو قَوْد (جان کے بدلے جان) میں قتل نہیں کیا جائے گا اور صرف دیت دلائی جائے گی۔ اس طرح تو قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا کہ جس کو جی چاہے گولی مار دیجیئے اور کہہ دیجئے کہ میں تو فلاں آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن غلطی

سے فلاں کو لگ گئی۔ لہذا یہ قتل خطا ہے۔ میں دیت ادا کروں گا۔ مجھے قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا۔

شکار کی مثال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ شکار پر گولی چلانا جرم نہیں ہے اور کسی انسان پر عمداً گولی چلانا جرم ہے۔ شکار کی صورت میں گولی چلانے والے نے عمداً جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ گولی کسی آدمی کو لگ گئی۔ تو مال اور نتیجہ جرم بالخطا ہوا۔ لیکن صورت مذکورہ میں ارتکاب جرم عمداً ہوا ہے۔ گولی کسی دوسرے کو لگ جانا امر دیگر ہے۔ فاعل (یعنی قاتل) قتل عمد کا مجرم ہوا ہے۔ البتہ مقتول (یعنی مفعول) قتل خطا کا نشانہ بنا ہے۔ قاتل کو اپنے فعل کی سزا ملتی ہے اور ملنی چاہیے۔ کیونکہ مقتول بالخطا کی وجہ سے قاتل بالعمد قاتل بالخطا نہیں بن سکتا۔ فاعل کو اپنے فعل کی وجہ سے سزا ملتی ہے۔ مفعول کی وجہ سے نہیں۔

قصاص عثمان ذی النورین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

(تاریخ اسلام کا وہ ہنگامہ خیز قانونی مسئلہ جو خلیفہ سوم کے ۱۸ ذی الحجہ کو مظلومانہ قتل کے بعد پیش آیا)

تمام مہذب دنیا کا یہ اصول ہے اور مسلمہ اصول ہے کہ کسی بھی حکومت کے حسن و قبح کا معیار یہ ہے کہ اس کے دور میں قانون کو بالادستی حاصل ہتی یا نہیں۔ اگر کسی حکومت کے عہد میں قانون کی حکمرانی ہتی تو وہ ایک بہترین حکومت ہے اور اگر اس کے عہد میں قانون کو بالادستی حاصل نہیں ہتی تو ایک بدترین حکومت کا مصداق ہوگی۔

اسلام جس بنیاد پر اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران، راعی اور رعایا، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص، سب اس کے تابع ہیں۔ کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں۔ اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔ دوست ہو یا دشمن، حربی کافر

ہو یا معاہدہ، مسلم رعیت ہو یا غیر مسلم، مسلمان وفادار ہو یا باغی برسر جنگ، عرض جو بھی ہو۔ شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے۔ جس سے کسی حال میں بھی انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ مَعًا
بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْعَلْ مَنكُمْ شَنَاٰنًا قَوْمٍ عَلَىٰ آٰنٍ
لَّا تَعْدُوا دِيَارَهُمْ تَوَافَتْ هِيَ آبَدًا وَلِلْقَوَّامِينَ
(۵)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم اللہ کے لئے
کاربرِ آراء اور انصاف کے ساتھ نگرہاں بنو۔ تمہیں کسی
قوم کی عداوت نا انصافی پر برا لگینے نہ کرے۔ انصاف
ہی کرو۔ یہی امر تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ مَعًا
بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْعَلْ مَنكُمْ شَنَاٰنًا قَوْمٍ عَلَىٰ آٰنٍ
لَّا تَعْدُوا دِيَارَهُمْ تَوَافَتْ هِيَ آبَدًا وَلِلْقَوَّامِينَ
وَلِئَلَّا يَهْمَاكُمْ فَلَا تَتَّبِعُوا النُّعُوٰى أَن تَعْدُوا لَهُ
وَأَن تَقْتُلُوا أَوْ تَعْرِضُوا فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا تَعْمَلُونَ
خَيْرًا ۝ (۱۴۵)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم انصاف کے
ساتھ کاربرِ آراء اور اللہ کے لئے نگرہاں بنو، خواہ یہ (نگراں)

خود تمہاری اپنی ذات یا والدین یا قریب ترین عزیزوں کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔ اگر وہ مال دار یا فقیر ہے تو ان دونوں کا اللہ زیادہ خیر خواہ ہے۔ لیکن تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ انصاف سے روگردانی کرنے لگو اگر تم زبان کو ملو گے یا اعراض کرو گے تو د جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔

عدل و قسط کا یہی تقاضا ہے کہ ہر حال میں قانون کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ اپنی قوانین میں ایک قصاص کا حکم بھی ہے۔ قرآن کریم نے اس کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ○ (۲۹)

ترجمہ :- عقل و شعور رکھنے والو! قصاص (بدلہ) چکانے ہی میں تمہاری حیات مضمر ہے اور یہ حکم اس لئے ہے کہ تم قانون الہی سے ہم آہنگ رہ سکو۔

یوں تو قصاص (بدلہ چکانا) فریضۃ الہی ہے جو قرآن کریم نے امت اسلامیہ پر فرض قرار دیا ہے۔ نہ صرف امت اسلامیہ پر بلکہ امم سابقہ پر بھی یہ اسی طرح فرض تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ أَلْحُسُّ بِالْحَسِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ جُسُوعُ الْقَتْلِ

مِنْ زَيْكُمُ وَرَحْمَةً مِّنْ عَمَلَيْكُمْ بِمَا قَاتَلْتُمْ بِحُدُودِ اللَّهِ
فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۲۷)

ترجمہ :- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے
بارے میں تم پر قصاص (بدلہ چکانا) فرض کیا گیا ہے۔ (قتل
عمد میں) وہی آزاد آدمی اسی آزاد قاتل کے بدلے میں
قتل کیا جائے گا اور وہی غلام اسی غلام قاتل کے بدلے
میں اور وہی عورت اسی قاتل عورت کے بدلے قتل کی
جائے گی۔ (اور قتلِ خطا میں) توجو اسے اس کے بھائی
نے کچھ معاف کر دیا ہو تو دستور کے مطابق (دیت یعنی
خون بہا وصول کرنے کے لئے) اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ اور
حسن سلوک کے ساتھ اسے ادائیگی کرنی ہوگی (قتل
خطا میں) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف
اور رحمت ہے۔ توجو اس تخفیف کے بعد زیادتی (کر کے
قاتل کو قتل) کرے گا تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور

وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ
بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْمَ قِصَاصًا ۝ (۲۸)

ترجمہ :- اور ہم نے اُن (بنی اسرائیل) پر اس
(تورات) میں بھی فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ
کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے

کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص
(بدلہ چکانا) ضروری ہے۔

علاوہ ان عام اصولی احکام کے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کی مزید تصریحات بھی موجود ہیں جن سے اس قصاص کی اہمیت اور فرضیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان تصریحات کا تذکرہ ہم آگے کریں گے بہر حال قصاص صرف امت مسلمہ پر ہی نہیں بلکہ امم سابقہ پر بھی فرض تھا۔ شریعت اسلامیہ نے قتل کے سلسلہ میں یہی قانون مقرر کیا ہے کہ قاتل کو (اگر اس نے عمدہ قتل کیا ہے تو اسے) قتل کیا جائے گا۔ اور اگر یہ جرم اس سے غلطی سے سرزد ہو گیا ہے۔ اس کے قصد و ارادہ کا اس میں دخل نہیں تھا تو اسے دیت یعنی خون بہا ادا کرنا ہو گا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ
فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۚ وَمَنْ أَحْيَاهَا
فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۖ (۵۴)

ترجمہ:- جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جو کسی کو زندہ رہنے دے تو گویا اس نے پوری انسانیت کو حیاتِ نو عطا کر دی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قوموں کے عروج و زوال کی اصل وجہ قانون ہی سے ان کے تعلق یا بے تعلق کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

حدثنا سعيد بن سليمان قال حدثنا الليث
عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة أن قریشا
أَهَمَّتَهُمُ الْمَرْأَةُ الْمَخْزُومِيَّةُ الَّتِي سَرَقَتْ قَالُوا
مَنْ يَكْلَمُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ
يَجْتَوِي عَلَيْهِ الْأَسَامَةَ ابْنَ زَيْدٍ حَبِيبِ رَسُولِ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَلَّمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اتَّشَفَعْ فِي حَدِّ مَنْ حَدَّوْهُ
اللَّهُ ثُمَّ قَامَ فَخَطَبَ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا
ضَلَّ مِنْ قَبْلِكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ الشَّرِيفُ
تَرَكُوهُ وَإِذَا سَرَقَ الضَّعِيفُ فِيهِمْ أَقَامُوا
عَلَيْهِ الْحُدُودَ وَإِنَّمَا اللَّهُ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ
سَرَقَتْ لَقُطِعَ مُحَمَّدٌ بِهَا۔

(بخاری کتاب الحدود ص ۳۳۳ مطبوعہ مطبعہ مجتبیٰ دہلی)

ترجمہ :- سعید بن سلیمان نے (اپنی سند کے ساتھ)
حضرت عائشہؓ سے حدیث بیان کی کہ قریش کو اس مخزومی
عورت نے بڑی فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کر لی تھی۔
انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس
بارے میں) کون بات کر سکتا ہے۔ سوائے اسامہ ابن زیدؓ

کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے محبوب ہیں اور کون جبرأت کر سکتا ہے۔ چنانچہ (انہوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی اور) اسامہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بات کی تو آپ نے فرمایا۔ کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد میں سفارش کر رہے ہو؟ پھر آپ کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! تم سے پچھلی امتوں کے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ جب ان میں شریف آدمی چھدی کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چھدی کرتا تو اس پر حدیں قائم کر دیتے اور اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (اعاذ اللہ من ذلک ورضی عنہا) چوری کرے تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دے گا۔

اس تمام صورت حال کے پیش نظر قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مسئلے پر غور فرمائیے جو نہ صرف ایک انسان کا ایک مسلمان کا، ایک صحابی کا، بلکہ صحابہ کرام کے سربراہ اور خلیفہ کا قتل ہے، بغیر کسی وجہ کے قتل ہے۔ مرکز اسلام مدینہ منورہ میں، روضہ رسول کے سایہ میں قتل ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے روزہ دار کا قتل ہے، انتہائی وحشیانہ دہندگی کے ساتھ قتل ہے۔ ان وجوہات سے خون عثمانؓ کے قصاص کی اہمیت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ سب سے پہلا خون ناحق ہے جس کا قصاص لینے میں ایک طبقے کی طرف سے کمزوری کا اظہار کیا گیا۔ ورنہ اس

وقت تک کبھی اس قسم کے معاملے میں ذرا سی بھی نرمی اختیار نہیں کی گئی تھی تو اس معاملے کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور تاریخ اسلام اس کی گواہی دیتی ہے کہ یہی وہ کمزوری تھی جس کے نتیجے میں ملت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوئی اور اس کمزوری نے جسد اسلام میں جو زخم ڈالے وہ آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ اللہ اور اس کے رسول نے قصاص نہ لینے کے جو بد نتائج بتائے تھے وہ پوری طرح سامنے آئے اور آج تک مسلمان انہیں بھگت رہے ہیں اور جب تک وہ اس کمزوری کا اعتراف نہیں کریں گے اور آئندہ کے لئے اس سے بچنے کا مصمم ارادہ نہیں کریں گے اس وقت تک وہ ان بد نتائج کے اثرات میں مبتلا رہیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے المناک ترین سانحہ فاجعہ کو ہمارے محدثین اور مؤرخین نے جس سبائی ذہنیت (مجوسیت، عیسائیت، یہودیت) کی منظم سازش کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بیان کیلئے اس پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے، آپ کی سیرت طیبہ کو مسخ کرنے اور آپ کے فضائل کو چھپانے میں سبائیہ فرقہ کے مؤرخین نے یہاں تک تعصب اور بغض سے کام لیا ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات حضرت سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیٹیاں ہونے تک سے انکار کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ ان کو اس کا بھی پائل

نہیں ہوا کہ قرآن مجید کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے جس میں اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کا ذکر وَبَنَاتِکَ (۲۳۹) یعنی آپ کی بیٹیاں (بصیغہ جمع) کہہ کر فرمایا ہے جو ظاہر ہے کہ جمع کا صیغہ ہے اور ایک سے زیادہ صاحبزادیوں کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے۔

ان کو اس کا بھی خیال نہیں ہوا کہ کل کو میدانِ حشر میں جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش ہوں گے تو اس سفید جھوٹ کا کیا جواب دیں گے۔ ان دشمنانِ اسلام کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ”ذوالنورین“ اتنا کھلتا ہے کہ وہ اس لقب کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے چھین تو نہیں سکے لیکن اپنے پروپیگنڈے سے وہ اسے مشکوک بنادینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

تمام صحابہ کرام کے فضائل و مناقب کے تذکرے کتب حدیث کی زینت ہیں، حدیث کی ان تمام کتابوں کو ضائع کر کے ان کو دریا برد کر کے، انہیں جلا کر خاک کر کے ملیا میٹ کیا جاسکتا ہے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کے وہ آثار بھی ہیں جنہیں مٹایا نہیں جاسکتا۔ مدینہ منورہ کا بڑرومہ، مدینہ منورہ کی مسجد نبوی، مکہ مکرمہ کی مسجد حرام، غزوہ تبوک، بیعت رضوان اور مصاحف عثمانی۔ جب تک اس دنیا کے صفحاتِ ارضی پر موجود ہیں۔ اور وہ انشاء اللہ تا قیامت باقی رہیں گے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب و

فضائل کی زندہ یادگاریں ثابت ہوں گے۔

بالخصوص جب تک اس دنیا میں قرآن کریم موجود ہے۔
اور وہ انشاء اللہ ہمیشہ موجود رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت
کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس میں سورۃ فتح کی وہ آیات
کریمہ جو بیعت رضوان کے بارے میں ہیں جب تک ان کی تلاوت
ہوتی رہے گی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی گواہی
ہر فرد بشر، ہر جن وانس ہر کہ دمہ دیتا رہے گا۔

غضب نویس ہے کہ سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کے طلب قصاص کے واقعہ کو بھی خواہ مخواہ طالبانِ قصاص
(ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر بن
العوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے ذاتی تنازعہ کا رنگ دے کر بیعت الرضوان
کے واقعہ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیعت الرضوان کے واقعہ کو علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی

میں اس طرح بیان کیا ہے:

”اسلام میں فضائل چہارگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم
ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور
احتمال نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ
لئے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف
تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی

جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں ہو۔
 چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر
 تھے۔ ۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ
 میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں۔ یعنی جو قربانی
 کے اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں علامت کے طور پر لوہے
 کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام
 لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے
 ارادے کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے
 آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے
 کہہ دیا ہے کہ محمد مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاری کی
 قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا، وہ جمعیت عظیم لے کر آئے
 مکہ کے باہر بلدح کے ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔
 خالد بن ولید جواب تک اسلام نہیں لائے تھے دو سو سوار لے
 کر جن میں ابو جہل کے بیٹے عکرمہ بھی تھے مقدمۃ الجہش کے
 طور پر آگے بڑھے اور غنیم تک پہنچ گئے جو رایغ اور جحفہ کے
 درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد
 کو طلیقہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غنیم تک آگئے ہیں اس لئے
 کتر کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غنیم تک پہنچ گئی

تو خالد کو گھوڑوں کی گرداڑی نظر آئی۔ وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا۔ لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس عظم بدیل بن ورقاسہ تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے۔ وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ کی عرض سے آئے ہیں۔ لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ معین مدت کے لئے معاہدہ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے باغ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی وہ اگر راہی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے باغ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَآيِدِيَكُمْ
عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ أَعْدَائِهِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ
عَلَيْهِمْ (۲۳)

ترجمہ: اور اللہ ہی نے تو مکہ معظمہ میں تمہارے
ہاتھوں کو ان سے اور ان کے ہاتھوں کو تم سے تمہیں ان
پر کامیابی عطا فرمادینے کے بعد روک دیا تھا۔

بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کا انتخاب
کیا۔ لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں
اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص نہیں کہ مجھ کو بچا سکے لہذا

لے حضرت عمرؓ کے متعلق جو عام طود پر کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا انتخاب
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ان کے معذرت کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ
کا انتخاب عمل میں آیا تیسرے درجہ کی روایت ہے جس کا ذکر صحیحین میں نہیں
ہے۔ یہ روایت نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً صحیح ہے۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب
اس لئے کیا گیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ان کا خاندان ہی حکمران تھا اور وہی معزز
ترین شخصیت تھے جیسا کہ آگے حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آ رہا ہے۔ یہ
کسی شیعہ راوی کی شرارت معلوم ہوتی ہے جس سے اس کا مقصد حضرت
عمرؓ کی توہین ہے اور ان کی بزدلی کا اظہار ہے۔ اگر کسی اور کو منتخب کرنا
ہوتا تو حضرت علیؓ کو منتخب کیا جاتا جن کے خاندان کی اکثریت مکہ معظمہ
میں موجود تھی مثلاً حضرت عباسؓ وغیرہ لیکن چونکہ حضرت علیؓ کی وہ عزت
وعظمت نہیں تھی جو حضرت عثمانؓ کی تھی اس لئے انہیں نہیں بھیجا گیا۔ بخاری
کی ابن عمرؓ والی روایت اس پر بالکل واضح ہے جو آگے آ رہی ہے۔ (مؤلف)

آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طود پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔

تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔

یہ کہہ کر آپ نے ایک بھول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے و لولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتمم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورہ فتح میں اس واقعہ کا اودرخت کا ذکر موجود ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ مَعِيَ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ
السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝

($\frac{18}{48}$)

لے یہ حضرت عثمانؓ کی سفارتی صلاحیتوں کی واضح دلیل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی طرف مسلمانوں کی جواو لین سفارت روانہ فرمائی تھی اس کے قائد بھی حضرت عثمانؓ ہی تھے۔ حبشہ کی طرف دوسری سفارت کے قائد حضرت جعفر طیارؓ تھے۔ (مؤلف)

ترجمہ :- اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ دُخت کے نیچے آپ سے جاں نثاری کی بیعت کر رہے تھے۔ اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس نے مسلمانوں پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں ایک قریبی فتح عطا فرمائی۔

(سیرت النبی ﷺ ج ۱۱-۱۲ ۴۵۴-۴۵۹ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ انڈیا)

قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا مگر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ خود طواف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اجازت ہے مگر محمد کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا :-

”یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو روک دیتے جائیں اور میں خود طواف کر لوں؟“
(حکایات صحابہ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ ج ۱۶ بحوالہ تاریخ خمیس)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ :-
لو کان احد اعز بطن مکة من عثمانؓ لبعثہ
مکانہ فبعثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(صحیح بخاری کتاب بدر الخلق، باب مناقب عثمان)

ترجمہ :- وادی مکہ میں اگر کوئی اور شخص حضرت عثمانؓ سے زیادہ معزز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو

بھیجتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ ہی کو بھیجا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔
 کان عثمانؓ رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم الى مكة فبليح الناس فقال رسول الله
 صلی اللہ علیہ وسلم ان عثمان في حاجة الله
 وحاجة الرسول فضرب باحدى يديه على
 الاخرى فكانت يد رسول الله صلی اللہ علیہ
 وسلم لعثمان خيرا من ايديهم لانفسهم۔
 (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب عثمانؓ)

ترجمہ: عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول
 (سفیر) کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ صحابہؓ نے
 بیعت کر لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
 درحقیقت عثمانؓ اللہ اور رسول کے کام سے گئے ہوئے
 ہیں۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ حضرت عثمانؓ کی طرف
 سے اپنے (اپنے) دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پس حضرت عثمانؓ کے لئے
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک لوگوں
 کے اپنے ہاتھوں سے جنہوں نے خود اپنی طرف سے بیعت
 کی تھی (ہزار درجہ) بہتر تھا۔

شانِ یدِ الہی | ملاحظہ فرمائیے کہ اِدھر تو حضور اکرم صلی اللہ
 علیہ وسلم اپنے دست مبارک کو حضرت عثمانؓ

کا ہاتھ قرار دے رہے ہیں اور اُدھر حق تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو خود اپنا ہاتھ قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد الہی ہے۔

يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (سورہ فتح)

حدیبیہ میں بیعت لیتے وقت اللہ تعالیٰ کا دست قدرت لوگوں کے ہاتھ کے اوپر تھا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو دست رحمت اللہ کی طرف سے بیعت لے رہا تھا وہی دست رحمت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کر رہا تھا تو ذات اقدس واعظم کا جو دست رحمت ”يَدُ اللَّهِ“ تھا، وہی ”يَدِ عَثْمَانَ“ بھی تھا۔ اللہ اکبر! یہ شان عثمان کہ پروردگارِ عالم ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دے رہا ہے اور ”يَدِ عَثْمَانَ“ کو ”يَدُ اللَّهِ“ قرار دے رہا ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ۱۷

۱۷ ایک خاص فرقہ کو قرآن کریم اور اقوال نبوی میں چونکہ تحریف سے شغف ہے اس لئے حیرت نہ ہونی چاہیئے اگر وہ قرآن کریم کے خلاف بد اللہ کا خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عثمانؓ سے چھین کر حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا اسد اللہ کا خطاب جو جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کو ان کے کار ہائے نمایاں پر عطا فرمایا تھا حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا سید الشہداء کا خطاب جو جنگ احد میں شہید ہونے پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا گیا تھا شہید کر بلا حضرت حسینؓ پر چسپاں کر دیں۔ اس فرقہ کی یہ عادت یہی ہے۔ (مؤلف)

پیغمبر انسانیت اور صحابہ کرام کے اس خوش آئند عمل بیعت سے مسرور ہو کر رب کائنات جل و علانے اپنی خوشنودی اور رضا کا اظہار سورہ فتح میں یوں فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۖ
مَدَّ اللَّهُ فَوْقَ آيِدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا
يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ
اللَّهُ فَمِنْهُمْ فَسَيُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۴۵)

ترجمہ :- اے پیغمبر! (قصاص عثمانؓ کے لئے) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر (آپ کا ہاتھ نہیں) اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو (قصاص عثمانؓ کے معاملے میں) جو عہد شکنی کرے گا اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی پر پڑے گا اور جو اللہ سے کئے گئے عہد کو پورا کرے گا تو اللہ اسے بہت جلد بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی | اس بیعت کو حق تعالیٰ نے جو اہمیت عطا فرمائی

ہے وہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ کہ اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ مَدَّ اللَّهُ فَوْقَ آيِدِيهِمْ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے اور پھر مزید یہ بھی کہ فَمَنْ نَكَثَ

فَاِتْمَا يَنْكُتْ عَلٰى نَفْسِهِ وَمَنْ اَذْنٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهِ اللّٰهُ فَيَنْكُتْ
 اَجْبَدًا عَظِيْمًا تَوْجُوْا اِسْ عٰهْدَ كُوْطْرَے گا تو اس كى عٰهْدَ شَكْنِ كَا وَاَل
 خُوْد اِسِ كِ ذَاتِ پَر پُڑے گا اُوْدِ جُو اِنِے اِسْ عٰهْدَ كُوْ فَا كَرِے گا جُو
 اِسْ نِے اَللّٰه سِے كِیَا هِے تُو اَللّٰه اِسِے بَرَّ اِجْر عَطَا فَرَمَانِے كَا يِه پُورِی
 اَیْتِ نِهَا یِتْ هِیْ غُورِ طَلَبْ هِے۔ بیعت كِیْ غِیرِ معمولِیْ اِھْمِیْتِ جُتْلَانِے
 كِے بَعْدِ یِه فَرْمَانَا كِه جُو اِسْ عٰهْدَ كُوْ تُوڑے گا اِسْ كِیْ عٰهْدَ شَكْنِ كَا
 وَاَل خُوْد اِسْ كِیْ ذَاتِ پَر پُڑے گا اُوْر جُو اِنِے عٰهْدَ وَا كَرِے گا
 اِسِے حَقِّ تَعَالٰی اِجْرِ عَظِیْمِ عَطَا فَرَمَانِے گا اِسْ اِعْتِبَارِے اِنْتِهَاسَیْ
 غُورِ طَلَبْ هِے كِه اِسْ وَاَقْعَۃٓ حَیْبِیَّہِ مِیْنِ تُو حَضْرَتِ عُمَاْنِے كِے مُتَعَلَقِ
 یِه اِطْلَاعِ كِه اِنْ كُوْ شَہِیْدِ كَر دِیَا گِیَا هِے غَلَطِ حَقِّی۔ هُو سَكْتَا هِے كِه
 حَضْرَتِ اَكْرَمِ صَلٰی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم كُوْ اِسْ خَبَرِ كَا غَلَطِ هُونَا مُعْلُوْمِ هِیْ
 نِے هُو مَكْرِ اِسْ عَالَمِ الْغِیْبِ وَ الشَّہَادَةِ كُوْ تُو یِه بَاتِ اِجْھِیْ طَرَحِ مُعْلُوْمِ
 حَقِّیْ جِسْ نِے یِه اَیْتِ نَا زَلِ فَرْمَا ئِ حَقِّیْ كِه یِه خَبَرِ غَلَطِ هِے۔ اِسْ اَیْتِ
 كَا تَعْلُقِ صَلَاحِ حَیْبِیَّہِ كِے مَوْقِعِ پَر اَفْوَاہِ قَتْلِ سِے هُو هِیْ نِہِیْنِ سَكْتَا۔
 اَكْرِ اِسْ اَیْتِ كَا تَعْلُقِ وَاَقْعَۃٓ حَیْبِیَّہِ كِے اَفْوَاہِ قَتْلِ سِے هُو تَا تُو
 حَقِّ تَعَالٰی كَا یِه اِرْشَادِ كِھِیْ بَھِیْ اِنِ الْفَاظِ مِیْنِ نِے هُو تَا بَلَكِے اِسْ كِے
 بَجَائِے اِنِ الْفَاظِ مِیْنِ هُو تَا كِه۔

”اے پیغمبر اسلام! آپ خواہ مخواہ دلگیر نہ ہوں، آپ کا
 فرستادہ زندہ سلامت محفوظ ہے۔ ہم اس کے محافظ ہیں۔
 لوگوں نے خفیہ تدابیر کی تھیں، ہم نے بھی خفیہ تدابیر کیں اور ہم
 نے ان کی تدابیر کو ناکام بنا دیا۔ وہ بخیر و عافیت تھوڑے وقفہ

سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ آپ اس سلسلہ میں کوئی بیعت نہ لیں۔

لاحالہ اس واقعہ کا تعلق آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے ہے جو حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھے کہ آئندہ چل کر اس قسم کے واقعات پیش آئیں گے کہ حضرت عثمانؓ واقعی دشمنانِ اسلام منافقین کے ہاتھوں شہید کر دیئے جائیں گے اور کچھ بہترین لوگ اپنے وعدہ کو وفا کریں گے اور قصاصِ عثمان کیلئے کھڑے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ عہد شکنی کا ارتکاب کریں گے۔ یہ بیعت اس آئندہ قصاصِ عثمانؓ کے لئے ضروری ہے تو جو اس وقت اپنا عہد پورا کرے گا حق تعالیٰ اس کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو اپنے اس عہد کو توڑے گا تو اس عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

چونکہ حدیبیہ کے موجودہ واقعہ میں اس عہد کو نہ تو پورا کرنے کا سوال درپیش تھا اور نہ عہد شکنی کا۔ لہذا باری تعالیٰ کا یہ ارشاد جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، بے معنی بے فائدہ اور بے مطلب ہو جاتا ہے۔ لہذا الاحالہ ان آیات کا تعلق آئندہ کے واقعہ شہادت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے جو پیش آنے والا تھا اور حق تعالیٰ کو جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اس کا پورا پورا علم تھا اور اسی میں یہ صورت حال پیش آئی کہ کچھ حضرات نے اپنے اس عہد کو وفا کیا اور کچھ لوگوں نے عہد کو وفا کرنے میں کمزوری دکھائی۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے

ہاں اجر عظیم کے مستحق ہوئے اور کچھ کمزوری دکھا کر اس کے نتیجے میں مصیبتوں میں مبتلا ہوئے جس کا وبال اُمت آج تک بھگت رہی ہے۔

بہر حال یہ آیات ایک طرح کی پیشین گوئی ہیں جو آنے والے واقعات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں ورنہ بیعت رضوان کے موقعہ پر یہ تمام آیات بے معنی، بے مصرف اور بے فائدہ قرار پاتی ہیں۔

دوسری پیشین گوئیاں | سورۃ فتح ہی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت

کے واقعہ فاجعہ اور قصاص عثمان کی پیش گوئی کے علاوہ آئندہ پیش آنے والے دیگر واقعات کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں۔ واقعہ صلح حدیبیہ کے ضمن میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں :-

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ
السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝
وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونََهَا وَكَانَ اللَّهُ
عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَعَدَ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً
تَأْخُذُوهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ
النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَ
يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَآخِرُ لَوْحَتِي

عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِعَادَتِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِغُيُوبِكُمْ ۝ (۴۸)

ترجمہ :- اللہ مومنوں سے راضی ہو چکا ہے جب وہ
(اے پیغمبر!) آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔
اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ
نے ان پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں قریبی فتح عطا
فرمائی اور بہت سے اموال غنیمت عطا فرمائے جنہیں وہ
حاصل کریں گے اور اللہ بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔
اللہ نے تم سے کثیر اموال غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں
تم حاصل کرو گے۔ یہ اس نے تمہیں جلد ہی دیدیا اور لوگوں
کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک
نشانی بن جائے اور وہ تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہنمائی
فرمادے اور اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ
فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ واقعۃً اللہ ہی
نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہوگا اور اللہ تو ہر چیز پر قدرت
رکھنے والا ہے۔

ان چار آیات میں متعدد پیشین گوئیاں فرمائی گئی ہیں :-
(۱) پہلی آیت کریمہ (۴۸) میں بیعت رضوان کا بیان فرمانے
کے بعد یہ بتا کر کہ حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ مسلمانوں کے
قلوب میں اس وقت کیا کچھ تھا اور یہ کہ حق تعالیٰ نے اس وقت
مومنین کے قلوب پر اپنا سکینہ نازل فرمایا تھا پہلی پیشگوئی

تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو ایک قریبی فتح عطا فرمائی ہے جس سے مراد متفقہ طور پر فتح مکہ ہے جس پر تمام علمائے مفسرین کا اتفاق ہے۔

(۲) اسی کے بعد دوسری آیت کریمہ میں وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُ وَنَحَا سے مراد فتح مکہ کے بعد فوراً ہی جنگ حنین میں اموال غنیمت کا بکثرت حاصل ہونا مراد ہے۔ یہ دوسری پیشگوئی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی سیرت النبی میں لکھتے ہیں کہ :-

مطائف کا محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ ہٹا، چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی ہتھی۔ اسیران جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیزو اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا۔ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے۔ چار حصے حسب قاعدہ فوج کو تقسیم کئے گئے، خمس بیت المال اور غزبار و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

(سیرت النبی ص ۴۲ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ)
(۳) تیسری آیت کریمہ میں پھر ارشاد الہی ہے : وَعَدَ كُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُ وَنَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَعْلَمَ صِدْقًا مُّسْتَقِيمًا ۝ یعنی پھر اللہ نے کثیر تعداد میں اموال

غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے تو اللہ نے تمہیں جلدی ہی (اسی دنیا میں) یہ اموال عطا فرمادیئے اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ مسلمانوں کے لئے یہ ایک نشانی بن جائے اور تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہ نمائی عطا فرمائے۔ اس آیتِ کریمہ میں یقیناً ان فتوحاتِ عظیمہ اور مغام کثیرہ کی پیشگوئی فرمائی گئی ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دورِ خلافت میں ایران، شام، مصر، افریقہ، خراسان، کابل اور قبرص کے مقامات پر حاصل ہوئیں اور کفار کو ہر مقام پر ہزیمت اُٹھانی پڑی وَكَفَّ آيِدِي النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔ وہ تم پر فتحیاب نہ ہو سکے اور تاکہ یہ مسلمانوں کے لئے نشانی بن جائے۔)

مزید شہادت (۴) اس کے بعد چوتھی آیت میں ارشادِ الہی ہے وَ اُخْذْ اِيْهِمْ اَحْصَاۡ اللّٰهُ مِیْۤحَاۡ یعنی اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ اللہ ہی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ دوسری فتح کون سی ہے جس کو حاصل کرنے سے مسلمان قاصر ہوں اور اُن کی قوت اُنہیں اس سے عاجز کر دے اور اللہ کا غیر مرئی ہاتھ ہی کار سازی فرمائے۔ خود مسلمانوں کو (ان کی حکومت کو) اس پر کوئی قدرت نہ رہے۔ پھر اللہ ہی اس کا احاطہ فرمائے اور

اللہ ہی اس کا فیصلہ فرمائے۔ وہ کونسی فتح و نصرت ہے جس کی پیشگوئی اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ دوسری فتح جس میں یہ صورت پیش آئی کہ مسلمان اسے حاصل کرنے پر قادر نہ ہو سکے اور بے بس ہو کر رہ گئے وہ واقعہ فاجعہ شہادت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتنہ کبریٰ ہی تھا۔ ملت اسلامیہ کا خلیفہ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے جسم پر کیکچی طاری ہو جایا کرتی تھی اسی ملت اسلامیہ کا جو تھا خلیفہ یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ”شورش برپا کرنے والے دو ہزار آدمیوں کی جمعیت مدینہ میں موجود تھی کہ حضرات طلحہ و زبیر، رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ ان سے (حضرت علیؓ سے) ملے اور ان سے کہا کہ ہم نے اقامت حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ آپ ان لوگوں سے قصاص لیجئے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا ”بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی کوئی گنجائش دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟“ سب نے کہا ”نہیں“ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا ”خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آ جانے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس بر جا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دُور

ہو اور حقوق حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔

(خلافت و ملوکیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

۱۲۸-۱۲۹ بحوالہ طبرانی ج ۳، ابن الاثیر ص ۳۱۱
البدایہ والنہایہ ص ۲۲۴-۲۲۸

میں یہ سمجھتا ہوں کہ قَاخُزٰی لَمْ تَقْدِرْ رُفَاعَ عَیْنِ عَاقَدَہٗ
اَحَاطَ اللّٰهُ مَبْعَدَہٗ مراد یہی فتنہ کبریٰ یعنی شہادت حضرت
عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے اور اس آیت
میں اسی کی پیش گوئی فرمائی گئی ہے۔ وہ نہ مجھے بتایا جائے کہ
دو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ دوسری جنگ اور کون
سی ہے جسے اس آیت کریمہ کا مصداق سمجھا جائے کہ مسلمانوں
کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت) یوں بے بس ہو گئی ہو اور اس کے
دفعیہ پر انہیں قدرت نہ رہی ہو، وہ قاتلین و مجرمین کو کفر و کراہ
تک پہنچانے سے اپنے عجز و قصور کا یوں برملا اعتراف کرے
اور حق تعالیٰ کے غیر مرئی ماحضوں نے خود ہی اس کا احاطہ
کر کے ایک ایک مجرم کو فی النار والسقر کیا ہو۔ مجھے دو صحابہ
میں (بلکہ اس کے بعد بھی) دوسری کوئی فتح ایسی نظر نہیں آتی
جس کے مقابلہ سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت)
نے یوں اپنی بے بسی کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہو اور صحابہ کرام
واقعی بے بس ہو گئے ہوں۔ لیکن قدرت الہیہ ایک ہودج نشین
خاتون خانہ صنف لطیف (صدیقہ کائنات محبوبہ زحمت للخلین
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے وہ کام لے لے

جس سے بڑے بڑے سورما اور شیر بیشہ اپنے عجز و قصوکا بر ملا اعتراف کر رہے ہوں۔ لہذا میرے نزدیک یہ آیت کریمہ اسی واقعہ فاجعہ سے متعلق ہے۔

اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا تعلق چونکہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی ہونے والی شہادت کے واقعہ فاجعہ سے ہے۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا نہ صرف قرآن کریم کی آیت کریمہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ کی نص صریح کے مطابق فرض تھا بلکہ ان آیات کریمہ کا بھی منشا و مدلول تھا۔ لہذا حضرات طلحہ و زبیر و ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے موقف کی مزید توثیق و تائید ہو جاتی ہے۔ جزا ھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عن سائر المسلمین و المسلمات۔

حضرت علیؑ کی پوزیشن | حضرت علی رضی اللہ عنہ طبعاً ایک فوجی سپاہی تھے جرب

و ضرب ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بنو ہاشم ویسے بھی عملی سیاست سے ہمیشہ یکسو رہے تھے۔ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے جس پر بنو ہاشم نے قبضہ کر لیا تھا دینی و مذہبی ارکان حج کی ادائیگی کی ذمہ داری اور حرم کی مجاہدہ کی وجہ سے سیاست ملکی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا اس لئے فطرۃ حضرت علیؑ ایک کامیاب حکمران نہیں تھے۔ انہیں

اجتماعی سیاست نہیں آتی تھی۔ وہ میدان جنگ کے ہیرو تھے وہ میدان سیاست کے ہیرو نہیں تھے اور یہ ان کی کوئی منقصت نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی شخص بھی بیک وقت تمام میدانوں کا ہیرو نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا اس لئے سیاسی طور پر ان سے بہت سی فروگزاشتیں ہوئیں جو آگے چل کر ان کے خلاف پڑیں۔ بلکہ ان کے موافقین و مخالفین سب کے نزدیک یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو حضرت علیؓ کی طرف سے سب سے بڑے وکیل صفائی کی پوزیشن اختیار کر چکے ہیں، خلافت و ملوکیت میں رقم طراز ہیں کہ :-

”سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اگر کوئی شخص

زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابل اعتبار

لے مودودی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ جن تاریخی کتابوں یعنی تاریخ طبری و طبقات ابن سعد وغیرہ کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عثمانؓ حضرت معاویہؓ طلحہؓ و زبیرؓ و ام اللویثینو سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور ان کے طرفدار صحابہ کرام مثلاً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ و عمرو بن العاصؓ وغیرہ پر الزامات لگائے ہیں، انہی کتابوں میں حضرت علیؓ کے متعلق واضح طور پر یہ بھی موجود ہے کہ حضرت علیؓ

تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہذا ان کا محض اپنے کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جاسکتا کہ درحقیقت چاروں خلفاء اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

(خلافت و ملوکیت ص ۷۷ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز
 لمیٹڈ لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)
 بخاری کی یہ مفصل روایت بھی ملاحظہ ہو۔

حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن
 عقيل عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة ان
 فاطمة بنت النبي صلى الله عليه وسلم
 ارسلت الى ابي بكر تسأله ميراثها من رسول
 الله صلى الله عليه وسلم مما افاء الله
 عليه بالمدينة وفدك وما بقى من خمس خيبر
 فقال ابو بكر ان رسول الله صلى الله عليه

حضرت فاطمہؓ کو گھبر بٹھا کر انصار کے گھروں کا چکر کاٹتے رہے ہیں اور ان سے یہ اپیلیں کرتے رہے ہیں کہ وہ ابو بکرؓ کی بیعت توڑ کر مجھے خلیفہ بنالیں۔ بلکہ خود مودودی صاحب نے رسائل و مسائل حصہ اول میں حضرت علیؓ کی امیدواری خلافت کے عنوان کے تحت ان روایات کا رد جو تسلیم کیا ہے۔

(مؤلف)

وسلم قال لا نورث ما تركنا صدقة انما
 يا كل آل محمد في هذا المال والى ما لله لا غير
 شيئاً من صدقة رسول الله صلى الله عليه
 وسلم عن حالها التي كان عليها في عهد
 رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عملن فيها
 بما عمل به رسول الله صلى الله عليه وسلم
 فابى ابوبكر ان يدهن الى فاطمة منها
 شيئاً فوجدت فاطمة على ابى بكر في ذلك
 فحجرت له فلم تكلمه حتى توفيت وعاشت
 بعد النبي صلى الله عليه وسلم ستة اشهر
 فلما توفيت دفنها زوجها علي بن ابي طالب
 يؤذن بها ابوبكر وصلى عليها وكان لعلي
 من الناس وجه حياء فاطمة فلما توفيت
 استنكر علي وجه الناس فالتمس مصالحة
 ابى بكر ومبايعته ولم يكن يبايع تلك
 الا شهر فارسل الى ابى بكر ان ائمتنا ولايتنا
 احد معك كراهية ان يحضر عمر فقال عمر
 والله لا تدخل عليهم وحدك فقال ابوبكر
 وما عسيتم ان يفعلوه بي والله لا اتينهم
 فدخل عليهم ابوبكر فتشهد علي فقال
 انا قد عرفنا فضلك وما اعطاك الله ولم

نَسْتَفِضُ عَلَيْكَ خَيْرَ سَاقَةِ اللَّهِ إِلَيْكَ وَلَكِنَّكَ
اسْتَبَدَدْتَ عَلَيْنَا بِالْأَمْرِ وَكُنَّا تَرَى لِقَرَابَتِنَا
مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَصِيبًا
حَتَّى فَاضَتْ عَيْنَا ابْنَ بَكْرٍ فَلَمَّا تَكَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ
قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لِقَرَابَةِ رَسُولِ اللَّهِ
ﷺ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ
قَرَابَتِي وَامَّا الَّذِي شَجَرَ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ مِنْ هَذِهِ
الْأَمْوَالِ فَإِنِّي لَمَّا لَمْ أَلْ فِيهَا عَنِ الْخَيْرِ وَلَمْ
أَتْرِكْ أَمْوَالًا يَتَرَسَّوْا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَصْنَعُ فِيهَا إِلَّا صَنَعْتُهُ فَقَالَ عَلِيٌّ لَأَبِي بَكْرٍ
مَوْعِدُكَ الْعَشِيَّةَ لِلْبَيْعَةِ فَلَمَّا صَلَّى أَبُو بَكْرٍ
الظُّهْرَ رَقِيَ عَلَى الْمَنْبَرِ فَتَشَعَّدَ وَذَكَرَ شَأْنَ
عَلِيٍّ وَتَخَلَّفَهُ عَنِ الْبَيْعَةِ وَعَذَرَهُ الَّذِي
اعْتَذَرَ إِلَيْهِ ثُمَّ اسْتَعْقَرُوا تَشَعُّدَهُ عَلِيٌّ فَعَظَّمَ
حَقَّ ابْنِ بَكْرٍ وَحَدَّثَ أَنَّ لَمْ يَجِدْهُ عَلَى
الَّذِي صَنَعَ نِقَاسَةً عَلَى ابْنِ بَكْرٍ وَلَا أَنْكَارَ
لِلَّذِي فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ وَلَكِنَّا كُنَّا نَرَى
لَنَا فِي هَذَا الْأَمْرِ نَصِيبًا وَاسْتَبَدَّ عَلَيْنَا فَوْجَةٌ
فِي أَنْفُسِنَا فَسَرِمُوا لَكَ الْمُسْلِمُونَ وَقَالُوا
أَصَبْتَ وَكَانَ الْمُسْلِمُونَ إِلَى عَلِيٍّ قَرَمِيَّاحِينَ

راجع الامر بالمعروف -

(صحیح بخاری ص ۹۰۰ کتاب المغازی باب غزوہ خیبر)

ترجمہ ۱۔ ہم سے یحییٰ بن بکیر نے اور ان سے لیث نے حدیث بیان کی عن عقیل عن ابن شہاب عن عمروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کہ فاطمہ بنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکرؓ کے پاس پیغام بھیجا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا جو اللہ نے آپ کو بطور فتنے کے مدینہ منورہ، فذک اور خیبر کے خمس کے بقایا سے عطا فرمایا تھا۔ تو ابو بکرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آل محمدؐ اس مال میں سے کھا سکتی ہے۔ اور میں اللہ کی قسم رسول اللہ کے صدقہ میں سے کسی چیز کو اس حالت سے جس پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور میں اسی طرح عمل کرتا رہوں گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے اس میں سے کچھ بھی حضرت فاطمہؓ کو دینے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں حضرت فاطمہؓ حضرت ابو بکرؓ سے ناراض ہو گئیں چنانچہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے قطع تعلق کر لیا اور بول چال بند کر دی حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا اور وہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں۔ توجب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات ہی کو انہیں دفن کر دیا اور ابوبکرؓ کو خبر بھی نہیں دی اور خود ہی جنازہ کی نماز پڑھا دی اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں لوگوں کی طرف سے حضرت علیؓ کے لئے عزت و حرمت تھی۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں کے چہروں میں کافی تبدیلی محسوس کی۔ چنانچہ انہیں حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کر لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان تمام (چھ) مہینوں میں انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے لیکن آپ کے ساتھ کوئی دوسرا نہ آئے۔ وہ حضرت عمرؓ کے آنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ نہیں۔ اللہ کی قسم آپ ان کے ہاں اکیلے نہیں جائیں گے۔ تو حضرت ابوبکرؓ فرمایا۔ تمہیں کیا توقع ہے وہ میرا کیا کر لیں گے؟ اللہ کی قسم میں ان کے ہاں ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ ابوبکرؓ گئے۔ علیؓ نے خطبہ پڑھا اور کہا ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے خوب جانتے ہیں اور جو بھلائی اللہ نے آپ کو بخشی ہے اس پر ہم آپ سے حسد نہیں کرتے لیکن آپ نے ہمارے خلاف حکومت کے معاملے میں استبداد سے کام

لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے چنانچہ ابوبکرؓ آبدیدہ ہو گئے۔ جب ابوبکرؓ نے بات کی تو فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت صلہ رحمی کے لئے مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔ جو کچھ میرے اور تمہارے درمیان ان اموال کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے تو یقیناً اس بارے میں میں نے نیکی کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے کسی ایسی بات کو نہیں چھوڑا جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔ چنانچہ میں نے ویسا ہی کیا تو علیؓ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ بیعت کے لئے آپ سے شام کا وعدہ ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے ظہر کی نماز پڑھ لی تو وہ ممبر پچڑھے، خطبہ پڑھا اور علیؓ کی بات کو بیان کیا اور بیعت میں پیچھے رہ جانے کا جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اس کا ذکر کیا۔ پھر علیؓ نے استغفار کیا اور خطبہ پڑھا اور ابوبکرؓ کے حق کی عظمت بیان کی اور کہا کہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کی وجہ نہ ابوبکرؓ سے حسد تھا اور نہ اس برتری کا انکار تھا جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے لیکن ہم امر حکومت میں اپنا حصہ اور حق سمجھتے تھے اور انہوں نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا تو ہم اپنے دلوں میں ان سے ناراض ہو گئے تھے۔

مسلمان اس بات پر بہت خوش ہوتے اور کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا، اس طرح جب حضرت علیؑ نے حق کے مطابق اپنی پہلی روش سے رجوع کر لیا تو مسلمان ان سے پھر قریب ہو گئے۔

مندرجہ بالا حدیث صحیح بخاری کی ہے۔ اس میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اول تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وراثت کا مطالبہ اس زمین کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فتنے کے عطا فرمائی تھی۔ مال فتنے وہ مال ہوتا ہے جو بغیر کسی جدوجہد کے مملکت کو حاصل ہو جائے آپ کے پاس اپنی کوئی ذاتی جائیداد نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ مال فتنے ہی تھا جو آپ کی تحویل میں تھا اور جس سے آپ اپنے اہل و عیال کی خبر گیری فرماتے تھے اور عالم عرب کے مختلف علاقوں سے جو دود آتے تھے ان کی میزبانی فرماتے تھے۔ نیز ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں بھی اسی فتنے سے خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے جواب میں ارشاد نبوی پیش کیا کہ لا ندرث ما ترکنا صدقة (ہمارے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے) لیکن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بجائے اس ارشاد نبوی کا قائل ہونے یا اس کا انکار کرنے کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئیں اور ان سے قطع تعلق کر لیا اور بول چال

بند کر دی۔ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کے خلاف کوئی ارشاد نبوی پیش فرماتیں یا حضرت صدیق اکبرؓ کی تکذیب ہی فرما دیتیں تو ان کا موقف قابل فہم ہوتا۔

مال فقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں تھا۔ وہ مملکت کی ملکیت تھا البتہ سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھا۔ لہذا اس میں وراثت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلیفہ اور جانشین کی تحویل میں جانا چاہیے تھا۔

لے برٹش قانون میں بھی جو آزادی سے پہلے ہندوستان میں رائج تھا (اور آج تک ہندو پاکستان میں رائج ہے) گورنر جنرل کو کسی جدوجہد کے بغیر تحائف کی شکل میں جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ حکومت ہی کی ملکیت ہوتا تھا اور خزانہ عامرہ میں جمع کر دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ مختلف ریاستوں کی طرف سے جو تحائف گورنر جنرل کو پیش کئے جاتے تھے ان کے سلسلہ میں نوابوں اور راجاؤں نے گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ وہ تحائف گورنر جنرل کو پیش کرنے کے بجائے ان کی بیگم کو پیش کرنے لگے تھے۔ بہر حال یہ اصول برطانوی حکومت نے اسلام ہی کے اس اصول سے اخذ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ جو بات غیر مسلم مغربی حکمرانوں کی سمجھ میں آگئی وہ بنت رسول اکرم حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سمجھ میں نہیں آ سکی ہے

بسوخت عقل زحیرت

دوسری بات جو انتہائی حیرتناک ہے وہ یہ ہے کہ حضرت
 علی رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اور پھر مسجد
 نبوی میں مجمع عام کے اندر تمام صحابہ کے سامنے خلافت پر
 بر ملا اپنا حق جتارہے ہیں جس کی وجہ قرابت نبوی بتا رہے ہیں
 لکن اللہ استبداد علینا بالامر و کنا نری لقربا بئنا من
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصیباً (لیکن آپ نے ہمارے
 خلاف حکومت کے معاملہ میں استبداد سے کام لیا ہے اور ہم
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے اس میں اپنا
 حصہ سمجھتے تھے) اور لکننا کنا نری فی هذا الامر نصیباً
 واستبداد علینا (ہم اس امر حکومت میں اپنا حصہ سمجھتے تھے
 اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے) یعنی
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی بنا پر ہم اپنے آپ
 کو حکومت کا حقدار سمجھتے تھے۔ گویا رسول اکرم صلی اللہ علیہ
 وسلم نے ساری عمر جو جدوجہد فرمائی تھی وہ معاذ اللہ معاذ اللہ اپنے
 خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لئے فرمائی تھی۔ رسالت اور
 نبوت کا تو محض ایک ڈھونگ تھا ورنہ آپ بھی (خاکم بدہن)
 ایک دنیا دار سیاست داں تھے جو اپنی اور اپنے خاندان کی سیادت
 قائم کرنے کے لئے اُٹھے تھے۔

حضرات انبیاء کرام حب کسی قوم کی طرف اس کی ہدایت
 کے لئے مبعوث کئے جاتے ہیں تو وہ قوم سے کسی اجر یا صلے
 کے طلبگار نہیں ہوتے۔ ان کی ساری تگ و تاز بلا مزد و معاوضہ

ہوا کرتی ہے۔ ان کا اجر ان کو حق تعالیٰ کے ہاں سے ملتا ہے۔ وہ اپنے خاندان یا اپنی ذات کے لئے کسی شرف و فضیلت کے خواستگار نہیں ہوا کرتے۔ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر اس لئے نہیں آئے کہ اپنے لئے یا اپنے خاندان کیلئے بادشاہت حاصل کر لیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ نے بار بار یہ اعلان کرایا ہے کہ میں اپنی اس خدمت (ہدایت و رہنمائی) کا کوئی معاوضہ یا صلہ تم سے نہیں مانگتا۔ میرا اجر میرا پروردگار ہی مجھے دے گا۔ چنانچہ سورۃ سبأ میں ہے۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنِ
أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

(۳۲)

ترجمہ :- (اے پیغمبر اسلام!) کہہ دیجئے کہ اگر میں نے تم سے (اپنی اس خدمت کا) کوئی صلہ مانگا ہو تو وہ تم اپنے پاس ہی رکھو (مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں) میرا صلہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (میں صرف اسی سے لونگا) اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے (چنانچہ اپنی اس بات پر بھی میں اسی کو گواہ بناتا ہوں)۔

یہی اعلان اور بھی کئی جگہ کرایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ انعام (۶)۔ سورۃ یوسف (۱۲)۔ سورۃ فرقان (۲۵)۔ سورۃ ص (۳۸)۔ سورۃ طہ (۵۲)۔ سورۃ قلم (۶۸)۔

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی اعلانات کرائے گئے ہیں۔
 صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں بلکہ مختلف انبیاء کرام کے انہی اعلانات کو قرآن کریم نے بار بار نقل فرمایا ہے چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ ہود میں (۱۱) اور سورہ شعراء میں (۲۶) موجود ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ یونس (۱۰) اور سورہ شعراء (۲۶) میں مذکور ہے۔ حضرت صلح علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۲۶) میں اور حضرت لوط علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۲۶) میں اور حضرت شعیب علیہ السلام کا یہی اعلان سورہ شعراء (۲۶) میں موجود ہے۔

ایک سنہری اصول | اللہ تعالیٰ نے جب اہل انطاکیہ کے پاس پیغام اسلام کے لئے ایک بعد دیگرے تین مستقل انبیاء کرام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت شمعون علیہ السلام کو بھیجا اور اہل انطاکیہ نے ان تینوں انبیاء کا انکار کر دیا تو اقصائے شہر سے ایک مرد مؤمن نے انہیں آکر نصیحت کی تو اس کے الفاظ بھی یہی تھے۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى
 قَالَ يَبْنَؤُمْ أَتَبْعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝ اَتَّبِعُوا مَن
 لَا يَسْعَىٰكُمْ أَجْرًا وَهَذِهِ مُهْتَدَةٌ ۝ (۲۶-۲۷)
 ترجمہ : اور اقصائے شہر سے ایک آدمی (مرد مؤمن)

دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کہ جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور واقعی ہدایت یافتہ ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایک سنہری اصول بیان فرمادیا گیا ہے کہ اتباع تو صرف ان کا کرنا چاہیئے جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار نہ ہوں۔ یعنی وہ پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور مصلح نہیں ہوں گے۔ بلکہ واقعی ہدایت یافتہ لوگ ہوں گے اگر وہ کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار ہوتے تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ وہ پیشہ ور لیڈر ہیں جو کسی اپنے ذاتی مفاد و منفعت کے لئے اپنی لیڈری کی دوکان چمکار رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگ ہیں جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار نہیں اور محض لوجہ اللہ تمہیں ہدایت دینا چاہتے ہیں۔ تم ان کا انکار کیوں کرتے ہو۔

بہر حال انبیاء کرام کبھی بھی اپنی یا اپنے خاندان کی سیادت و امارت قائم کرنے کے لئے نہیں آیا کرتے۔ صحیح بخاری کی اس روایت سے جو ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معاذ اللہ قرابت نبوی کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا حق دار سمجھے ہوئے تھے قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ میں بار بار (فقہ القرآن کی چاروں سابقہ جلدوں میں) متنبہ کرتا آ رہا ہوں کہ امام ابن شہاب زہریؒ پر شیعیت کا شبہ کیا

جاتا رہا ہے اور شیعی اسماء رجال کی کتابوں نے ان کی شیعیت کا بھانڈا اچھی طرح بھوڑ دیا ہے۔ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) یہی بزرگ تشریف فرما ہیں۔ چونکہ شیعی نقطہ نظر یہی ہے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا اور حضرات خلفائے ثلاثہ معاذ اللہ معاذ اللہ غاصباً خلافت تھے اس لئے ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کر سکتے لیکن اس سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابن السودار یعنی عبداللہ بن سبا یہودی نے جو تحریک چلائی تھی اس کے ماتحت نو مسلمین عجم کے دماغوں میں یہ بات اچھی طرح پرورش پا چکی تھی کہ اب تک جو کچھ ہوتا آ رہا ہے وہ غلط ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی حضرت ہارون علیہ السلام تھے اور انہی کا خاندان یہودیوں میں شاہی خاندان تھا ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور ان کا اور ان کے خاندان ہی کا حق ہے کہ وہ حکومت کریں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر ان روایات کو تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت علیؑ اپنے آپ کو خلافت کے لئے دوسروں کے مقابلے میں احق سمجھتے تھے کیونکہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد تھے تو اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضرت علیؑ معاذ اللہ خلافت کو محض خاندانی مسئلہ سمجھتے تھے انتخابی یا شورائی مسئلہ نہیں سمجھتے تھے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؑ نے قرآن کریم کے صریح حکم دامرہم

شودے بدینہد کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اگر انہوں نے اس صریح حکم کے مالہ و ماحلیہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوتا تو وہ خلافت کو خاندانی مسئلہ (جسے مولانا مودودیؒ نے ملوکیت قرار دیا ہے) کیسے قرار دے سکتے تھے تو کیا قرآن کریم کو معاذ اللہ تم معاذ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے جتنا ہمارے دور کے ایک عالم مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سمجھ رہے ہیں۔ پھر تو (خاکم بدہن) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عقل و فہم اور بصیرت، مولانا مودودیؒ اور ہماری عقل و فہم اور بصیرت سے بھی گئی گذری ثابت ہوئی۔

سبائی تحریک | شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ میں جو لوگ ملوث رہے ان کا پس منظر سمجھنے کے لئے ہمیں سبائی تحریک کی تاریخ سامنے رکھنی ہوگی جس کا مرکز یمن کے یہودی تھے۔

یہودیوں کی فطرت میں خود سری، احساس برتری اور نسلی غرور کے جراثیم ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ قسآن مجید اور بائبل میں ان کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینہ اور خیبر وغیرہ کے یہودیوں نے جو طرز عمل اختیار کیا جنگ اعدا اور جنگ خندق میں وہ جس طرح مشرکین عرب کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر لائے وہ بھی اس کی تائید کرتا

ہے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکست کھا کر انہوں نے دوسرا محاذ کھولا اور وہ تھا عربوں کو صوبائی بنیاد پر باہم لڑانے کا۔ تاریخ عرب سے جن حضرات کو دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مدینہ اور خیبر کے علاوہ عرب میں یہودیوں کا دوسرا بڑا مرکز یمن تھا، جہاں کی تجارت پر یہودی چھائے ہوئے تھے۔ یمن کے عرب قحطانی کہلاتے ہیں اور حجاز (جہاں مکہ اور مدینہ واقع ہیں) کے عرب عدنانی۔ دونوں ایک دوسرے کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بھی اسی حریفانہ چشمک کا مظہر تھا۔ کیونکہ یمن کے حکمران، ابرہہ نے خانہ کعبہ کی مرکزیت اور اہمیت کو ختم کرنے اور حجازی عربوں کو زک پہنچانے کی خاطر یمن کے دارالسلطنت، صنعاء میں ایک معبد تیار کیا تھا، جس کی اپنے مذہبی جوش میں ایک حجازی عرب نے توہین کر دی۔ اس کا بدلہ لینے اور کعبہ کو ڈھالنے کے عزم سے ابرہہ مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ناکام و نامراد کیا۔ سورۃ فیل میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

بہر حال عربوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر، اپنی مدینہ اور خیبر کی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے یمن کے یہودیوں نے دو کام شروع کئے۔ ایک تو عربوں کی اسی علاقائی عصبیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تین چھوٹے نبیوں کو لا کھڑا کیا۔ جن میں سب سے

زیادہ شہرتِ مسیلمہ کذاب نے حاصل کی۔ اس کے متبعین کا جو فہم طبقہ تھا وہ فی الحقیقت اُسے نبی نہیں مانتا تھا۔ مگر وہ کہتے تھے کہ اپنے علاقہ کا جھوٹا نبی ہمیں حجاز کے سچے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔ (طبری، ذکرِ مسیلمہ)

یہی وہ فتنہ ارتداد ہے جس کے خلاف کوئی عملی کارروائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مرض الموت کی وجہ سے نہ کر سکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین حضرت صدیق اکبرؓ نے پورے عزم و جرأت سے اس فتنہ کا قلع قمع کیا۔ اور اس فتنہ کی پشت پناہ ایرانی شہنشاہیت اور رومن ایمپائر کے سامنے بھی ڈٹ گئے۔ اللہ نے ان کے عزم و حوصلے اور جرأت ایمانی کے نتیجے میں وہ شاندار کامیا بیاں عطا فرمائیں جن کی بنیاد پر حضرت عمر فاروق اعظمؓ اور ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ نے خلافت اسلامیہ کی وہ عظیم و جلیل عمارت تعمیر کی جس کی کوئی مثال تاریخِ انسانیت میں نظر نہیں آتی۔

شہادتِ فاروق اعظمؓ | دشمنانِ اسلام کی یہ چالیں جو عہدِ نبوی کے آخر میں مدعیانِ نبوت کے پیکر میں ظاہر ہوئی تھیں اور جن کا خاتمہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہدِ مبارک میں کیا، انہی چالوں کا ایک اور مظہر فاروق اعظمؓ کی شہادت تھی جس میں یہودیوں کا مذہبی پیشوا کعب الاحبار، ایران کی قریب المرگ شہنشاہیت کے نمائندے ہرمزان اور بولولو، فیروز اور عیسائی

رومی سلطنت کا نمائندہ جفینہ شامل تھے۔ ان کی اس چال کا مقصد واضح تھا کہ اسلام کی مرکزی شخصیت کو اچانک ختم کر کے افرا تفری پیدا کر دی جائے اور جگہ جگہ بغاوتوں کی آگ بھڑک کے مشرق میں ایرانی شہنشاہیت کو نئے سرے سے ابھرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور مغرب میں رومن ایمپائر کو دنیائے اسلام پر کاری ضرب لگانے اور اپنے مفتوحہ علاقے واپس لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔ لیکن دشمنان اسلام کی بد قسمتی سے فاروق اعظم نہایت سخت جان ثابت ہوئے اور اس خطرناک حملے اور تمام خون نکل جانے کے باوجود وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کئی دن زندہ رہے اور ریاست کے تمام اہم معاملات کو نمٹا کر یکم محرم الحرام کو منصب شہاد پر فائز ہوئے اور اس طرح مرتے مرتے بھی دشمنان اسلام کی سازشوں کو خاک میں ملا گئے۔

عہد عثمانی رضی | یہ اسلام اور مسلمانوں کی خوش قسمتی جیسے مدبر نے زمام حکومت سنبھالی جس نے شہادت فاروق اعظم رضی کے بعد ملت اسلامیہ کو بھنور میں ڈوبنے سے بچایا اور قافلۂ اسلام کے شہسوار کمرۂ ارض کے مجرور پر اسی شان و عظمت سے پھراپنے پھریرے اڑانے لگے جس طرح وہ عہد نبوی اور عہد صدیقی و فاروقی میں پرچم اسلام کو بلند کئے ہوئے تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مؤرخ حاجی معین الدین ندوی مرحوم اپنی کتاب ”خلفائے راشدین میں“ عثمانی کارنامے کے عنوان کے تحت حضرت عثمان غنیؓ کی اس عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نہ

”اس میں شک نہیں ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے حسن تدبیر اور غیر معمولی سیاسی قوتِ عمل سے روم و ایران کے دفترالٹ دیئے اور ان کی دولت و مملکت فرزندِ انِ توحید کا ورثہ بن گئی۔ ایران کا بیشتر حصہ مسخر ہو گیا۔ شام، مصر، الجزائر نے بھی سپر ڈال دی لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ فاتحِ قوم کا ایک ہی سیلاب، مفتوحِ اقوام کے احساسِ خودی کو فنا کر دے؟ اور کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ ایک ہی شکست نے کسی قوم کی حریت و آزادی کے جذبہ کو معدوم کر دیا ہو؟ اور اس کے قوائے عملی بے کار ہو گئے ہوں؟ سکندر نے تمام دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اس کے جانشینوں نے کتنے دنوں تک حکومت قائم رکھی؟ چنگیز و تیمور نے بھی عالمِ کوہ و بالا کر دیا۔ لیکن ان کی فتوحات کیوں نقشِ بر آب ثابت ہوئیں؟ — درحقیقت یہ ایک تاریخی نکتہ ہے کہ جب اولوالعزم فاتح کا جانشین ویسا ہی اولوالعزم اور عالی حوصلہ نہیں ہوتا تو اس کی فتوحات اس تماشا گاہِ عالم میں صرف ایک وقتی نمائش ہوتی ہیں۔ اس بناء پر جانشینِ فاروق اعظمؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے

کہ اس نے ممالک مفتوحہ میں حکومت و سلطنت کی بنیاد مستحکم کی اور مفتوحہ اقوام کے جذبہ خود سری کو رفته رفته اپنے حسن تدبیر اور حسن عمل سے اس طرح ختم کیا کہ آئندہ مسلمانوں کی باہمی کشمکش کے موقعوں میں بھی انہیں سرتابی کی ہمت نہ ہوئی۔

تم نے فتوحات کے سلسلہ میں پڑھا ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کو نہایت کثرت کے ساتھ بغاوتیں فرو کرنا پڑیں، مصر میں بغاوت ہوئی، اہل آرمینیا اور آذر بائجان نے خراج دینا بند کر دیا، اہل خراسان نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تمام بغاوتیں درحقیقت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں جو مفتوح ہونے کے بعد بھی اقوام کے جذبہ آزادی کو برا نگینہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے تمام بغاوتوں کو نہایت دانائی کے ساتھ فرو کیا اور آہستہ آہستہ لطف و شدت کی ملی جلی حکمت عملی سے مفتوحہ ممالک کی عام رعایا کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کر دیا (۲۳۸) صرف یہ بغاوتیں ہی فرو نہیں کی گئیں بلکہ فتوحات کا دائرہ بھی مزید وسیع ہوا۔

عثمانی فتوحات کی وسعت | عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی

نہایت وسیع ہوا۔ افریقہ میں مراکش تک کا علاقہ مفتوح ہوا۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگین ہوا۔

دوسری جانب اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا (ص ۲۳۹)

ایرانی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن رومن ایمپائر تھی جس کے تمام افریقی علاقے مسلمانوں نے اس سے آزاد کر لئے تھے اور جس کی وجہ سے وہ ادھ مرے سانپ کی طرح نہایت ہیچ و تاب کے عالم میں تھی۔ اور اپنی طاقتور بحریہ کے ذریعہ مسلمانوں کے ساحلی علاقوں پر مسلسل حملے کرتی رہتی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے امیر معاویہؓ کو امیر البحر بنا کر اس کے مقابلے کیلئے روانہ کیا۔ مسلمانوں نے حضرت معاویہؓ کی غیر معمولی قیادت میں قیصر روم کے بحری بیڑے کو جو پانچ سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا ایسی فاش شکست دی کہ پھر رومیوں کو اس جرأت کے ساتھ حملے کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام کے سب سے پہلے امیر البحر حضرت امیر معاویہؓ نے آگے بڑھ کر جزیرہ قبرص کو جو رومن ایمپائر کا سب سے بڑا بحری اڈہ تھا ان سے چھین کر اسلامی بحریہ کا مرکز بنا لیا۔

(طبری، عہد عثمان غنیؓ)

خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت | عہد عثمانی
قانون کی عظمت و بالاتری کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ کے قاتل

ابو لؤلؤ نے جن لوگوں (ہرمزان و جفینہ وغیرہ) کے ساتھ مل کر سازش تیار کی تھی، اس کے متعلق باوجودیکہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کی شہادتیں مل گئی تھیں مگر چونکہ سرکاری طور پر ابھی اس کی تفتیش و تحقیق نہیں ہوئی تھی اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبید اللہ بن عمرؓ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر حالت غضب میں ان دونوں کو ان کے گھروں پر جا کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عبید اللہ بن عمرؓ سے باز پرس کی۔ اس کی تفصیل ہرمزان کے بیٹے قناذ بان کی زبانی سنئے۔ وہ کہتا ہے۔

”اہل عجم مدینہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ابو لؤلؤ فیروز میرے والد کے پاس سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری خنجر تھا میرے والد نے اسے پکڑا اور پوچھا: تم اس ملک میں اس کا کیا کرو گے؟ وہ بولا: ہمیں اسے استعمال کروں گا“ ایک آدمی نے اسے اس حالت میں میرے والد سے ہاتھیں کرتے دیکھا تھا۔ جب حضرت عمرؓ پر حملہ ہوا تو اس شخص نے کہا: ”میں نے اس قاتل کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے یہ خنجر قاتل کو دیا تھا“ لہذا عبید اللہ بن عمرؓ نے آکر میرے والد کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے عبید اللہ بن عمرؓ کا

مختار بنادیا اور فرمایا: بیٹے! یہ تمہارے باپ کا قاتل ہے اور تم ہم سے زیادہ اس کو قتل کرنے کا حق رکھتے ہو۔ جاؤ اور اسے قتل کر دو۔ اس کے بعد میں عبید اللہ ابن عمرؓ کو اپنے ساتھ قتل کرنے کے لئے چلا۔ اس وقت اہل مدینہ کا ہر شخص میرے ساتھ تھا۔ مگر وہ سب مجھ سے اس کے بارے میں سفارش کر رہے تھے کہ میں اسے چھوڑ دوں اور دیت (خون بہا) قبول کر لوں۔ میں نے ان سے پوچھا: ”کیا میں اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہوں یا نہیں؟“ وہ بولے ”ہاں حق رکھتے ہو“ اور عبید اللہ بن عمرؓ کو برا بھلا کہا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ: کیا تم اسے قتل کرنے سے منع کرتے ہو؟“ وہ بولے ”نہیں“ انہوں نے پھر عبید اللہ بن عمرؓ کو برا بھلا کہا۔ لہذا میں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے واسطے اسے چھوڑ دیا اور ان لوگوں (مسلمانوں) کی خاطر میں نے اسے رہا کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اوپر اٹھالیا۔ بخدا میں لوگوں کے سروں اور ان کے ہاتھوں پر سوار ہو کر گھر پہنچا۔

(تاریخ طبری حصہ سوم ترجمہ اردو ص ۳۱ مطبوعہ
نفیس اکیڈمی کراچی)

اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ حکم دیا کہ مقتول کی دیت ادا کی جائے اور پھر اپنی جیب خاص سے ان کی دیت ادا کی۔

(تاریخ طبری حصہ سوم ص ۳۱۳)

بہر حال یہ محض ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ جو فاروق اعظم کے ہر طرح صحیح جانشین ثابت ہوئے اور تاریخ اسلام میں جنہوں نے کتنے ہی سنہری ابواب کا اضافہ کیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک دشمنان اسلام نے یہ صورت

سامنے پاکر اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر اپنی حکمت عملی میں پھر تبدیلی کی اور مدعیان نبوت کی چال کے بعد خلیفہ اسلام کو اچانک قتل کرنے کی سازش میں بھی ناکامی کا سامنا کر کے اب تیسری پلٹانگ کی۔ اور وہ یہ کہ بظاہر اسلام قبول کر کے خود حجازی مسلمانوں میں جن میں اسلام نے جنم لیا اور پھلا پھولا نسلی عصبیت کو ہوا دی جائے اور بنو ہاشم کو بھڑکایا جائے کہ تمام دنیا کے اصول اور طریقہ کار کے مطابق بنو ہاشم شاہی خاندان ہے اور ان میں بھی خصوصاً حضرت علیؓ جو سربراہ ریاست (حضرت محمدؐ) کے چچا زاد بھائی اور داماد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بچپن سے پالا ہے۔ اور اس سے بھی پہلے ان کے والد ابو طالب (جن کا اصل نام عبد مناف تھا یعنی مناف بت کے پجاری، مگر اپنے بڑے

میٹے طالب کی وجہ سے ابو طالب کہلائے عربوں کے مقدس مقام کعبہ کے پر و ہت تھے۔ لہذا رسول اللہ کے بعد آپ کی خلافت کے اصل مستحق علیؑ اور ان کی اولاد ہے۔

یہودیوں کی خفیہ تنظیم | یہودیوں کی خفیہ تنظیمیں عہد قدیم سے سرگرم عمل رہی ہیں

ان کا ہمیشہ یہی کام رہا ہے کہ جن قوموں سے انہیں خطرہ ہو ان میں گھس کر ان کے عقائد و مزعومات کو تباہ کریں، انہیں آپس میں لڑائیں اور ان قوموں کو تباہ و برباد کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے زمانہ سے بلکہ اس سے بھی پہلے ان کے ہاں اس قسم کی خفیہ تنظیموں کا سراغ ملتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا نام ”القوة الخفیہ“ تھا اور آج کل اس کا نام ”فری میسنری“ یا ”فری میسن“ تحریک ہے۔ مسیح سے قبل ان کی ان خفیہ تحریکات کا حال معلوم کرنا ہو تو عہد نامہ عتیق (بائبل) کی کتاب ”سفر حزقیال“ کی انیسویں فصل ملاحظہ ہو حضرت مسیح کی آمد کے بعد ایک دشمن مسیح یہودی پال نے مسیحیت کو جس طرح مسخ کر کے تباہ کیا اس کی تفصیلات کے لئے ڈاکٹر احسان الحق رانا کی کتاب ”یہودیت و مسیحیت“ ملاحظہ ہو۔

لے ڈاکٹر صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی اور ایم ایس (کولمبیا) ہیں ان کی یہ کتاب مسلم اکادمی ۱۸۔ محمد نگر علامہ اقبال روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

فری میسنری تحریک اپنی نئی شکل میں عصر حاضر ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس سے قبل یہ القوۃ الخفیہ (خفیہ طاقت) کے نام سے بعثت اسلام کے وقت سے کام کر رہی ہے (اس زمانے میں اس کا مرکز یمن تھا) اور تمام خلافتوں اور اسلام سے خارج فرقوں کے نشو و نما پانے کے زمانوں میں اس کی ہم عصر رہی ہے۔

(ملاحظہ ہو کتاب الردۃ محمد کاظم حبیب دمشق مطبوعہ مکتبہ علمیہ لاہور)

جس طرح اس ”خفیہ طاقت“ نے خلافت عباسیہ کے دار الخلافہ بغداد کے سقوط پر ۱۵۶۱ء میں خوشیاں منائی تھیں اسی طرح ۱۹۰۸ء میں فری میسنری نے عثمانی خلافت کے دار الخلافہ استنبول کے سقوط پر مسرت کے شادیانے بجائے تھے۔ (حوالہ بالا)

اگر دیکھا جائے تو فری میسنری تمام خفیہ تنظیموں میں سب سے قدیم ہے۔ یہ ”خفیہ قوت“ کی بدلی ہوئی دوسری صورت ہے جو بیس صدیوں سے یعنی آغاز مسیحیت سے اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہے۔ صیہونیت فری میسنری کو فکری غذا مہیا کرتی ہے اور اس کے ارکان وہ یہود ہیں جو فری میسنری کے مدارج میں سے ۳۰ سے اوپر مدارج طے کر چکے ہیں۔

اس تنظیم نے اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لئے ہیں کہ اب اس تنظیم کے دروازے مسلمانوں، مسیحیوں، مجوس، یہود

اور مشرکین کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہیں اور اس کی شاخیں دنیا کے تمام ممالک میں قائم ہیں اور وہ سیاست کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ جہاں بڑے اہم امور کے حتمی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ جہاں بادشاہوں، اور ملکوں کے سربراہوں کے عزل و نصب اور زوال و بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں تباہ کن سازشوں اور خفیہ تحریکوں، اجتماعی اور سیاسی انقلابات اور ہنگاموں کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ لہذا یہ تنظیم سازشیں تیار کرنے اور انقلابات کے منصوبے بنانے کا مطیع اور اخلاق کا مقبرہ ہے۔

جو لوگ اس تحریک کے ممبر بن جاتے ہیں سب سے پہلے ان کے ذہن نشین یہ بات کرائی جاتی ہے کہ دین اللہ کے لئے ہے اور وطن سب کے لئے۔ پھر یہ کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مسلمان انسانیت، وطنیت اور قومیت کی رو سے بھائی بھائی ہیں۔ پھر ان پر یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ اگر انبیاء اور گمراہ کرنے والے رسول نہ ہوتے تو سب لوگ ایک امت ہوتے۔ ان میں دین و مذہب کی کوئی تفریق نہ ہوتی۔ نہ پیرو و مرشد ہوتے نہ پادری۔ پھر وہ اپنے مقاصد کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ”ہماری غرض و غایت مذہب کا وجود مٹا دینا ہے (۱۹۰۷ء کی عالمی فری میسنری کانفرنس کی روداد) اور مذہب سے ان کی مراد یہودی مذہب نہیں ہے بلکہ یہودیت کے علاوہ دیگر تمام مذاہب ہیں۔ پھر یہ

سبق پڑھاتے ہیں کہ ”عنقریب اللہ کے سوا مقصود و مطلوب صرف انسانیت ہی ہو جائے گا“ (مشرقی فرانس کی عظیم کانفرنس کی روداد ۱۹۱۳ء) اور ان ارکان پر لازم ہے کہ وہ معاشرے میں فساد اور لوگوں کے اخلاق میں بگاڑ پیدا کرنے کی سعی کریں اور ان کے جماعتی نظم کا شیرازہ بکھیر دیں۔ اس ہدایت کے تحت کہ ”لوگوں میں ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو اپنی پوشیدہ باتوں کے افشاء پر بھی نہ شرمائے۔

(فری میسنری کی حقیقت از ڈاکٹر نجی)

یہ تو حقیقی دین و اخلاق کے بارے میں ہدایات۔ سیاست کے میدان میں جو ہدایات ہیں ان میں ہر فرست سیاست کو دین سے علیحدہ کرنا ہے۔ مذاہب کی مخالفت میں کمال ہم جب ہی حاصل کر سکتے ہیں جب ہم سیاست کو مذاہب سے جدا کر دیں۔ (فری میسنری کا ترجمہ مجلہ ”اکاسیا“ ۱۹۰۳ء) اس مقصد کے حصول کے لئے فری مسنز کے مختلف گروہ، جماعتیں اور خفیہ مجلسیں تشکیل دی گئیں جو دینی تحریکوں کے مقابلے کے لئے سازشیں اور انقلابات کے منصوبے تیار کریں۔ لہذا ۱۹۰۷ء میں پیرس میں منعقدہ فری میسنری کی کانفرنس میں یہ قرار پایا کہ فری میسنری کا نصب العین عالمی جمہوری لادینی حکومت کا قیام ہے (فری میسنری کے اسرار از جنرل جواد رفعت) فری میسنری کے وجود کی غرض و غایت ان دینی جمیعتوں کو تتر بتر کرنا ہے جو ماضی سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتی

ہیں اور اس مقصود کے حصول کے لئے فری میسنز صف اول میں قتال کرتے ہیں۔ (فری میسنری کے اسرار از جزل جواد رفعت)۔

یہ تنظیم دنیا کی ام الانقلاب اور ام الاحزاب ہے یعنی دنیا کے انقلابات اور گروہ بندیوں کی خالق ہے اور ہلاکت خیز زیر زمین تحریکوں اور عالمی جنگوں کی محرک اور نگہبان ہے۔ اسی نے یورپ میں دو عظیم انقلاب برپا کئے ایک ۱۷۸۹ء میں اور دوسرا ۱۹۱۷ء میں اور دنیا میں دو عظیم جنگوں کی آگ بھڑکائی ایک ۱۹۱۴ء اور دوسری ۱۹۳۹ء میں اور تاریخ اسلام کے دو بڑے انقلابات بھی اسی کے مرہون منت ہیں ایک ۱۹۰۸ء کا انقلاب جس میں مسلمانوں کا آخری خلیفہ معزول کیا گیا اور دوسرا ۱۹۲۴ء کا جس میں تاریخ میں پہلی مرتبہ نظام خلافت کی بساط لپیٹی گئی۔ مسلمانوں کا اتحاد تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گیا، پارہ پارہ ہو گیا اور امت مسلمہ کئی چھوٹی چھوٹی کمزور قومیتوں اور مملکتوں میں بٹ گئی اور شریعت اسلامیہ کی جگہ خود ساختہ قوانین و دساتیر نے لے لی اور لوگ اس کفر صریح پر خاموش تما شائی بنے رہے کچھ اس فعل میں ان کے معاون و مددگار بنے۔ نتیجہ وہ فوج در فوج گروہ در گروہ ارتداد کے عمیق کڑھے میں گر پڑے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مسلم اور غیر مسلم مفکرین ، مؤرخین اور علم الاجناس اور ادیان کے محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء اور راہب مختلف ممالک اور مختلف عہد میں موجود فرقوں اور معاشروں میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے گھس جاتے اور بظاہر ان کے دین و مذہب کو بھی اختیار کر لیتے تاکہ ان کے دین میں خرابی ، تحریف ، کجی اور تغیر و تبدل پیدا کریں جن کے ذریعے عالمی یہودیت کے مفادات و مصالح کی خدمت انجام دی جاسکے اور اپنے آپ کو ان فرقوں کی دشمنی و مخالفت سے بھی محفوظ رکھیں۔ وہ ان میں اس طرح گھل مل کر واردات کرتے اور بڑے پرامن طریقے سے وہ اندرونی مہلک عداوت کے اسباب کا بھی سد باب کر لیتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ مار آستین ہیں۔ بعثت مسیح سے لے کر آج تک یہود نے جو بالفعل اس قسم کے جوہر دکھائے ہیں تو وہ مسیحیت کی آڑ میں عیسائیوں کا روپ دھار کر انجام دیتے ہیں۔ سب سے پہلے جس معاشرے میں انہوں نے اپنا یہ خبیث طریقہ نافذ کیا وہ ایرانی معاشرہ تھا کیونکہ بخت نصر کے حملے کے نتیجے میں یہ غلام بن کر ایران پہنچ چکے تھے اور عرصہ دراز تک وہ اسی حالت میں رہے بالآخر اپنی سازشی اور تخریبی ذہنیت کے زیر اثر یہ ان میں گھل مل گئے اور ان کا مذہب مجوسیت اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے بڑے کاہن اور مذہبی پیشوا بن گئے اور مکر و فریب سے ایرانی درباروں میں اتنا اثر و رسوخ

پیدا کر لیا کہ ایرانی بادشاہوں کو تیسری صدی عیسوی کے عیسائیوں اور ان کی باغی افواج کی تباہی و ہلاکت پر اکسانے لگے۔

ان معاشروں میں سے ایک یورپ کا وہ بت پرست معاشرہ ہے جس میں بہت سے یہودی شامل ہو گئے یہاں تک کہ وہ اصل بت پرستوں سے بھی زیادہ بت پرست بن گئے۔ اور ان کی یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں اعلیٰ مراتب و مناصب تک جا پہنچے بلکہ خود بادشاہ بن بیٹھے جیسے نیرون تاج و تخت پر قبضہ سے ان کے لئے یہ سہل ہو گیا کہ وہ بت پرست معاشرے کو عیسائیت سے لڑادیں اور طرفین میں چکنا چور کرنے والی جنگوں کی ایسی آگ بھڑکادیں جس میں عیسائیت اور بت پرست اقوام کی طاقت و قوت جل کر بھسم ہو جائے اور یہودی کی جس چال نے عیسائیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا وہ یہ تھی کہ وہ دودشمنوں میں گھر گئے۔ مشرقی جانب سے جو لشکر ان پر حملہ آور ہوا اس کی کمان عملاق نجوسی کر رہا تھا اور مغربی جانب سے حملہ آور لشکر کی کمان عملاق بت پرست کے ہاتھ میں تھی۔

جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا تو عیسائیوں کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ مکار یہودیوں نے فوراً اپنا طریق واردات بدل ڈالا اور جلد ہی عیسائیت کے مذہب میں داخل ہو گئے اور اس کے معاشرے

میں ایسے گھل مل گئے کہ وہ مذہبی پیشوائیت کے بڑے بڑے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے باہم متصادم مذاہب اور آپس میں لڑنے جھگڑنے والے فرقوں پر غلبہ پالیا۔ اس سے پہلے انہوں نے انجیل میں تحریف و تزئین کی اور اپنی خواہشات نفس کے مطابق ایسی ایسی تعبیریں و تفسیریں کیں جن سے ان کے مذموم مصالح و مقاصد پورے ہوتے تھے۔ یعنی وہ عیسائیت کو صفحہ بہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ لہذا مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بے شمار عیسائی اس فرقہ وارانہ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن یہودی منافقوں کا ایک فرد بھی اس فساد کی لپیٹ میں نہیں آیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا کہ عیسائیوں کو آپس میں بھڑا کر ہلاک کر دیا جیسا کہ اس سے قبل عیسائیوں کو مجوسیوں اور بت پرستوں کے ہاتھوں تباہ و برباد کیا تھا۔

اسلام کے خلاف یہودی تحریک | بعینہ یہی ٹیکنیک انہوں نے اسلام

کے خلاف استعمال کی۔ چنانچہ علماء، مؤرخین، ادیب اور اسلامی علوم کے ماہر خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام سے خارج فرقوں کے خالق اپنے نفاق کی وجہ سے یہودی ہیں۔ ان جدید مؤرخین میں سے ایک شیخ محمد الخضری اپنی کتاب تاریخ الامم الاسلامیہ میں

رقم طراز ہیں :-

”مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان میں ایک شیطان عبد اللہ بن سبا پیدا ہوا جس نے تعظیم رسول اور اہل بیت کے سلسلے میں بہت غلو کیا اور حضرت علی ابن ابی طالب کو ان کا رئیس اعظم اور وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیا جیسا کہ ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اور کہا کہ یہ لازم ہے کہ حقدار کو صاحب امر بنایا جائے اور جس نے اس کا حق لیا وہ ظالم اور غاصب ہے۔ پھر اس نے حضرت علی ابن ابی طالب کی مدح سرائی میں اس قدر غلو کیا اور آپ کو اس درجہ (الوہیت) پر لے گیا جس کے حضرت علیؑ خود بھی طالب نہیں تھے“

(ص ۲۱۲ طبع ہشتم)

صاحب ”لوامع انوار الہمیہ“ علامہ ابن تیمیہ کے در سالہ ”المحمویۃ الکبریٰ“ سے نقل کرتے ہیں :-

”ابن سبا را نفی فرقے کا بانی منافق زندیق مکتا۔ اس نے دین اسلام میں فساد برپا کرنے کا ارادہ کیا جس طرح دین مسیح کے خلاف پولوس نے کیا تھا جو ان رسائل کا مصنف ہے جو نصاریٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ پولوس نے مسیحیت کو بگاڑنے کے لئے عیسائیوں

میں بدعتوں کو رواج دیا۔ وہ خود یہودی تھا، لیکن ان کی ملت میں فساد برپا کرنے کے لئے بظاہر نصرانی بن گیا۔ اسی طرح ابن سبأ بھی یہودی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے قتل کی کوشش کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کو باغیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ابن سبأ کی بدعتوں اور گمراہیوں کی چند جاہلوتوں نے پیروی کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ بادلوں میں موجود ہیں اور کڑک ان کی آواز ہے اور بجلی کی چمک ان کا کوڑا ہے۔ وہ زمین پر نازل ہوں گے اور اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ جب بھی گرج چمک ہوتی وہ کہتے وعلیک السلام یا امیر المؤمنین (شام کے پہاڑوں میں نصیریوں کا بھی یہی عقیدہ ہے شام کا موجودہ حکمران حافظ الاسد اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے) ان میں سے بعض عقیدہ تناسخ پر یقین رکھتے ہیں اور امامت کو نور تناسخ سمجھتے ہیں (شام و لبنان کے دروزیوں کا یہی عقیدہ ہے) بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت میں ہے اور اس کی روح نے حضرت علیؓ میں حلول کیا ہے۔ پھر ان کے فرزند ارجمند محمد بن الحنفیہ میں حلول کیا تھا۔ بعض یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ اللہ نوری انسان ہے اور اس کا قلب
 حکمت کا سرچشمہ ہے۔ نیز یہ کہ اس نے حضرت محمد صلی
 اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور
 آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت (یعنی
 امامت) پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے
 انکار کر دیا اور اس بار امانت سے ڈر گئے۔ لیکن
 انسان نے اسے اٹھا لیا (یعنی حضرات ابو بکر و عمر
 رضی اللہ عنہما) بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔
 (نقل کفر کفر نہ باشد) بعض کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
 کی روح انبیاء اور ائمہ میں حلول کرتی رہی حتیٰ کہ
 حضرت علیؑ اور آپؐ کی اولاد تک پہنچی۔ وہ محرمات
 کو حلال جانتے ہیں اور قیامت کے منکر ہیں بعض
 نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے ائمہ انبیاء ہیں۔ جنت
 دنیا کے آرام و راحت کا نام ہے اور جہنم دنیا
 کے مصائب و آلام ہیں۔ انہوں نے فرائض کو ترک
 کیا۔ ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف مبعوث کیا تاکہ
 لوگوں کو حضرت علیؑ کی طرف بلائیں لیکن آپؐ نے
 لوگوں کو اپنی طرف بلا لیا۔ حضرت علیؑ، حسنؑ،
 حسینؑ اور فاطمہؑ کی طرف الوہیت منسوب کی وہ
 فاطمہ کے بجائے فاطمہ کہتے ہیں یعنی تائید سے مبرا

کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت جبریلؑ غلطی سے وحی حضرت علیؑ کے بجائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جلتے رہے (مسلل ۲۳ برس تک غلطی کرتے رہے) اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور وہ باطن پر عمل پیرا ہیں۔ ان کی دعوت شریعت کے ابطال پر قائم ہے اور وہ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔ وہ اصل میں مجوسی ہیں جو اس وقت کی پیداوار ہیں جب اسلام میں فتنوں نے جنم لیا اور اختلاف رونما ہوا۔ اسلام کی شان و شوکت ماند پڑ گئی اور دین کا گریبان چاک کر دیا گیا۔ جب وہ اس کی کوئی وضاحت نہ کر سکے تو انہوں نے شریعت کی تاویل اس انداز سے کی جو ان کے مجوسی اسلاف کے قواعد سے جا ملتی تھی۔ ان کا سرغنہ حمدان قرمطی تھا۔ ان کے مذہب کی اصل صابی اور مجوسی مذہب سے ماخوذ ہے۔ ان کے مذہب کی اکثر باتیں بعد میں صوفیوں کے کلام میں شامل ہو گئیں۔ ان کی مثال رسائل اخوان الصفا کے مصنفین کی ہے جن کا اصل مذہب قرامطہ کا مذہب تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کا اکثر حصہ امام جعفر صادقؑ سے غلط طور پر منسوب کیا ہے تاکہ اسے اہل بیت کی

میراث ثابت کر سکیں۔ سلطنت عبیدہ حاکمہ جو اہل بیت کی طرف منسوب تھی اور فاطمین کہلاتی تھی وہ اسی قسم کی تھی۔ ان کا ظاہر مذہب رافضی تھا۔ اور باطن انکار محض۔ ان میں سے ایک فرقہ دروزی ہے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ انکار کرنے والے ہیں۔ (مختصر) شیعہ مذہب حبیبیہ کہ امام ابن تیمیہؒ نے بتایا ہے۔ یہودیت، مجوسیت اور صابیت کا ملغوبہ ہے۔ لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر یہودیت ہی کا ہے۔

اس میں وصایت کا عقیدہ یہودیت ہی سے لیا گیا ہے کہ جس طرح ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے ایسے ہی حضرت علیؓ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ شیعہ مذہب کا سب سے اہم مسئلہ شریعت محمدیہ کا منسوخ ہو جانا اور شریعت آل داؤد اور آل سلیمان علیہما السلام کا احیاء ہے جو خالص یہودی تمناؤں اور آرزوؤں کا مظہر ہے۔

اصول کافی مؤلف کلینی شیعوں کے ہاں حدیث کی صحیح ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کا مرتبہ ان کے ہاں قرآن سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیوں کہ یہی کتاب ان کے عقائد کا سب سے بڑا ماخذ ہے اور چوں کہ اس میں قرآن کی تحریف ثابت کرنے اور ائمہ شیعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسر ثابت کرنے

کے متعلق نہ صرف چند احادیث ہیں بلکہ باقاعدہ ابواب ہیں اس لئے شیعہ حضرات تحریف قرآن کو مانتے اور اپنے ائمہ کو انبیاء کی طرح معصوم سمجھتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمسر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں شیعہ حضرات نے رسالت کی شہادت (محمد رسول اللہ) کے ساتھ اپنے پہلے امام حضرت علی کی امامت پر ایمان رکھنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور جس طرح وہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح عَلِیٌّ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ کہنا بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہر اذان میں بھی توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ حضرت علی کی امامت کی شہادت بھی دیتے ہیں، اور اس طرح اپنے امام کے ہمسر محمد ہونے کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ اصول کافی شیعہ حضرات کی وہ کتاب ہے جس پر ان کے عقائد کی بنیاد ہے۔ اور جس کی روایات کو وہ قرآن سے بڑھ کر سمجھتے ہیں، اگر ایسا نہ سمجھتے تو اس کی بنیاد پر قرآن میں تحریف کے قابل نہ ہوتے بلکہ ان روایات ہی کو موضوع قرار دیتے۔

بہر حال اس اصول کافی میں اسلام کی بنیاد جن پانچ ارکان پر بتائی گئی ہے امام ابو جعفر سے مروی حدیث کے مطابق ان پانچ چیزوں پر ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج اور ولایت یعنی اس حدیث میں لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت کو ولایت یعنی ائمہ پر ایمان سے بدل دیا گیا ہے۔

(اصول کافی مطبوعہ تہران مع ترجمہ فارسی ص ۲۹۹)
 کافی کلینی کی پہلی جلد کے چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔
 باب اس بات میں کہ ائمہ مخلوق الہی پر اللہ کے گواہ ہیں۔
 (ج ۱ ص ۲۷۷)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین پر اللہ کے خلفاء ہیں۔
 (ج ۱ ص ۲۷۵)

باب اس بات میں کہ ائمہ اللہ عز و جل کا نور ہیں۔
 (ج ۱ ص ۲۷۶)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین کے ارکان ہیں۔
 (ج ۱ ص ۲۸۵)

باب اس بات میں کہ ائمہ کے پاس وہ تمام کتابیں موجود
 ہیں جو اللہ عز و جل کی طرف سے نازل ہوئیں چاہے وہ کسی
 زبان میں بھی ہوں۔
 (ج ۱ ص ۳۲۹)

باب اس بات میں کہ ائمہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، تمام
 پچھلے انبیاء و اوصیاء کے علم کے وارث ہیں۔
 (ج ۱ ص ۳۲۴)

باب معیفہ جفر، جامعہ اور مصحف فاطمہؑ کے ذکر میں۔
 (ج ۱ ص ۳۲۴)

اسی باب میں ابو بصیر سے روایت ہے کہ میں نے امام عبداللہ
 (جعفر صادق) سے پوچھا کہ مصحف فاطمہؑ کیا ہے تو آپ نے
 فرمایا کہ وہ ایسا مصحف ہے جو تمہارے قرآن کے مقابلہ میں تین

گنا بڑا ہے اور بخدا اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

اصول کافی کے مزید چند عنوان یہ ہیں۔

باب اس بارے میں کہ ائمہ ملائکہ اور انبیاء کا سارا علم جانتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۷۵)

باب اس بارے میں کہ ائمہ جانتے ہیں کہ وہ کب مرے گے۔ (ج ۱ ص ۳۸۳)

باب اس بارے میں کہ ائمہ تمام ماکان اور مایکون (ماضی و مستقبل) کا علم رکھتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۸۸)

باب اس بارے میں کہ ائمہ علیہم السلام کا جب ظہور ہوگا تو وہ داؤد اور آل داؤد علیہ السلام کے حکم کے مطابق حکومت کریں گے اور کسی کو ان سے دلیل پوچھنے کا حق نہیں ہوگا۔ (جلد دوم ص ۲۴۷)

اسی خطرناک آخری باب میں امام ابو عبد اللہ (جعفر صادق) سے روایت کی گئی ہے کہ جب آل محمد کا امام قائم (مہدی) ظاہر ہوگا تو وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی شریعت کے مطابق حکومت کریں گے اور ان سے اس کی دلیل یا وجہ نہیں پوچھی جاسکے گی۔ (حوالہ بالا)

اس سے واضح ہے کہ ان کا مہدی یہودی ہوگا، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان روایات کے وضع کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟ اسی باب میں یہ روایت بھی ہے کہ عمار سا باطلی سے مروی ہے

کہ میں نے ابو عبد اللہ (امام جعفر صادق) سے پوچھا کہ جب آپ
برسراقتدار آئیں گے تو کس شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے؟
تو انہوں نے فرمایا۔ اللہ اور داؤد کی شریعت کے مطابق۔
(کافی - حوالہ بالا)

یہودی عہد نبوی میں |

یہودیوں نے خود رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو
ختم کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ ایک دفعہ آپ ایک مکان
کی دیوار کے زیر سایہ آرام فرما رہے تھے کہ انہوں نے بھاری
پتھر آپ پر گرانے کا منصوبہ بنایا (لیکن آپ کو بروقت اللہ تعالیٰ
نے باخبر کر دیا آپ وہاں سے اُٹھ گئے) ایک دوسرے موقعہ
پر انہوں نے آپ کی یہودی پڑوسن کے ذریعہ آپ کو بکرے
کے پکے ہوئے پائے ہدیہ کئے جن میں زہر ملا یا گیا تھا۔ یہ سب
باتیں کتب سیر میں موجود ہیں۔

یہودی اور خلافت صدیق اکبرؓ |

آپ کی وفات کے
بعد حضرت ابو بکر
صدیقؓ سریرِ آرائے خلافت ہوئے تو ارتداد کا فتنہ برپا کیا اور
لوگوں کو زکوٰۃ نہ دینے پر اکسایا۔ یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ عام لوگوں
نے سمجھ لیا کہ بس اسلام ختم ہو گیا۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضرت
صدیق اکبرؓ میں فتنوں کو فرو کرنے کی خصوصی صلاحیت اور سمجھ
بوجھ رکھی تھی۔ انہوں نے ان تمام فتنوں کو مختصر عرصے میں ختم کر دیا
تین جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے کر دیئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ

مختصر ترین عرصہ میں ان تمام فتنوں سے بھی عہدہ برآ ہو گئے۔
 ان تمام فتنوں میں یہودیوں، مجوسیوں اور عیسائیوں اور خصوصاً
 یہودی منافقوں کا ہاتھ تھا۔ لہذا اس کا سدباب کرنے کے لئے
 حضرت صدیق اکبرؓ کو کسری اور قیصر و ملے نبرد آزما ہونا پڑا۔
 ورنہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ بلاوجہ کسی
 ملک پر فوج کشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تمام جنگیں
 خواہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لڑی گئی
 ہوں یا خلفائے راشدین کے عہد میں جارحیت کی جنگیں نہیں
 تھیں۔ مسلمانوں کی تمام جنگیں مدافعت میں لڑی گئی ہیں۔
 یا تو کفار نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے یا کوئی اور فتنہ پردازی
 کی ہے جس کے سدباب کے لئے مسلمانوں کو تلوار اٹھانی
 پڑی ہے۔

یہودی اور شہادتِ عمرؓ | یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ
 وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ

عنه کا تو بال بیکانہ کر سکے لیکن دھوکے سے حضرت عمر رضی اللہ
 عنه کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ ابھی اسلامی سلطنت
 کو قائم ہوئے ایک رجب صدی بھی نہیں گزری تھی۔ یہ اسلامی
 سلطنت کے سربراہ کا سب سے پہلا قتل تھا۔ پھر تودینی اور
 سیاسی قتل ایک معمول بن گیا جو آج تک جاری ہے قابل
 ذکر بات یہ ہے کہ اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کا سرغنہ
 مکہ کا یہودی کعب ابن الجراح تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خلیفہؓ

عمرؓ کے قتل کا اشارہ تورات میں موجود ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے دعوے کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب یہ سانحہ رونما ہو چکا تو کعب آپ کے پاس بڑے حزن و ملال کے عالم میں آیا اور کہا: ”کیا میں نے آپ کو بتایا نہ تھا کہ محتاط رہیں؟“

یہودی اور شہادت عثمانؓ | اس طرح اسلامی سلطنت کے سربراہ کے قتل کے جرم میں تین طاقتیں (یہودی، مسیحی اور مجوسی) شریک تھیں۔ پھر خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان کے تیرسم کا نشانہ بنے اور اس کے بعد خلیفہ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب۔ اور پھر تو خلفاء کا قتل ایک معمول بن گیا جو ایک خفیہ طاقت کا کرسم تھا جس کا مرکز جزیرۃ العرب کے قریب یمن میں تھا۔ اور کعب کا نام مکہ و فریب کی ایک ضرب المثل بن گیا اور وہ مکہ بھی جس میں اس کے حواری مکہ و فریب کی تعلیم پاتے تھے۔ پہلے منصوبے بناتے پھر قتل کرتے پھر مقتول کے جنازہ پر روتے پیٹتے۔ (یہ باب ہم نے اخوان المسلمون کے دمشق لیڈر جناب محمد کاظم حبیب کی معرکہ الآراء کتاب ”کتاب الروہ بین الامس والیوم“ سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ”ارتداد“ کے نام سے ہو چکا ہے۔ اصل عربی کتاب مکتبہ علمیہ لاہور سے اردو ترجمہ دار العروبہ۔ المنصورہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مترجم نے اصل کتاب کا وہ حصہ (۱۳۵ تا ۱۳۷) حذف کر دیا

جس میں اس نے شیعہ فرقوں پر شیعہ کتب کی روشنی میں اظہار خیال کیا تھا اور شیعوں کی سب سے مستند کتاب اصول کافی کے اقتباسات اور یہودیوں کے افکار کا تقابلی مطالعہ اس نے جہاں کیا تھا (صفحہ ۱۵۸) اسے بھی حذف کر دیا [ہم نے اصل عربی کتاب سامنے رکھی ہے۔

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ | سیاسی اور دینی قتل چودہ سو سال سے برابر ہوتے آ رہے ہیں اور زیادہ تر مجرم اپنے کیفر گزار کو پہنچتے بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے کہ حضرت عثمان ابن عفان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دردناک قتل، قصاص سے کیوں محروم رہ گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا خلیفہ راشد کیوں باغیوں اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا اور وہ ان سے قصاص لینے میں ناکام رہا۔ وہی حضرت علی جو بارہ سال گزر جانے کے بعد مقتول کے بیٹے کے خون کو معاف کر دینے، خلیفہ راشد کے اپنی جیب خاص سے دیت (خون بہا) ادا کر دینے کے باوجود عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہرمزان کے قتل کا قصاص لینے میں اس قدر مستعدی دکھاتے ہیں کہ خلیفہ ہوتے ہی ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیتے ہیں وہی خلیفہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قصاص سے پہلو ہتی کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے قاتلین عثمان اتنے طاقتور ہوں کہ وہ ان سے قصاص لینے کی قدرت نہ رکھتے

ہوں۔ لیکن حضرت زبیر ابن العوام، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت سعید ابن العاص اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب فوجی طاقت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیں تو بجائے ان کی تائید و حمایت کے ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے پہنچ جاتے ہیں اور انہیں شکست سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جام شہادت نوش فرماتے ہیں اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دایع شکست لے کر واپس آتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک دوسری کوشش کرتے ہیں کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر اس میں حارج ہوتے ہیں اور ان کی راہ میں اپنی افواج قاہرہ کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ تاریخ نے ان حضرات میں سے کسی ایک کا بھی کوئی ایسا ایک فقرہ نقل نہیں کیا کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی خلافت کا دعویٰ کیا ہو یا اپنی طرف لوگوں کو دعوت دی ہو۔ وہ صرف قصاص عثمانؓ کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ جو لوگ ان سے مشورہ کرتے تھے کہ کس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کریں تو سب متفقہ طور پر حضرت علیؓ ہی کا نام لیتے تھے بشرطیکہ وہ قصاص عثمانؓ لینے میں سرگرمی دکھائیں۔

خلیفہ ہونے کی حیثیت سے شہید مظلوم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

ذمہ داری تھی۔ جو حضرات صحابہ قصاص عثمانؓ کے لئے عملی
 جدوجہد کر رہے تھے وہ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
 ایک فریضہ کی ادائیگی میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان سے
 مقاتلہ و مجادلہ کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ
 عنہ نے اسے اپنی مخالفت بلکہ بغاوت پر محمول کیا اور ان کی
 کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے ان سے جنگ کرنے
 کی صورت اختیار فرمائی۔ نہ صرف یہ ہی کیا بلکہ قاتلان عثمانؓ
 ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے اور ان کو بڑے بڑے
 عہدوں سے نوازا گیا۔ مالک بن الاشتر۔ اور محمد بن ابی بکر
 کو اہم صوبوں کا گورنر بنایا گیا۔ یہ لوگ متفقہ طور پر قاتلین
 عثمانؓ میں شامل تھے۔ اور وہ ہر ملکی، قومی، شرعی قانون
 کے مطابق گردن زدنی تھے۔ لیکن انہیں قتل کرنے کے بجائے
 انہیں بڑے بڑے مناصب سے نوازنا ایک ایسا معجمہ ہے جو
 اب تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو حضرت علیؓ کے سب
 سے بڑے وکیل صفائیؒ ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے
 ہیں وہ بھی اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ۔

”حضرت علیؓ نے اس پورے فتنے کے زمانے میں
 جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھیک ایک خلیفہ راشد
 کے شایان شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے
 جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جاسکتی

ہے۔ وہ یہ کہ جنگ جمل کے بعد انہوں نے قاتلین عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ جنگ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے، بادل ناخواستہ ان کو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے گفتگو کرنے کے لئے جب انہوں نے حضرت قعقاع بن عمرو کو بھیجا تھا تو ان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت قعقاع نے کہا تھا کہ ”حضرت علیؓ نے قاتلین عثمانؓ پر ہاتھ ڈالنے کو اس وقت تک مؤخر کر رکھا ہے جب تک وہ انہیں پکڑنے پر قادر نہ ہو جائیں، آپ لوگ بیعت کر لیں تو پھر خون عثمانؓ کا بدلہ لینا آسان ہو جائے گا۔ (البدایہ ص ۲۳۷) پھر جنگ سے عین پہلے جو گفتگو ان کے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان ہوئی اس میں حضرت طلحہؓ نے ان پر الزام لگایا کہ آپ خون عثمانؓ کے ذمہ دار ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا لعن اللہ قتلة عثمانؓ (عثمانؓ کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت) لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے۔ جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مالک بن عمارؓ

الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دے دیئے۔ در آنجا ایک قتل عثمانؓ میں ان دونوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ حضرت علیؓ کے پورے زمانہ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۳۶ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:-
 ”اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خود ان کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویہ رہا ہے اس کے ہر جز کا ایک صحیح محل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں یا اس وقت کے حالات و واقعات میں وہ مجھے مل گیا مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ اسی بنا پر میں نے اس کی مدافعت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔“

(ایضاً خلافت و ملوکیت ص ۱۳۸)

سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے صریح حکم اور

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى - (۲۴۸)

ترجمہ - مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔

کی کیا تاویل کی ہوگی۔ پھر بیعت الرضوان میں جب جوہدہؓ سویا جو بیس سو صحابہ کرام نے خون عثمانؓ کے قصاص پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی اور جس میں خود حضرت علیؓ بھی شریک تھے۔ اس سے جان چھڑانے کے لئے حضرت علیؓ نے کیا جواب سوچا ہوگا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اسلام کے خلاف خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے خفیہ یہودی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ ان کا لقب ”القوة الخفية“ رکھا جائے یا ”فری میسنری“ تحریک۔ لیکن ظاہر ہے کہ پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے۔ فتنوں کی تخم ریزی کرنے والا کتنا ہی عیار اور مکار کیوں نہ ہو جب تک فتنوں کے لئے زمین ہموار نہ کر دی جائے اور حالات سازگار نہ ہوں دشمنوں کی تخم ریزی برگ و بار نہیں لاسکتی اور ان کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ بیرونی عوامل اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب کہ اندرونی عوامل بھی ان کا ساتھ دیں۔ لہذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اندرونی عوامل کیا تھے جو بیرونی عوامل کے لئے مدد و معاون ثابت ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ابھی بقید حیات ہی تھے لیکن مرض الموت میں مبتلا تھے کہ نبولہ شمس
کو خلافت کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی چنانچہ صحیح بخاری میں یہ
روایت موجود ہے کہ

حدثني اسحق قال اخبرنا بشر بن شبيب ابن
ابي حمزة قال حدثني ابي عن الزهري قال
اخبرني عبد الله بن كعب بن مالك الانصاري
وكان كعب بن مالك احد الثلاثة الذين قيب
عليهم ان عبد الله بن عباس اخبره ان علي
ابن ابي طالب خرج من عند رسول الله صلى الله
عليه وسلم في وجعه الذي توفي فيه فقال
الناس يا ابا حسن كيف اصبح رسول الله صلى
الله عليه وسلم فقال اصبح بحمد الله بارئاً
فاخذة بيده عباس بن عبد المطلب فقال له
انت والله بعد ثلاث عبد العصا واني والله
لا رى رسول الله صلى الله عليه وسلم سوف
يتوفى من وجعه هذا في لا عرف وجوه
بنى عبد المطلب عند الموت اذهب بنا الى
رسول الله صلى الله عليه وسلم فلنساله
فيمين هذا الامر ان كان فينا صلنا ذلك و
ان كان في غيرنا صلنا فاوصى بنا فقال
علي انا والله لئن سألنا رسول الله صلى الله

علیہ وسلم فمنعناھا لایعطينا الناس بعد
وانی واللہ لا امل لھا رسول اللہ ﷺ
علیہ وسلم۔

(صحیح بخاری باب مرض النبی ﷺ ووفاته کتاب
المغازی ص ۲۳۹ مطبوعہ مطبعہ مجتہائی دہلی)

ترجمہ :- (امام بخاری کہتے ہیں کہ) مجھ سے اسحق نے
حدیث بیان کی کہ مجھے بشر بن شعیب ابن ابی حمزہ نے
خبر دی کہ مجھ سے میرے والد نے زہری سے حدیث بیان
کہ مجھے عبداللہ بن مالک انصاری نے خبر دی اور کعب بن
مالک ان تین آدمیوں میں سے تھے جن کی (غزوہ تبوک
میں شرکت نہ کرنے پر) توبہ قبول ہوئی تھی کہ انہیں عبداللہ
بن عباسؓ نے خبر دی کہ علی بن ابی طالبؓ مرض الوفا میں
حضور اکرم ﷺ کے پاس سے نکلے تو لوگوں
نے ان سے پوچھا کہ اے ابو حسن (حضرت علیؓ کی کنیت
ہے) رسول اللہ ﷺ نے کس حال میں صبح
فرمائی ؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا الحمد للہ اچھی حالت میں
صبح فرمائی (اب طبیعت ٹھیک ہے) تو عباسؓ ابن عبدالمطلب
ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ان سے کہا کہ
اللہ تعالیٰ کی قسم تین دن بعد تم لاکھٹی کے غلام ہو گے اور
اللہ کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ
وسلم اپنی اس بیماری سے جلدی ہی وفات پا جائیں گے

میں عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے موت سے پہلے کیسے ہوتے ہیں خوب پہچانتا ہوں۔ ہمارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو تو ہم آپ سے بوجھ لیں کہ یہ امر (حکومت آپ کے بعد) کن لوگوں میں ہوگا۔ اگر یہ ہم میں ہی ہوا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے علاوہ غیروں میں ہوا تب بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چارے بارے میں وصیت فرمادیں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اللہ کی قسم اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور آپ نے اس سے انکار کر دیا تو لوگ ہمیں (خلافت) کبھی بھی نہیں دیں گے اور اللہ کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت کا سوال نہیں کروں گا۔

صحیح بخاری کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بقید حیات ہی تھے کہ بنو ہاشم کو یہ فکر دامنگیر ہو گئی تھی کہ ریاست و مملکت کا سربراہ کون ہوگا۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے یہ خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا فیصلہ کرایا جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ حکومت کس کو ملے گی۔ اگر ہمیں ملتی ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمیں نہ ملتی ہے بلکہ ہمارے علاوہ کسی اور کو ملتی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم سے درخواست کی جاتے کہ وہ ہمارے بارے میں اسے وصیت کر جائیں کہ وہ ہمارا خیال رکھے۔ اسلامی حکومت قرآن کریم کی رو سے ایک شورائی نظام ہے۔ جو مسئلہ مسلمانوں کو اپنے باہمی مشورہ سے اپنے وقت پر طے کرنا تھا اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش از وقت دریافت کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق وقت سے پہلے کیا بتا سکتے تھے کہ مسلمان اپنے باہمی مشورہ سے اپنا سربراہ کسے بنائیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ مسئلہ صاف نہیں تھا اور وہ اسے شورائی مسئلہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہ نہیں فرماتے کہ یہ مسئلہ تو شورائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں۔ وقت آنے پر مسلمان معلوم نہیں کیا طے کریں اور کسے اپنا سربراہ بنائیں بلکہ وہ ان کے جواب میں فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے کوئی سوال نہیں کروں گا کہ اگر خدا خواستہ آپ نے بنو ہاشم کی سیادت و امارت سے انکار فرما دیا تو مسلمان آئندہ کبھی بھی حکومت و امارت ہمیں نہیں دیں گے یہ ہمارے لئے ہمیشہ کے واسطے محرومی کا باعث بن جائے گا۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت و امارت کا مسئلہ حضرت علیؑ کے ذہن میں بھی

صاف نہیں تھا۔ وہ بھی اسے خالص شوریٰ مسئلہ نہیں سمجھ رہے تھے۔

علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں اسی حدیث کے ضمن میں شعبیؒ کی ایک مرسل روایت کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورے پر حضرت علیؑ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ :-

وقال علی رضی اللہ عنہ وهل یطمع فی هذا
الامر غیرنا فقال اظن واللہ سیکون۔

(ایضاً حوالہ مذکور)

ترجمہ :- اور حضرت علیؑ نے کہا تھا کہ کیا ہمارے علاوہ کوئی اور بھی اس حکومت کی طمع کر سکتا ہے؟ تو حضرت عباسؓ نے کہا۔ اللہ کی قسم میرا خیال ہے کہ ایسا ہو گا۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ سوال ہی خارج از بحث تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خلافت و حکومت تو ہمارا حق ہے ہی۔ اور کون اس کی طمع کر سکتا ہے؟ یعنی کوئی اور شخص اس کی طمع ہی نہیں کر سکتا۔ حضرت عباسؓ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اللہ کی قسم ایسا ضرور ہو گا اور لوگ اس کی طمع کریں گے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؑ کے پاس گفتگوئے صلح کے لئے ایک وفد بھیجا جس میں حضرت

شرجیل السمطؓ بھی تھے انہوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ مظلوم شہید ہوئے۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

فَقَالَ لَهُمَا الْخِلاَفُ لَا أَقُولُ أَنَّهُ قَتَلَ مَظْلُومًا وَلَا أَنَّهُ قَتَلَ ظَالِمًا۔

توجملہ: تو حضرت علیؓ نے ان دونوں ارکان سے کہا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم شہید ہوتے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ قتل ہونے کے وقت ظالم تھے۔ اسی روایت میں یہ الفاظ بھی حضرت علیؓ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں کہ:

”پھر لوگوں نے ابو بکرؓ کو خلیفہ بنا لیا اور انہوں نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ان دونوں نے اگرچہ بہت اچھے کردار کا مظاہرہ کیا اور امت میں انصاف کیا مگر ہمیں ان پر غصہ یہ تھا کہ وہ لوگ ہمارے اوپر حاکم بن گئے۔ حالانکہ ہم آلِ رسول ہیں۔ مگر ہم نے انہیں معاف کر دیا۔ ان کے بعد عثمانؓ خلیفہ بنائے گئے۔ انہوں نے ایسی باتیں کیں جنہیں لوگوں نے معیوب جانا۔“
(طبری حوادثِ مکملہ)

ان روایات سے واضح ہے کہ شروع ہی سے بنو ہاشم کا یہ خیال تھا کہ خلافت و امارت ہمارا حق ہے۔ ہمیں ہی ملنا چاہیے صحیح بخاری کی ایک اور روایت اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہے

جس میں حضرت علیؓ کی طرف سے واضح طور پر یہ فرمایا گیا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے امر خلافت میں اپنا حصہ یا حق سمجھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سبائی تحریک جس بنیاد پر اٹھائی گئی اس کے لئے زمین پہلے سے سازگار تھی اور کچھ لوگوں کے ذہن اس نظریہ کے لئے پہلے ہی ہموار ہو چکے تھے۔

بخاری کی اس دوسری روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) امام زہریؒ موجود ہیں جن کے متعلق میں بار بار متنبہ کرتا آ رہا ہوں کہ ان حضرت پر تشیع کا داعی ہے۔ چونکہ یہ حدیث ان کے مذہبی عقیدہ کے مطابق ہے۔ لہذا محدثین کے اصول پر یہ حدیث قابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے اسے اپنی صحیح میں درج کر لیا ہے۔

لیکن اگر یہ روایات صحیح ہیں اور ان میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان کو تسلیم کر لیا جائے تو یہودیوں اور شیعوں کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحابہ کی اکثریت اور خلفائے ثلاثہ کے خلاف جو رویہ بتایا جاتا ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ لہذا خلفائے ثلاثہ غاصب اور ظالم تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا تھا۔ لہذا ان کو خلافت سے ہٹانا اور اپنا حق حاصل کرنا ان کے لئے قطعاً جائز تھا۔ وہ

راضی خوشی اپنے منصب سے نہیں ہٹے تو ان کو قتل کر کے اپنا حق حاصل کرنا بھی جائز تھا۔ اس لئے سبائیوں نے حضرت عمرؓ کو شہید کیا تو درست کیا۔ عبید اللہ بن عمرؓ نے ہرمزان کو قتل کیا تو غلط کیا۔ کیونکہ ہرمزان نے صحیح سمت قدم اٹھایا تھا۔ لہذا بارہ سال گزر جانے کے بعد بھی عبید اللہ بن عمرؓ سے ہرمزان کے قصاص لینے کا جواز تھا۔ سبائیوں نے اس کے بعد ایک تیسرے غاصب اور ظالم (حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ) کو شہید کر کے ایک حقدار کے لئے خلافت کا راستہ صاف کر دیا تو وہ بھی ایک صحیح اور جائز اقدام تھا۔ لہذا حضرت عثمانؓ کے قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کا قصاص نہیں لیا تو انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ سبائیوں نے ایک صحیح قدم اٹھایا تھا۔ انہوں نے ایک غاصب اور ظالم کو قتل کر کے حق دار کو اس کا حق دلایا۔ لہذا وہ ہر انعام و اکرام کے مستحق تھے۔ ان لوگوں کو خلیفہ ہونے کے بعد بڑے بڑے عہدے دیتے۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔ وہ اسی کے مستحق تھے۔ انہوں نے مالک ابن الاسختر اور محمد بن ابی بکر کو گورنر بنایا تو کیا غلط کیا۔ کیونکہ ان قاتلین عثمانؓ نے صحیح اقدام کیا تھا اس لئے وہ سجا طور پر اس کے مستحق تھے کہ انہیں بڑے بڑے منصب دے کر نوانا جلاتے۔ شیعی نقطہ نظر یہی ہے۔ انہیں اسے تسلیم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ چاہے اس سے رسول اللہ کی تربیت پر

حرف آتا ہوا دوسرا سلام کی ناکامی ظاہر ہوتی ہو۔

لیکن مشکل عام اہل سنت والجماعت کی ہے جو حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی برحق خلیفہ سمجھتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی امام برحق تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی بخاری و مسلم اور مؤرخین کی متضاد و متناقض روایات پر بھی مکمل ایمان رکھتے ہیں اسی لئے انہیں دور انداز کار تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ ان کے لئے میرے نزدیک صحیح راہ عمل یہی ہے کہ وہ اس قسم کی متضاد روایات کا سرے سے انکار کریں اور کسی ایک روایت کو بھی تسلیم نہ کریں۔ ان روایات میں جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ ان کے متعلق یہ نقطہ نظر اختیار کریں کہ وہ ان پر بہتان ہیں۔ جھوٹی تہمتیں ہیں اور قرآن کریم نے حضرات صحابہؓ کے یا ہی تعلقات کے متعلق جو مراعات فرمائی ہیں، ان کے سراسر خلاف ہیں۔ اب ہم قرآن کریم کے بیانات کو صحیح مانیں یا ان روایات کی ہرزہ سرائیوں کو؟ ہم قرآن کا تو انکار نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن کا انکار کفر ہے۔ البتہ ان روایات کا انکار کر سکتے ہیں۔ رہا قصاص عثمانؓ لینے میں ان کا کمزور رویہ سو اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کی ابتداء میں بعنوان ”حضرت علیؓ کی پویش“ کیا تھا۔ یعنی چونکہ ان میں سیاسی صلاحیتوں کی کمی تھی اس لئے وہ صحیح فیصلے نہ کر پائے بلکہ پے در پے اس قسم کی سیاسی

غلطیاں ان سے سرزد ہوتیں جن کے نتیجے میں وہ سبائی عثمان
اسلام کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ اور باوجود قصاص عثمان
کی آرزو کے اپنی پوری مدت خلافت میں کسی موقع پر بھی
اس فرض کو ادا نہ کر سکے۔ اور ظاہر ہے اس عظیم فرض کی
ادائیگی میں جو کمزوری ان سے ظاہر ہوئی الہی فرمان کے
مطابق اس کے نتائج انہیں بھگتنے پڑے۔ اور جس جس نے
بھی قصاص عثمان میں کی گئی اس کمزوری پر اظہار ندامت
اور اعتراف خطا کرنے کے بجائے دھٹائی دکھائی اور قرآنی
قوانین کی بالائری سے انکار کیا اس نے اس کی سزا پائی۔
اگر آج بھی ملت اسلامیہ اس واقعہ سے عبرت حاصل نہیں
کرے گی اور قانون کی بالادستی پر اپنے ایمان میں پختگی پیدا
نہیں کرے گی تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو تاریخ کی اور بہت
سی اقوام، جماعتوں اور اشخاص کا ہوا۔ کیونکہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ
اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (۳۵)

تحریک ابن سبا اور القوۃ الخفیہ | گذشتہ صفحات

حقائق سے ثابت کیا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے خفیہ تنظیم جس
کا نام عہد صحابہ میں القوۃ الخفیہ تھا اور آج کل اس کا نام
فری میسن (FREE MESSON) ہے۔ یہی تنظیم حضرت
عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سارے فتنہ کی ذمہ دار تھی۔
جس کا سرغنہ اس زمانہ میں عبد اللہ بن سبا تھا جسے ابن اسودؓ

بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ماں سیاہ رنگ کی تھی اور اس لئے
بھی کہ وہ سیاہ تحریک چلا رہا تھا۔

آج کل سبائیوں کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ عبداللہ
بن سبا یہودی کی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا جائے۔ اس کا شوشہ
سب سے پہلے مصری ادیب ڈاکٹر طہ حسین نے چھوڑا تھا جو
خود بھی فری میسن کا ممبر تھا۔ یہود سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم
تھا کہ یہودیوں کے پیشوا حاکم ناحوم آفندی کو عربی ادب
کے ماہرین کانگراں مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر طہ حسین ہی کی زیر نگرانی
قاہرہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی (کلیۃ الآداب) میں جو پہلا
تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا اس کا عنوان تھا ”عرب میں یہودی
قبائل“ پیش کرنے والا طالب علم اسرائیل ولفسون تھا جو
آج کل تل ابیب کی ہاواسا یونیورسٹی میں ڈین ہے۔

ڈاکٹر طہ حسین نے پہلے ایک کتاب ”الشعر الجاہلی“ کے
نام سے لکھی تھی جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں جن تاریخی
قصص کا تذکرہ ہے وہ سب فرضی کہانیاں ہیں جن کا حقیقت
سے کوئی تعلق نہیں، اس پر عالم عرب میں ایک زلزلہ آگیا۔

اسے یہ تمام تفصیل ڈاکٹر طہ حسین کے فکری متبع شیعہ ادیب مرتضیٰ عسکری
نے اپنی کتاب ”مع رجال الفكر فی القاہرہ“ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۳ء ص ۱۶۶
میں دی ہیں۔ مرتضیٰ عسکری نے طہ حسین کی تائید میں ابن سبا کے
انکار پر تین جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی ہے جو شیعوں میں بہت مقبول

اور طلحہ حسین پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ لیکن چونکہ انہیں فری میسن اور اس کے ممبران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے کوئی بھی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔

اس کے بعد طلحہ حسین نے ایک اور کتاب ”الفتنۃ الکبریٰ“ کے نام سے لکھی جس میں شہادت عثمانؓ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سبا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک فرضی کیریکٹر ہے۔ واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ سبائی اسے لے اڑے اور اس پر مستقل تصدیق کر ڈالیں۔ غالباً طلحہ حسین نے یہودیوں اور سبائیوں کو خوش کرنے کے لئے ہی یہ شوشہ چھوڑا تھا۔ ورنہ تاریخ کا کوئی طالب علم بھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سنی کتابوں کو چھوڑتے خود شیعہ کتابوں میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاریخ طبری میں جو خود زیدی شیعہ ہونے کے علاوہ سبائی راویوں کی روایات کا سب سے زیادہ مستند مجموعہ ہے اس کا تذکرہ کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً ۳۵ھ کے احوال میں اس کا اور اس کے مشن کا تذکرہ موجود ہے۔ طبری کی اس مفصل روایت سے شورش کی اصل بنیاد اور اس کے حقیقی سبب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ:-

”عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا جس کا وطن صنعاء (یمن کا ایک شہر) تھا۔ اس کی ماں کالی کلوٹی تھی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں (منافقانہ) مسلمان ہو گیا

اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف اسلامی
 شہزادوں میں اس نے دورے شروع کر دیئے۔ پہلے
 حجاز آیا، پھر بصرہ، کوفہ اور شام گیا۔ شام میں اسے
 کوئی معاون نہ مل سکا اور وہاں کے لوگوں نے
 اسے ملک بدر کر دیا تو وہ بھاگ کر مصر پہنچا۔۔۔۔۔
 اس نے ناواقف مسلمانوں میں جو عقائد باطل پھیلانے کا
 تذکرہ کرتے ہوئے طبری لکھتا ہے۔

”ایک ہزار انبیاء گزرے ہیں۔ ہر نبی کا ایک وصی
 ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 کے وصی تھے۔ آنحضور خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت
 علیؑ خاتم الاولیاء ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ
 کون ظالم ہو گا جس نے وصی رسول کے حق پر دست
 درازی کی۔۔۔۔۔“

پھر اس نے کہا کہ:-

عثمانؓ نے خلافت پر بغیر استحقاق کے قبضہ کر لیا
 ہے اور یہ یعنی حضرت علیؑ وصی رسول ہیں۔ تو اس
 بارے میں تم لوگ اٹھ کھڑے ہو اور انہیں ہٹا دو۔
 جسکی ابتداء اپنے امراء (عثمان عثمانی) پر طعن و تشنیع
 سے کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔۔۔۔۔“
 پھر اس نے اپنے داعیوں کو مختلف اسلامی ممالک
 میں بھیجا جو خفیہ طور پر تو اس کی (بغاوت اور مندرجہ

بالا عقیدہ فاسدہ کی) تبلیغ کرتے تھے اور ظاہر
 میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے (یعنی
 ظاہر میں مصلح اور مبلغ بنے ہوئے تھے)۔
 اپنے مفسدانہ عزائم کی تکمیل کے لئے جو طریقہ انہوں نے
 استعمال کیا وہ یہ تھا۔

”ہر شہر میں یہ مفسد دوسرے شہر کے مفسدوں کو خطوط
 لکھتے تھے جن میں اپنے امراء و حکام کی مذمت کرتے
 تھے۔“ (تاریخ طبری جلد پنجم مطبوعہ مصر ص ۹۸
 احوال ۳۵)

نیز اسی ۳۵ھ کے احوال میں جہاں مفسد اور باغیوں کی
 آمد مدینہ کا تذکرہ ہے وہاں پھر لکھتے ہیں کہ
 ”اور ان کے ساتھ ابن السودا بھی تھا“

علامہ ابن کثیرؒ کی تاریخ البدایہ والنہایہ میں جنگ جمل کے
 موقع پر بھی اس کی موجودگی کا تذکرہ موجود ہے۔

تیسری صدی ہجری کے مشہور شیعہ عالم نوپختی اپنی کتاب
 ”دفرق الشیعہ“ مطبوعہ نجف میں رقم طراز ہے۔

وحکی جماعة من اهل العلم من اصحاب علی
 علیہ السلام ان عبد اللہ بن سبا کان یهودیا
 فاسلم ووالی علیا علیہ السلام وکان یقول
 وهو علی یهودیۃ فی یوشع بن نون وصی بعد
 موسیٰ علی نبینا والہ وعلیہما السلام بالغلو

فقال في اسلامه بعد وفاة النبي صلى الله عليه
وسلم في علي عليه السلام بمثل ذاك وهو
اول من شهر القول بغرض امامة علي عليه
السلام واطهر البراعة من اعدائه و
كاشف مخالفيه فمن هنا قال من خالف
الشيعة ان اصل الرفض ماخوذ من اليهود-
(فرقا الشيعة ص ۴۴)

ترجمہ :- حضرت علیؑ کے رفقاء میں سے اہل علم
کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ ابن سبأ پہلے یہودی
تھا پھر اسلام قبول کر کے حضرت علیؑ کے جاں نثاری
میں شامل ہو گیا، یہ اپنے دور یہودیت میں حضرت
موسیٰ کے بعد یوشع بن نون کی امامت کا شد و مد سے
قابل تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے یہی نقطہ نظر
حضرت علیؑ کے لئے اختیار کیا۔ اسی نے سب سے پہلے
حضرت علیؑ کی امامت کی فرضیت کو شہرت دی اور
حضرت علیؑ کے مخالفین پر برا کہنے کی اور ان کے پول
کھولنے کی جرات کی۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین شیعہ ان
افکار کی بنا پر شیعیت کو یہودیت سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔
اسی کتاب میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نہ

كان ممن اظهر الطعن على ابي بكر وعمر و
عثمان والصحابه وتبوا منهم وقال ان

علیہ السلام امرہ بذالک۔ (ص ۷۷)

ترجمہ :- اسی نے ابو بکر و عمر و عثمان و صحابہ پر طعن و تشنیع کرنے کی ابتدا کی، وہ کہا کرتا تھا کہ اس بات کا مجھے علی علیہ السلام نے حکم دیا ہے۔

اس قدیم ترین شیعہ مؤرخ کے بعد شیعہ اسامہ الرجال کی سب سے قدیم اور سب سے مستند کتاب ”رجال کشی“ میں بھی جگہ جگہ ابن سبا اور اس کی جماعت کا تذکرہ موجود ہے اور اپنے ائمہ سے متعدد روایات بیان کر کے نوبختی کی تائید کی گئی ہے۔

(ملاحظہ ہو ”رجال کشی“ مطبوعہ کربلا ص ۹۷ تا ص ۱۰۱)

اس کے بعد آج تک کی تمام سنی تالیفوں اور شیعہ اسامہ الرجال کی کتابوں میں ابن سبا اور اس کی پارٹی کا تذکرہ موجود ہے۔ اس سبائی پارٹی کے بعض افراد کو حضرت علیؑ کے حکم سے آگ میں جلاتے جانے کی تائید سنیوں کی سب سے مستند کتاب صحیح بخاری سے بھی ہوتی ہے اور شیعوں کی تمام کتب رجال میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

ان تصریحات کے بعد تمام مؤرخین کے بیان کردہ اس متواتر واقعے کا انکار عجیب دیدہ دلیری ہے۔ اور یہ جرات وہی شخص اور طبقہ کر سکتا ہے جو قرآنی بیانات سے انکار کرنے میں بھی دریغ نہ کرے جیسا کہ طہ حسین نے قرآنی قصص کا انکار کر کے دھڑائی کا مظاہرہ کیا ہے اور شیعوں نے قرآنی

ارشاد دَبَّانَیْقَ (۳۳) کے باوجود سوائے حضرت فاطمہؑ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تین صاحبزادیوں کا انکار کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ روزِ روشن میں چمکتے ہوئے سورج کے انکار کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔

ہر صاحبِ علم کے نزدیک طلحہ حسین اور اس کے متبع شیعوں کی طرف سے ابنِ سبا کے انکار کی وہی حیثیت ہے جو اردو کے مشہور ادیب و مؤرخ، سوانح نگار و مترجم قرآن مرزا حیرت دہلوی کے واقعہ کربلا کے انکار کی ہے۔ مرزا صاحب نے کتاب شہادت کے نام سے چھ جلدیں جو تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لکھی تھیں۔ اپنے رسالے کربن گزٹ میں وہ اس موضوع پر سا لہا سا ل لکھتے رہے کہ تاریخی طور پر واقعہ کربلا کا وجود ثابت نہیں کیونکہ ابتدائی دور کی حدیث و تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نہ موطا امام مالکؒ میں اس کا ذکر ہے نہ موطا امام محمدؒ میں، نہ بخاری میں، نہ مسلم میں نہ طبقات ابن سعد (اسما الرجال) اور تاریخ کی سب سے پہلی کتاب) میں نہ کسی اور قدیم کتاب میں۔ پہلی مرتبہ ابو مخنف شیعہ نے اس موضوع پر مقتل حسینؑ کے نام سے کتاب لکھی جو سراسر افسانہ ہے اور اس شخص کے جھوٹے، کذاب اور افسانہ گو ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اسی ابو مخنف کے حوالہ سے طبری وغیرہ نے اپنی کتابوں اور تاریخوں میں یہ واقعہ نقل

کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا پہلا راوی ہی ناقابل اعتبار ہے تو اس قصے کی کیا تاریخی حیثیت ہے۔

لے یہ کتاب شہادت مدت سے نایاب تھی اب حال ہی میں اس کی ایک جلد مکتبہ جبار الحق کراچی ۱۶ ا۔ جے ناظم آباد کراچی نے شائع کی ہے۔ اس کی پانچ جلدوں کا فولٹو اسٹیٹ مشہور علم دوست خالد ایم اسحق ایڈوکیٹ کی لائبریری میں موجود ہے۔ چھٹی جلد کہیں دستیاب نہیں کیونکہ شیعہ حضرات نے مرزا حیرت کا پریس اور مکتبہ جلا دیا تھا جبکہ یہ آخری جلد زیر طبع تھی۔ پانچ مطبوعہ جلدیں ہمدرد لائبریری اور کچھ دوسری پرائیویٹ لائبریریوں میں موجود ہیں۔

(کتاب الدیات)

ہمارے فقہاء کرام نے قتل کی پانچ قسمیں فرمائی ہیں۔ قتل عمد، قتل شبه عمد، قتل خطا، قتل فی القصد، قتل خطا، قتل فی الفعل، قتل قائم مقام خطا۔ ان سب کی تعریف جو کچھ فقہاء کرام نے فرمائی ہے اسے ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

(۱) قتل عمد: کسی کو ہتھیار سے مار ڈالنا یا کسی ایسی دھاردار چیز سے جو ہتھیار کے قائم مقام ہو قتل کر دینا۔ مثلاً دھاردار لکڑی، ہانس کا دھاردار پٹھا پتھر کا دھاردار ٹکڑا۔ نیز آگ میں جلا دینا۔

(۲) قتل شبه عمد: بغیر کسی ہتھیار اور دھاردار چیز کے کسی کو قتل کر دینا۔ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بڑے پتھر یا بڑی لکڑی سے جس میں دھار نہ ہو مار ڈالنا بھی قتل عمد ہے البتہ کسی ایسی چیز سے مار ڈالنا جس سے عموماً قتل نہ کیا جاتا ہو۔ مثلاً کسی چھوٹے ہتھیار سے مارنا کہ

اس سے عموماً قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ تادیب اور تنبیہ کا ارادہ ہوتا ہے۔

(۳) قتل خطاء فی القصد :- یہ ہے کہ کسی نے فاصلہ سے ایک چیز کو شکار سمجھتے ہوئے اس پر گولی چلا دی لیکن وہ شکار کے بجائے آدمی تھا۔ گولی اسے لگی اور وہ مر گیا یا یہ کہ گولی چلانے والے نے اسے حربی کا فر سمجھ کر اس پر گولی چلائی تھی لیکن وہ مسلمان نکلا۔

(۴) قتل خطاء فی الفعل :- یہ ہے کہ گولی چلانے والے نے ایک نشانہ پر گولی چلائی تھی لیکن وہ کسی آدمی کو لگ گئی۔

(۵) قتل قائم مقام خطاء :- یہ ہے کہ آدمی چھت پر سو رہا تھا جس پر منڈیر نہیں تھی۔ اس نے کروٹ لی اور نیچے کسی آدمی پر گر گیا اور جس پر وہ گرا وہ مر گیا۔ یا کسی نے ایسی زمین میں جو اس کی ملکیت نہیں تھی کنواں کھود لیا اور اس میں کوئی گر کر مر گیا۔

لیکن قرآن کریم نے قتل کی یہ پانچ قسمیں بیان نہیں فرمائیں۔ چونکہ ہمارے فقہاء نے ان پانچوں صورتوں کے احکام میں قیاسات یا روایات کی وجہ سے فرق فرمایا ہے اس لئے انہوں نے سہولت کی خاطر قتل کی پانچ قسمیں فرمائی ہیں۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی قسمیں بیان فرمائی ہیں جو عمدہ قتل خطاء اور ان ہی کی سزائیں بیان فرمائی ہیں جو انتہائی اور آخری سزائیں ہیں۔ حالات و واقعات کی وجہ سے

حاکم وقت کو ان میں تخفیف و تشدید کا حق ہوتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ حالات و واقعات کے ماتحت تشدید و تخفیف کا حق حاکم وقت کو دیدینا مناسب ہے۔ بجائے اس کے کہ اسے متعین کر کے حاکم کو ان کا پابند بنادیا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے حالات و واقعات کے ماتحت جو تشدید و تخفیف فرمائی تھی اس سے حاکمان وقت کو رہنمائی حاصل کرنی چاہیے لیکن ایسی پابندی ضروری نہیں کہ وہ اس سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہ ہو سکیں۔ قتل عمد کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے بحث کر چکے اور بتا چکے ہیں کہ قتل عمد میں قَوْدُ (جان کے بدلے جان) واجب ہوتی ہے شہ عہد میں ہمارے فقہاء کرام دیت اور کفارہ کے قائل ہیں۔ بہت سی ایسی صورتیں جنہیں ہمارے فقہاء کرام نے قتل عمد شمار نہیں کیا بلکہ شہ عہد قرار دیا ہے ہمارے خیال میں وہ شہ عہد نہیں بلکہ قتل عمد ہی ہیں اور ان میں بجائے دیت کے قَوْدُ ہی ہونی چاہیئے۔ قتل عمد کی جو تعریف ہمارے فقہائے کرام نے فرمائی ہے وہ خود بھی اس پر قائم نہیں رہے۔ قتل عمد ان کے نزدیک یہ ہے کہ آٹھ قتل یا کسی دھار دار چیز سے قتل کیا جائے تو وہ قتل عمد ہوتا ہے۔ لیکن اس تعریف کے باوجود اگر کوئی شخص کسی کو بڑے پتھر سے کچل کر مار ڈالے، پانی میں غرق کر کے مار ڈالے، یا آگ میں کسی کو جلا دے تو ان صورتوں میں ہمارے فقہاء خود بھی

دیت کے قاتل نہیں بلکہ قَوْد (جان کے بدلے جان) کے قاتل ہیں۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں نہ لوہے کا آئہ قتل ہیں اور نہ دھار دار چیزیں ہیں۔ لہذا ہمارے نزدیک قتل عمد کی تعریف یہ ہونی چاہیے کہ قاتل کسی کو قتل کر دے اور وہ عمدًا ایسا کرے۔ اس کا ارادہ جان سے مار ڈالنے کا ہو وہ کسی غلطی کی بناء پر اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ یعنی نہ خطا فی القصد ہو نہ خطا فی الفعل ہو۔ باقی تینوں قسمیں جو قتل خطا کی بیان کی گئی ہیں۔ یعنی (۱) خطا فی القصد (۲) خطا فی الفعل اور (۳) قائم مقام خطا یہ سب قتل خطا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جرم کی خفت اور شدت کے لحاظ سے تینوں میں یقیناً فرق ہے اور عدالت کو ان کی شدت اور خفت کو مد نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے یقیناً جرائم کی شدت و خفت کو مد نظر رکھتے ہوئے سزائیں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔ کہیں دیت مغلظہ اور کہیں دیت غیر مغلظہ۔ ہماری عدالتوں کو بھی جرائم کی شدت و خفت کا لحاظ رکھنا چاہیے اور سنت نبوی اور سنت خلفاء سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

سب جرائم یکساں نہیں | تمام جرائم یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں حالات

و کوائف کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ شراب نوشی جرم ہے اور قابل تعزیر ہے۔ لیکن ایک شخص اپنے گھر میں بند کر

میں شراب پیتا ہے۔ دوسرا آدمی کسی ببلک بمقام پر کھلم کھلا سب کے سامنے شراب نوشی کا جرم کرتا ہے۔ تیسرا آدمی مسجد میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتا ہے۔ چوتھا آدمی حرم کعبہ میں اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ شراب نوشی کے جرم کا ارتکاب چاروں نے کیا ہے لیکن جرم کی شناخت یکساں نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان چاروں کو یکساں سزا نہیں دی جاسکتی۔ جرائم کی شناخت و قیامت کو مد نظر رکھتے ہوئے سزائیں بھی سخت اور شدت اختیار کی جائے گی۔

شریعت نے اجماع صحابہؓ کے مطابق اس کے لئے تعزیراً اسی کوڑے مقرر کئے ہیں لیکن تمثیلاً مذکورہ چاروں صورتوں میں یکساں سزا نہیں دی جاسکتی۔ جیسے جرائم شدید اور خفیف ہیں ایسے ہی ان کے سزائیں بھی مختلف ہونی لازمی ہے۔

جرم زنا کی سزا قرآن کریم نے سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن ایک زنا تو یہ ہے کہ تراضی طرفین سے زنا کا ارتکاب کیا جائے۔ دوسری زنا یہ ہے کہ زنا بالجبر کیا جائے۔ عورت روتی چلاتی رہی لیکن زبردستی اس کے ساتھ زنا کیا گیا۔ تیسری زنا یہ ہے کہ ایک نابالغ معصوم بچی کو زبردستی اپنی حیوانی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ چوتھی زنا یہ ہے کہ زبردستی کسی نابالغ بچی کو کسی مقدس اور پاکیزہ مقام پر مثلاً کسی بزرگ کے مزار پر یا کسی مسجد یا خانقاہ میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا اور یہ شنیع حرکت کی گئی۔ کہنے کو تو یہ سب صورتیں زنا ہی کی ہیں۔

لیکن اپنے خصوصی حالات اور کوائف کو بھی نظر میں رکھا جائے تو جرم اور جرم میں بڑا فرق ہے۔ عدالت کا فرض ہے کہ ان حالات و کوائف کو بھی نظر میں رکھے اور ان کے مطابق سزا میں تخفیف و تشدید سے کام لے تمام مجرموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جاسکتا۔

قتل خطار کی ہمارے فقہاء نے تین صورتیں تجویز فرمائی ہیں۔ یقیناً ان سب میں شناعیت و قباحیت کے اعتبار سے فرق ہے اور اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے مگر یہ سب قتل خطار کی صورتیں ہیں اور ان کی سزا بھی قتل خطار کی سزا یعنی کفارہ اور دیت ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک مؤمن غلام یا کنیز کو آزاد کیا جائے اور دیت یہ ہے کہ خون کی قیمت ادا کی جائے جسے خوں بہا کہتے ہیں۔ اگر غلام یا کنیز مسلمان آزاد کرنا ممکن نہ ہو جیسا کہ آج کل اس کا امکان نہیں ہے تو دو مہینے مسلسل اور متواتر روزے رکھے جائیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا
 خَطَاً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
 مُؤْمِنَةٍ وَدِيَّةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ
 تَصَدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ
 وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ
 كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ

فَدِيَّةً مُسَلَّمَةً إِلَىٰ أَهْلِهِمْ وَ تَخْوِيزًا رَّقَبَةٍ
 مُّؤَمَّنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ شَهْرَيْنِ
 مُّتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ
 عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۴۳)

ترجمہ :- اور (دیکھو) کسی مسلمان کو سزاوار نہیں
 کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے، مگر یہ کہ غلطی سے (اور
 شبہ میں) اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے۔ اور جس
 کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے (اور شبہ میں) قتل
 کر دیا ہو، تو چاہیے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے
 اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا ادا کرے۔ اگر
 مقتول کے وارث خون بہا معاف کر دیں تو ایسا کر سکتے
 ہیں۔ اور اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جو تمہاری
 دشمن ہے (یعنی تم سے برسر جنگ ہے) مگر مؤمن ہو۔
 (اور کسی نے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی دشمنوں میں سے ہے اسے
 قتل کر دیا ہو) تو چاہیے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے
 (خون بہا کا دلانا ضروری نہ ہوگا، کیونکہ اس کے وارثوں
 اور ساتھیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہے)۔ اور اگر مقتول
 ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ صلح
 ہے (یعنی معاہدہ ہو) تو چاہیے کہ قاتل، مقتول کے
 وارثوں کو خون بہا بھی دے اور ایک غلام بھی آزاد
 کرے جو مسلمان ہو۔ اور جو کوئی غلام نہ پائے (یعنی

اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ غلام کو مال کے بدلے حاصل کرے اور آزاد کرائے (تو اسے چاہیے کہ لگاتار دو مہینے روزے رکھے۔ اس لئے کہ اللہ کی طرف سے یہ (اس کے گناہ کی) توبہ ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور (اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

عام کفاروں میں جہاں ایک غلام آزاد کرنے کا یا روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر غلام دستیاب نہ ہو اور روزے نہ رکھ سکے تو ساعط مسکینوں کو کھانا کھلانے کی سہولت بھی دی گئی ہے۔ لیکن قتل خطا کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ رعایت نہیں دی۔ کیونکہ قرآن کریم نے اسے بیان نہیں کیا۔ اور مقادیر قیاس سے متعین نہیں کی جاسکتیں اس کے لئے منصوص تصریح ضروری ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے فقہاء یہ بیان فرماتے ہیں کہ جزاء پر جب ”قار“ آتی ہے تو اس کا مقصد ہی یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ فار کے بعد جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ پوری جزاء ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں ہے اصول فقہ میں اس کی تفصیلات بیان کر دی گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موضع بیان میں کسی بات کو نہ بیان کرنا اس کی دلیل ہوا کرتی ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں کفارہ کا بیان ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کو یہاں کفارہ کا پورا بیان کرنا لازم تھا۔ موضع بیان میں کھانا کھلانے کا بیان نہیں ہوا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ کھانا کھلانا کفارہ ہے ہی نہیں۔ ہمیں ان دونوں

اصولوں سے پورا پورا اتفاق ہے اور قتلِ خطار کے کفارہ میں صرف دو چیزیں ہی کفارہ بن سکتی ہیں۔ یا تو وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے یا پھر لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ ساتھ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے گناہ کا کفارہ نہیں ہوگا۔

(ملاحظہ فرمائیے ہدایہ مع حواشی ص ۵۸۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

ہمیں یہاں یہ بات دہرانے کی اجازت دیجیے کہ یہ دونوں اصول ہمارے فقہاء کرام کی نظروں سے جرمِ زنا کی سزا میں بالکل ہی اوچھل ہو گئے۔ وہاں بھی۔

أَبْوَائِنَةَ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا مَلَّ وَاحِدٍ مِّنْهَا
مِائَةً جَلْدَةٍ ط (۲۴)

ترجمہ :- زنا کار عورت اور زنا کار مرد (زنا کے مرتکب ہوں) تو ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔

اس آیت کریمہ میں بھی جزاء پر فاء آرہی ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے بعد جو جزاء بیان کی جا رہی ہے وہ پوری جزاء ہے۔ جزاء کا ایک حصہ نہیں ہے۔ نیز موضع بیان میں کسی بات کو بیان نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مقصود ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے فقہاء رجم کے قائل ہیں کہ اگر زنا کار شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے

۸۔ خامہ انگشت بدنداں ہے۔۔۔۔۔ لے

شبہ عمد کی دیت کیا ہے | خوں بہا امام ابو حنیفہؒ اور

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سواونٹ ارباٹھا ہونے چاہئیں یعنی چار طرح کے اونٹ ہوں۔ پچیس^{۲۵} بنت مخاض یعنی جن کی عمر ایک سال ہو چکی ہو اور دوسرے سال میں لگ رہے ہوں اور پچیس^{۲۵} بنت لبون ہوں یعنی دو سال کے پورے ہو چکے ہوں اور تیسرے سال میں لگ رہے ہوں۔ اور پچیس^{۲۵} حقے ہوں یعنی جو تین سال کے ہو چکے ہوں اور چوتھے سال میں لگ رہے ہوں۔ اور پچیس^{۲۵} جذعے ہوں یعنی جو چار سال کے ہو چکے ہوں اور پانچویں سال میں لگ رہے ہوں۔

امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سواونٹ اٹلانا ہوں گے یعنی تین طرح کے ہونے چاہئیں۔ تیس^{۲۵} جذعے (چار سالہ) تیس^{۲۵} حقے (تین سالہ)۔ اور چالیس^{۲۵} ثنیۃ یعنی (پانچ سالہ) اور یہ چالیس کے چالیس حاملہ ہوں۔ ان کے پیٹ میں بچے ہوں۔

قتل خطا میں دیت | لیکن قتل خطا میں دیت اخاسا ہونی چاہیے یعنی پانچ طرح کے اونٹ ہوں۔ بیس^{۲۵} بنت مخاض (یک سالہ اونٹنی) بیس^{۲۵}

لے اس کی تفصیل ہماری کتاب ”رحم حد ہے یا تعزیر“ میں گزر چکی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

بنت لبون (دو سالہ اونٹنی) بیٹس ابن مخاض (ایک سالہ نر اونٹ) بیٹس حقے (تین سالہ اونٹ) بیٹس جذعے (چار سالہ اونٹ)۔

شبہ عمد کا جرم قتل خطار کے مقابلہ میں شدید ہے۔ اسی لئے قتل شبہ عمد میں دیت بھی زیادہ شدید رکھی گئی ہے۔ قتل خطار میں چونکہ جرم خفیف ہے۔ قاتل نے قصداً کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ غلطی سے جرم سرزد ہوا ہے۔ اس میں اتنا ہی ہے کہ گولی چلانے والے نے احتیاط سے کام نہیں لیا اس لئے اس کی دیت بھی خفیف رکھی گئی ہے۔

لیکن ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم نے قتل عمد ہی کو بیان کیا ہے۔ شبہ عمد کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا لہذا قتل عمد اور قتل شبہ عمد ایک ہی چیز ہے۔ قرآن کریم شبہ عمد کو بھی قتل عمد ہی شمار کرتا ہے اور اس کی سزا بھی وہی ہے جو قتل عمد کی ہے یعنی سزائے موت۔ ان دونوں میں دیت نہیں ہے ان دونوں میں اولیاء مقتول کو نہ معاف کرنے کا حق ہے نہ کسی مال پر صلح کر لینے کا۔ قتل عمد اور قتل شبہ عمد حق و رثاء نہیں ہے بلکہ حق مملکت ہے۔ اس میں مدعی حکومت ہے۔ مقتول کے ورثاء نہیں ہیں۔ لہذا معافی یا صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیت یعنی خون بہا صرف قتل خطار میں عائد ہوتی ہے۔

دیت عاقلہ پر | احادیث میں دیت کے متعلق آتا ہے کہ قتل خطا میں دیت عاقلہ پر یعنی قاتل

کے خاندان پر واجب ہوگی اور کفارہ خود قاتل کو ادا کرنا ہوگا۔ لیکن ایسا کرنا عرب کے قبائلی نظام میں تو ممکن تھا۔ آج کے غیر قبائلی نظام میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں خصوصی حالات میں اجتماعی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے یعنی مثلاً جس محلہ یا قریہ میں کوئی جرم ہوا اس کی پوری آبادی پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اسے امداد باہمی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ دیت کی مقدار بہت زیادہ رکھی گئی تھی اور ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو عرب میں قتل و غارتگری کا بازار بہت زیادہ گرم تھا اور اس سلسلہ کو بند کرنا ضروری تھا۔ بغیر سخت سزا کی صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کو چھڑانا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ مقدار اتنی تھی کہ کسی ایک آدمی کی استطاعت سے یقیناً باہر تھی اس لئے امداد باہمی کے ذریعہ اس کو پورا کرایا گیا۔ لیکن نہ وہ حالات ہیں نہ اس کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ طریقہ اسلام کے مسلمہ اصول کے خلاف بھی ہے۔ لیکن خصوصی حالات میں اس کو نافذ کرنا ضروری تھا۔ اور آج بھی اگر ویسے ہی خصوصی حالات پیدا ہو جائیں تو یہی طریقہ نافذ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں جرائم کے سلسلہ میں جو عام اصول دیا ہے وہ یہی ہے

کہ :-

لَا تَزِدْ وَلَا يَذَرُكَ ذَرٌّ أَخْرَى -

(۱۴۴ ذ ۱۴۵ ذ ۱۴۶ ذ ۱۴۷ ذ ۱۴۸ ذ)

ترجمہ :- کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا
بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

یہ الفاظ سورۃ انعام ، سورۃ اسرار ، سورۃ فاطر ، سورۃ
زمر اور سورۃ النجم میں وارد ہوئے ہیں۔ یعنی پوری پانچ جگہ۔
اس کے علاوہ :-

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲۸۶)

ترجمہ :- ہر نفس انسانی کو اسی کا فائدہ ہوگا جو
اس نے کمایا اور اسی کا نقصان پہنچے گا جو اس سے
سرزد ہوا۔

اور

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(۳۵)

ترجمہ :- ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے
گا جو اس نے کمایا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور

ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(۱۴۱)

ترجمہ :- پھر ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے

گا۔ جو اس نے کمایا اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔
اور

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ۔ (۱۳/۵۱)

ترجمہ ۱۔ تاکہ اللہ ہر نفس کو اس کی جزا دے
جو اس نے کمایا تھا۔

اور

مَا آصَابَكُمْ مِّنْ مَّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ آيٰتُنَا
(۲۲/۳۲)

ترجمہ ۲۔ جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہارے
ہی کامیوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔

اور

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ
(۲۴/۳۸)

ترجمہ ۱۔ ہر نفس اسی میں ماخوذ ہے جو اس نے
کمایا۔

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں جن کا
احصاء بہت مشکل ہے۔ ہم نے وہی آیات پیش کر دی ہیں جو
اس موضوع پر نہایت واضح اور صریح ہیں۔ ان تمام آیات
قرآنی کا ما حاصل یہی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم
میں ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حکم کہ قتل خطا میں مجرم کا خاندان یا اس کا قبیلہ (عائلہ)
دیت کی سزا کو برداشت کرے۔ قرآن کریم کی ان واضح اور

صریح آیات کے خلاف ہے۔

علامہ ابن رشد قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ،

و اما علی من تجب ؟ فلا خلاف بینہما ان
دینۃ الخطاء تجب علی العاقلۃ و انہ حکم
مخصوص من عموم قولہ تعالیٰ — وَلَا تَزِدْ
وَاِزْرَۃً وَّ زَرَّ اُخْرٰی — ومن قولہ علیہ الصلوٰۃ
والسلام لابی زمنۃ لولدہ ” لا یجنی علیک
ولا تجنی علیہ“

(بدایۃ المجتہد ص ۲۱۲ مطبوعہ مصر)

توجہ ۱۔ رہ گئی یہ بات کہ دیت کس پر واجب
ہوگی، تو فقہاء میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ
وہ عاقلہ (خاندان) پر واجب ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا
حکم ہے جو حق تعالیٰ کے ارشاد لَا تَزِدْ وَاِزْرَۃً وَّ زَرَّ
اُخْرٰی (کوئی بوجہ اٹھانے والا کسی دوسرے کا
بوجہ نہیں اٹھائے گا) اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ
والسلام کے اس ارشاد سے جو آپ نے ابو زمنہ سے
اس کے بیٹے کے متعلق فرمایا تھا کہ نہ وہ تیسری ذمہ داری
پر کوئی جرم کر سکتا ہے۔ نہ تو اس کی ذمہ داری پر کوئی
جرم کر سکتا ہے، کے عام حکم سے مخصوص ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی کہ عاقلہ
پر دیت کا واجب ہونا قرآنی نصوص صریحہ کے عموم اور ابو زمنہ

رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے عموم سے کیوں مخصوص ہے؟ اصول میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عام ہر حال میں اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔ اخبار آحاد سے اس کے عموم کو خاص نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ کے بیان سے مراد تو نہیں البتہ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ چونکہ فقہاء میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے انہوں نے ایسا سمجھا ہے کہ فقہاء کا اس ہر اجماع ہو گیا ہے اور اسی اجماع کی وجہ سے نصوص صریحہ کے عموم کو وہ خاص کر لینے کے حق میں ہیں۔ لیکن اجماع کی حقیقت کیا ہے اور اس کی حیثیت خود دائمہ فقہاء کے نزدیک کیا ہے اس پر ہم فقہ القرآن جلد چہارم کے حصہ ”رجم اصل حد ہے یا تعزیر“ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اسے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اختصار کے ساتھ ہم اس کا اعادہ کر دیتے ہیں۔ تفصیل ہماری محولہ بالا کتاب میں ملے گی۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ :-

”صاحب نور الانوار نے اجماع کی بحث شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

”اجماع لغت میں اتفاق کو کہتے ہیں اور امت محمدیہ کے تمام صلح مجتہدین کا جو ایک زمانہ میں ہوں امر قولی یا امر فعلی پر اتفاق کر لینا اجماع کہلاتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اجماع کی دو قسمیں ہیں اول تو عزیمت (یعنی حقیقی اور اصل اجماع) یعنی اگر وہ مسئلہ قول سے متعلق ہو تو سب کسب حکم کے متعلق زبان

سے کہیں کہ ہم سب نے اس پر اتفاق کر لیا ہے اور اگر وہ مسئلہ عمل سے متعلق ہو تو ان سب نے کسی ایسے کام کو شروع کر دیا ہو اور متفقہ طور پر اس پر عمل پیرا ہوں۔ جیسا کہ تمام اہل اجتہاد نے بغیر کسی استثناء کے عملاً مضاربہت یا مزارعت یا شرکت کا کاروبار شروع کر دیا تو یہ ان کے جائز اور مشروع ہونے پر ان کا اجماع کہلائے گا۔ اجماع کی دوسری قسم رخصت (یعنی مجازی اور غیر اصلی اجماع) کہلاتی ہے جس میں کچھ لوگ ایک مسئلہ کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں یا عملاً کرتے ہیں اور باقی لوگ خاموش رہتے ہیں، اس کی تردید نہیں کرتے حتیٰ کہ غور و فکر کی مدت یعنی تین دن یا مجلس علم گزر جاتی ہے اسے اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ اور یہ اجماع ہمارے ہاں مقبول ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ سکوت جیسا کہ موافقت کے لئے ہوتا ہے ایسے ہی کبھی رعب اور خوف کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ رضا مندی کی دلیل نہیں ہے (نور الانوار ص ۲۲۲)

نیز ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ۔
 ”امام مالکؒ صرف اہل مدینہ کے کسی بات پر متفق ہو جانے کو اجماع کہتے ہیں۔ باقی مدینہ والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے اتفاق کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ جب عام اجماع حقیقی ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اجماع سکوتی کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح شیعہ حضرات صرف اپنے

اصطلاحی اہل بیت نبوی یا عترت نبوی کے اتفاق رائے کو اجماع کہتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک بھی عام اجماع یا اجماع سکوت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“

(نور الانوار ص ۲۲۳)

علامہ شیخ ابو زہرہ مصری اپنی کتاب امام احمد ابن حنبلؒ میں رقم طراز ہیں کہ :-

حافظ ابن قیمؒ نے فقہ حنبلی کے اصولوں میں اجماع کو شمار ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ امام احمدؒ سے یہاں تک روایت کرتے ہیں کہ ————— ”جو کسی مسئلہ میں اجماع کا ادعا کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجماع کا وجود ثابت بھی ہو جائے تو اس کا علم بڑا مشکل امر ہے۔“

(امام احمد ابن حنبلؒ ص ۳۶۵ مطبوعہ مطبعہ سلفیہ لاہور)

”امام شافعیؒ نے اپنی مشہور کتاب ”جماع العلم“ میں مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنا ایک مناظرہ نقل فرمایا ہے اور مد مقابل کو اجماع کے خلاف دلائل سے ہر طرح زنج کر دیا ہے۔ بالآخر اس کے اس سوال پر کہ ————— ”پھر اجماع کوئی چیز ہے بھی؟“

امام شافعیؒ جواب دیتے ہیں کہ :-

ہاں فرائض کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص ناواقفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ پس یہ ایسا اجماع ہے جس کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ تمام لوگوں نے ان مسائل

پراجماع کر لیا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں
یہ اجماع نہیں ہے۔ پس یہ ہے وہ طریقہ جس سے اجماع کی
صداقت پر کھی جاسکتی ہے۔

(کتاب جماع العلم ص ۶۳ طبع معارف مصر)
نیز امام شافعیؒ ہی اپنی کتاب ”اختلاف الحدیث“ میں جو
کتاب الام کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔
اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین اور
تابع تابعین میں سے کسی شخص نے فرائض کے سوا جن کی پابندی
کے سب لوگ مکلف ہیں کسی اور مسئلہ پر اجماع نہیں کیا
اور میرے علم میں اس زمین کی پشت پر ایسا کوئی عالم بھی نہیں
ہے جس نے اس مسلک سے انحراف کیا ہو۔

(اختلاف الحدیث ص ۱۲۷)

اس پوری تفصیل کے بعد کہ امام احمد بن حنبلؒ، امام
شافعیؒ اور امام مالکؒ اس اصطلاحی اجماع کے قائل ہی نہیں
جس کی دہائی ہمارے فقہاء ہر مسئلہ میں دیتے ہیں کیا فقہائے
حنفیہؒ اس کا ثبوت پیش فرما سکتے ہیں کہ صحابہ، تابعین یا تبع تابعین
نے کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اس کا اعلان فرمایا ہو کہ ہم اس
پر اتفاق کرتے ہیں کہ ریت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر واجب
الادار ہوگی؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا ثبوت ہم پہنچانا ممکن
نہیں ہے۔ لہذا اجماع کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ رہ گیا
اجماع سکوتی تو عام فقہاء نے اس کو تسلیم ہی نہیں فرمایا صرف

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس کے قائل ہیں لیکن دلیل کے لحاظ سے ان کا موقف نہایت کمزور ہے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اجماع کا درجہ دلائل میں تیسرا ہے۔ تو کیا تیسرے درجہ کی دلیل اس قابل ہے کہ وہ اول درجہ کی دلیل یعنی کتاب اللہ کو منسوخ کر دے؟ کتاب اللہ کے عموم کو خاص کر لینا نسخ ہی کی ایک قسم ہے اور ناسخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی درجہ کی دلیل ہو جس درجہ کی دلیل وہ ہے جسے منسوخ کیا جا رہا ہو۔ اجماع کی حیثیت یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ کو منسوخ کر دے۔ ناسخ کو منسوخ سے برتر یا اس کا ہم پلہ ہونا چاہیے لہذا ہم اپنے تصور فہم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری سمجھ میں امام ابن رشد قرطبیؒ کی یہ دلیل نہیں آتی۔ خصوصیت سے اس وجہ سے بھی کہ وہ امام مالکؒ کے مکتبہ فکر سے منسلک ہونے کے مدعی ہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ دیت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر نہیں بلکہ خود مجرم پر عائد ہونی چاہیے۔

دیت کی مقدار | عربوں میں دیت کی کوئی مقدار متعین نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اپنی وجاہت و عزت کی بناء پر دیت مقرر کر لیتا تھا۔ جو قبیلہ زیادہ وجیہ اور زیادہ طاقتور ہوتا تھا اس کے ہاں دیت کا نرخ اس کی وجاہت

اور عزت کے پیمانے کے مطابق اتنا ہی زیادہ ہوتا تھا۔ جو قبیلہ کمزور اور ناتواں ہوتا تھا اس کے ہاں نرخ اسی اعتبار سے کم ہوا کرتا تھا۔ قریش کے خاندان میں ایک قریشی کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی۔

مولانا شبلیؒ اپنی سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں کہ :-

”انہوں نے (یعنی عبدالمطلب نے) منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے (عربوں میں انسانی قربانی کا رواج عام تھا) خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور بچاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے؟ اتفاق سے عبد اللہ کا نام نکلا یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبد اللہ کی بہنیں جو ساتھ بھتیں رونے لگیں۔ اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربان کیجئے۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔ عبدالمطلب نے بچاری سے کہا کہ عبد اللہ پر امد دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبد اللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے ۱۰ بیس اونٹ کر دیئے، یہاں تک کہ بڑھلتے بڑھاتے سو اونٹ تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا۔ عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کئے اور عبد اللہ بچ گئے۔ یہ واقعہ کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ

کی تدبیر و سائے قریش نے تجویز کی تھی۔

(سیرۃ النبی ص ۱۶۷-۱۶۸ مطبوعہ مطبعہ معارف

اعظم گڑھ، انڈیا)

معاوضہ کی یہ تدبیر عبداللہ کی بہنوں نے پیش کی ہو یا رؤسائے قریش نے، اور پجاری نے اسے قبول کر لیا، ظاہر ہے کہ یہ اسی وجہ سے تھا کہ قبیلہ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹ ہی ہوا کرتی تھی۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، جاہل، اجڈ قبائلی نظام میں انسانی خون کی کوئی زیادہ وقعت نہیں ہوا کرتی۔ آج بھی قبائل میں (جو عام طور پر مہذب وتمدن اور تعلیم سے آشنا نہیں ہوتے) بات بات پر گولیوں کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور سینکڑوں آدمی مرجاتے اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے قبائل میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب بھی تہذیب و تمدن سے نا آشنا اور علم و مہر سے بہرہ یاب نہیں تھے ان میں بھی بات بات پر تلواریں سونت لی جاتی تھیں۔ ان کی جہالت و بربریت کا نقشہ مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کچھ غلط نہیں کھینچا۔ ان کے ہاں نفس انسانی کی کیا قیمت تھی اور انسان کا خون کتنا ارزاں تھا اسی سے ظاہر ہے کہ عبدالمطلب اپنے دس بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لئے آگئے تھے۔ یہ تو قریش کا حال تھا جو عرب کے دیگر قبائل کے مقابلہ میں تجارت پیشہ ہونے اور دیگر متمدن و مہذب اقوام سے

تجارتی روابط کی وجہ سے بہت بہتر پوزیشن کے مالک تھے۔ دیگر قبائل کا حال تو اور بھی اتر چکا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں خون انسانی کی ارزانی کا کیا حال ہو گا جبکہ قریشی خاندان کا ایک سردار اپنی محنت پوری کرنے کے لئے دس بیٹوں میں ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لئے بے تکلف آجاتا ہے کہ دسوں بیٹوں میں سے قرعہ اندازی کر کے متعین کر دو کہ مجھے کون سے بیٹے کو قربان کرنا ہو گا۔ یعنی ایک بیٹے کا خون بہا دینا اور اس کا خون قربان گاہ پر چڑھا دینا کوئی بڑی بات ہی نہیں تھی۔

یہ بات ضمننا آگئی، ہمیں بتانا یہ تھا کہ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹوں کے برابر تھی۔

قرآن کریم نے دیت (خون بہا) کی کوئی مقدار متعین نہیں فرمائی۔ اس نے یہی فرمایا ہے کہ :-

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَجَزَاءُ رَقَبَةٍ
مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا
أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ

(۲۴)

ترجمہ :- جو کسی مسلمان آدمی کو غلطی یا شبہ سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان کی گردن آزاد کرنی ہوگی اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا حوالہ کرنا ہوگا بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔

خون بہا کی مقدار متعین کر کے بتا دینا حق تعالیٰ کے لئے

کوئی مشکل بات نہیں تھی جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خوں بہا
کے ساتھ ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنے کا حکم بھی دیا جا رہا
ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اگر ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنا
اگر دشوار ہو تو :-

فَمَنْ تَمَّ بِحَدِّ فَمِيئَامٍ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ
تُوبَةً مِنَ اللَّهِ (۹۳)

ترجمہ :- جو کوئی (ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنے
کی استطاعت نہ پائے تو اسے دو مہینے کے لگاتار روزے
رکھنے ہوں گے۔ یہ اللہ کی طرف اس جرم کی توبہ ہے۔

یہاں روزوں کو مبہم نہیں چھوڑا گیا بلکہ صراحت بیان کر دیا
کہ روزے دو ماہ کے رکھنے ہوں گے یعنی ساٹھ دن کے اور وہ
بھی لگاتار۔ اتنی تصریح اور تفصیل کے ساتھ روزوں کا
بیان فرمایا گیا ہے۔ تو اسی طرح صاف اور صراحت سے یہ
بیان کر دینا بھی کیا مشکل تھا کہ دیت میں دس اونٹ یا بیس
اونٹ یا سواونٹ دینے ہوں گے۔

چونکہ ہر زمانہ میں ہر معاشرے کے حالات یکساں نہیں
ہو سکتے۔ خون کی قیمت بھی دنیا کی تمام چیزوں کی طرح گھٹتی
بڑھتی رہتی ہے۔ پھر ہر ملک میں اونٹ میسر نہیں ہو سکتے۔
اس لئے کسی طرح کا تعین امر دشوار تھا۔ اس سے قوم بڑی
تنگی میں پڑ جاتی جو رحمت الہی کو منظور نہیں تھا۔ لہذا اس
نے خود متعین کر دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ پھر وہ ابد الابد

تک کے لئے ایک متعین قیمت ہو جاتی۔ لہذا اس کو غیر متعین
 چھوڑنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر زمانہ کا ہر معاشرہ اپنے
 اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے یہ بات خود ہی طے
 کرے کہ ہمارے معاشرے کے ان حالات میں خون انسانی
 کی قیمت کیا ہونی چاہیے۔

چونکہ عرب معاشرے میں خون انسانی کی کوئی قدر و
 قیمت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی اور قتل و غارتگری ایک بچوں
 کا کھیل بنا ہوا تھا جسے روکنا انتہائی ضروری تھا۔ اور عربوں
 کو یہ احساس دلانے کی ضرورت تھی کہ خون مسلم انتہائی محترم
 چیز ہے۔ جان مسلم کا احترام مقصد اسلام بھی ہے اور امن
 و امان قائم کرنے کے لئے ایک جزو لاینفک بھی ہے۔ لہذا
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کے حالات
 کو دیکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے ہاں اونٹ
 بکثرت ہوتے ہیں اور یہ ان کا لازماً زندہ گی ہے۔ وہ اسی کا
 دودھ پیتے تھے۔ اسی کی اون سے کپڑے بن کر پہنتے تھے۔ اسی
 کی کھالوں سے خیمے بناتے تھے۔ اسی کی مینگنیوں سے ایندھن
 کا کام لیتے تھے۔ اسی کا گوشت کاٹ کر کھاتے تھے۔ ان
 کے ہاں اونٹ ہی ان کی غذا۔ اونٹ ہی ان کا لباس اور
 اونٹ ہی ان کا مکان تھا۔ لہذا وہ اونٹ بکثرت پالتے
 تھے۔ اور ایک ایک آدمی کے پاس انگنت اونٹوں کی قطاریں
 ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ عربی زبان میں مال کا لفظ ہی اونٹ

کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ اور یہ کوئی عرب کی امتیازی خصوصیت نہیں تھی۔ ہر ریگستانی علاقہ کی یہی صورت ہوتی ہے۔ لہذا آپ نے اونٹ ہی کی صورت میں دیت یعنی خوں بہا کی تعیین مناسب سمجھی۔ اور چونکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ قتل وغارتگری کی گرم بازاری ختم ہو اور لوگ امن وامان سے رہنا سہنا سیکھیں اس لئے آپ نے جو زیادہ سے زیادہ اس دور کے لحاظ سے قیمت ہو سکتی تھی وہی متعین فرمائی۔ یعنی سٹو اونٹ۔

پھر چونکہ قتل کر دینا ان کے ہاں ایک معمولی کھیل بن گیا تھا اور قبائلی عصبيت کی شدت کی وجہ سے پورا قبیلہ مجرم کا پشت پناہ ہوا کرتا تھا۔ اور اپنے قبیلہ کی شہ پر ہی لوگ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کر ڈالتے تھے حتیٰ کہ اگر اس قتل کے نتیجہ میں کوئی جنگ چھڑ جاتی تو پورا قبیلہ ایک آواز بد جمع ہو جاتا اور دشمن سے نبرد آزما ہو جانے میں پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قبیلے والے یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے تھے کہ بات کیا ہے۔ دہائی دینے والے نے کیوں دہائی دی ہے۔ قصور کس کا ہے۔ خود دہائی دینے والے کا قصور ہے یا جس کے خلاف دہائی دی جا رہی ہے اس کا قصور ہے۔ صلح جوئی کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ انہیں ان تمام امور سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ پکارنے والے نے یا قریش یا تمیم،

یا بنی ربیعہ اور یا بنی محزوم کا غرہ لگایا ہے اور اس نے اپنے خاندان کی دہائی دی ہے۔ اس لئے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کی اعانت کے لئے حاضر ہو جائیں اور دشمن کی گردنیں مارنی شروع کر دیں۔ لہذا آپ نے مناسب سمجھا کہ ان حالات میں اجتماعی جرمانہ کی صورت میں سزا دی جائے۔ ویسے بھی ایک آدمی کے لئے سواونٹ مہیا کرنا آسان نہیں تھا۔ اجتماعی جرمانے کی شکل ہی میں اسے بروئے کار لایا جاسکتا تھا۔ اور قبائلی نظام میں یہ صورت اجتماعی جرمانے کے علاوہ امداد باہمی کی بھی ایک صورت تھی۔ ویسے ان حالات میں یقیناً ہر قبیلہ اپنے آدمی کے ساتھ اس اعتبار سے جرم میں شریک بھی ہوتا تھا کہ وہ کم از کم اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا اور اس کی پشت پٹا ہی اور نصرت کے لئے کمر بستہ تھا۔ لہذا ان پر بوجھ ڈالنا عین مناسب تھا۔

لیکن آج ہمارے ہاں وہ قبائلی نظام ہے، نہ وہ خاندانی عصبیت ہے نہ اونٹوں کی وہ کثرت ہے۔ نہ خون انسانی کی وہ ارزانی ہے جو عربوں میں اس وقت موجود تھی اس لئے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے ہمارے ملک کی پارلیمنٹ خود طے کرے کہ خون انسانی کی قیمت کیا ہونی چاہیے۔ وہ مقدار نہ اتنی گراں ہو کہ اس کو مہیا کرنا ہی ناممکن ہو جائے اور نہ اتنی ارزاں ہو کہ اس سے خون انسانی کی حرمت اور اس کے تقدس کا کوئی

تصور ہی نہ اُبھر سکے۔

ہذا ما را یتھ واللہ اعلم

امام ابن رشد قرطبی فرماتے ہیں کہ۔

اما اهل الذهب والورق فانهم اختلفوا ايضا

فما يجب من ذلك عليهم فقال مالك على

اهل الذهب الف دينار وعلى اهل الورق

اثنا عشر الف درهم۔ وقال اهل العراق

على اهل الورق عشرة آلاف درهم وقال

الشافعي بمصر لا يؤخذ من اهل الذهب ولا

من اهل الورق الا قيمة الابل بالغة ما بلغت

وقوله بالعراق مثل قول مالك۔ وعمدة

مالك تقويم عمر ابن الخطاب المائة من

الابل على اهل الذهب بالف دينار وعلى

اهل الورق باثني عشر الف درهم واجماعهم

على تقويم المتقال بها في الزكاة وما

الشافعي فيقول ان الاصل في الدية انما هو

مائة بعير۔ وعمرانما جعل فيها الف دينار

على اهل الذهب واثنی عشر الف درهم على

اهل الورق۔ لان ذلك كان قيمة الابل من

الذهب والورق في زمانه۔ والحجة له

ماروی عن عمرو ابن شعيب عن ابيه عن جده

انہ قال : كانت الديات على عهد رسول الله
 صلى الله عليه وسلم ثمانمائة دينار وثمانية
 آلاف درهم ودية اهل الكتاب على النصف
 من دية المسلمين۔ قال فكان ذلك حتى
 استخلف عمر، فقام خطيباً فقال ان الابل
 قد غلت ففرضها عمر على اهل البوق اثني
 عشر الف درهم وعلى اهل الذهب الف
 دينار۔ وعلى اهل البقر مائتي بقرة وعلى
 اهل الشاة الف شاة وعلى اهل الحل مائتي
 حلة۔ وتروك دية اهل الذمة لم يرفع
 فيها شيئاً۔ (بداية المجتهد ص ۱۱۱)

ترجمہ :- رہ گئے سونے چاندی والے تو فقیر
 نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ان پر اس میں کیا واجب
 ہوگا ؟ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ سونے والوں پر ایک
 ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم واجب
 ہوں گے۔ اور اہل عراق نے کہا کہ چاندی والوں پر دس ہزار
 درہم واجب ہوں گے۔ امام شافعیؒ نے مصر میں جانے
 کے بعد فرمایا کہ سونے والوں سے اور ایسے ہی چاندی
 والوں سے وہی قیمت لی جائے گی جو سواونٹوں کی قیمت
 ہوگی خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو اور جب تک
 وہ عراق میں ہے امام شافعیؒ کا قول بھی وہی محتاج

امام مالکؒ کا قول تھا۔ اور امام مالکؒ کی بہترین دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے سوا ونٹوں کی قیمت سونے والوں کے لئے ایک ہزار دینار اور چاندی والوں کے لئے بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی تھی۔ اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں مشقال کی قیمت اسی حساب سے لگانے پر تمام فقہاء نے اتفاق کیا ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دیت میں اصل سوا ونٹ ہی ہیں اور حضرت عمرؓ نے اس میں سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں کے لئے بارہ ہزار درہم اسی لئے مقرر کی تھی کہ ان کے زمانہ میں اونٹوں کی قیمت سونے چاندی سے بھی ہوتی تھی اور ان کی دلیل وہ روایت ہے جو عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جده سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتیں آٹھ ہزار دینار اور آٹھ ہزار درہم ہوا کرتی تھیں اور اہل کتاب کی دیت مسلمانوں کی دیت سے آدمی ہوا کرتی تھی، یہی مقدار اس وقت تک باقی رہی جب تک حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، جب وہ خلیفہ ہوئے انہوں نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اونٹ اب گراں ہو گئے ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ نے چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم اور سونے والوں پر ایک ہزار دینار مقرر کر دیئے۔ نیز گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر دو ہزار

بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو تھلے (جوڑے) مقرر
 فرمادیئے اور ذمیوں کی دیت اپنے حال پر باقی رکھی۔
 اس میں کوئی اضافہ نہیں فرمایا۔

امام ابن رشد قرطبی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت
 عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چونکہ اونٹوں کی
 قیمت بڑھ گئی تھی اس لئے حضرت عمرؓ نے آٹھ ہزار درہم کے
 بجائے بارہ ہزار درہم مقرر فرمادی تھی۔ امام شافعیؒ نے اسی
 بات سے استدلال فرمایا کہ دیت میں اصل سواونٹ ہیں۔
 سونے چاندی وغیرہ سے اسی حساب سے دیت دی جائے گی
 جو اونٹوں کی قیمت بنتی ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے
 زمانہ میں چونکہ سواونٹ آٹھ ہزار درہم کے ہوا کرتے تھے۔
 اس لئے درہم میں دیت آٹھ ہزار تھی لیکن حضرت عمرؓ کے
 زمانہ میں سواونٹ بارہ ہزار درہم کے ہو گئے تھے اس لئے
 انہوں نے دیت کی رقم بارہ ہزار درہم کر دی۔ امام شافعیؒ
 کا یہ استدلال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے واقعہ یہ ہے کہ حضور
 اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمانوں کا کوئی اپنا
 سکہ نہیں تھا۔ درہم و دنانیر ایران، عراق اور شام سے
 آتے تھے اور وہی عرب میں مستعمل تھے۔ ان کے اوزان مختلف
 ہوا کرتے تھے۔ بعض درہم وزن کے اعتبار سے زیادہ ہوتے
 تھے اور بعض کم ہوتے تھے۔ چھوٹے درہم ایک دینار کے بارہ
 ہوتے تھے اور جن کا وزن زیادہ ہوتا تھا وہ ایک دینار کے

دس آتے تھے۔

چنانچہ بلاذری نے اپنی فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ: ”ہم سے حسین ابن الاسود نے بیان کیا، اُن سے یحییٰ ابن آدم نے ان سے حسن بن صالح نے کہ عجمیوں کے بنائے ہوئے درہم مختلف تھے، چھوٹے بھی، بڑے بھی چنانچہ وہ درہم ایک مثقال کا ڈھالتے تھے اور وہ بیس قیراط کا ہوتا ہے اور کچھ درہم بارہ قیراط کے ڈھالتے تھے اور دس قیراط کے درہم بھی ڈھالتے تھے اور یہ نصف مثقال کے ہوتے تھے جب اللہ اسلام کو لایا اور زکوٰۃ ادا کرنے میں درہم بانی درہموں کی ضرورت لاحق ہوئی تو انہوں نے بیس قیراط اور بارہ قیراط اور دس قیراط کو جمع کیا تو یہ کل بیالیس قیراط ہوئے تو انہوں نے اس کا تہائی نکالا اور وہ چودہ قیراط کا وزن ہوا چنانچہ عربی درہم انہوں نے چودہ قیراط کا بنایا دینار عزیز کے قیراطوں سے تو ہر دس درہم کا وزن سات مثقال ہوا۔ یہ ایک سو چالیس قیراط ہوئے سب (سات) کے وزن سے حسن ابن صالح کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ عجمیوں کے درہم ایسے بھی تھے جن میں سے دس کا وزن دس مثقال ہوا کرتا تھا اور ایسے بھی تھے جن میں سے دس کا وزن سات مثقال ہوا کرتا تھا اور ایسے بھی تھے کہ دس درہم کا وزن پانچ مثقال ہوا کرتا تھا۔ ان سب کو جمع کیا گیا تو سب کا وزن اکیس مثقال ہوا تو انہوں نے اس مجموعہ کا تہائی لے لیا اور وہ سات مثقال

ہوا چنانچہ عربوں نے ایسے درہم بنائے جن کے دس کا وزن
سات مثقال تھا۔ دونوں اقوال کا مال ایک ہی ہے۔
(فتوح البلدان ص ۱۷۷)

اس موضوع پر شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی
رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اعلیٰ السنن (ص ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۸۰)
مطبوعہ سپر آرٹ پریس فرید پور (کراچی) میں سیر حاصل بحث
فرمائی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

چنانچہ حضرت علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔
اورد یہ کہنا کہ دیت کی مقدار کا اختلاف اس وجہ سے تھا
کہ اونٹوں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا تھا اس کی تردید اس
بات سے ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی دونوں روایتوں میں
یہ بات مشترک ہے کہ دیناروں سے انہوں نے دیت کی مقدار
ایک ہزار دینار ہی بتائی ہے۔ اگر اونٹوں کی قیمت میں اختلاف
کی وجہ سے درہم کی مقدار میں کمی بیشی ہوئی تھی تو دیناروں
سے فیصلہ کرنے میں بھی کمی بیشی ہونی لازمی تھی۔ ایسے ہی اس
سے بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ دو سو گائے، دو ہزار بکریا
دو سو گھلے (جوڑے) دونوں روایتوں میں مشترک ہیں۔ ان
میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ دیناروں کی قیمت میں اختلاف
کا امکان نہیں ہے۔ اس کا بطلان ہم پہلے ہی کہ چکے ہیں۔ لہذا
یہ بات متعین ہے درہم کے وزن اور قیمت میں اختلاف ہی

کی وجہ سے تھا یہ اختلاف تھا کسی اور وجہ سے نہیں۔

(اعلار السنہ ۱۳۸۲ھ)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں غالباً حق بجانب ہیں کہ دیت کے معاملہ میں اونٹ کوئی مرکزی حیثیت کے مالک نہیں ہیں بلکہ عرب معاشرہ میں چونکہ اونٹ ہی مرکزی اہمیت رکھتے تھے اس لئے اونٹوں سے دیت مقرر کر دی گئی تھی۔ چونکہ عربوں میں اونٹ ہی مال کہلاتے تھے اس لئے ضروری نہیں کہ دوسرے معاشروں میں بھی جہاں اونٹوں کو مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہے اونٹوں ہی کی پابندی کی جائے دوسرے معاشروں کے لئے دینار اور درہم، بکریاں اور گائیں اور چلتے (پکڑوں کے جوڑے) بھی معیار بن سکتے ہیں۔ اور جب اونٹ گراں ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے اونٹوں کے بجائے دینار و درہم کو دیت (خون بہا) کا بدل بنانے میں پس و پیش نہیں فرمایا۔ آج کل سونا اور چاندی بھی گراں ہو گیا ہے اور اس کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اس لئے اس میں پھر تبدیلی ہونی چاہیئے اور تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لہذا کچھ ضروری نہیں کہ آج بھی دینار و درہم کو معیار مان کر سونے اور چاندی کی قیمت لگا کر دیت کی مقدار کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ آج کل سونا اور چاندی معیار نہیں رہا ہے بلکہ اس کی جگہ کرنسی نے لے لی ہے۔ لہذا ہماری حکومت کو ان سر نو دیت کی مقدار کا تعین کرنا چاہیئے اور بتانا چاہیئے

کہ ہمارے اس دور میں انسانی خون اور انسانی جان کی قیمت کیا ہونی چاہیے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قتل خطار میں دیت کا بار عاقلہ (قاتل کے خاندان) پر ڈالنا نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول مسلمہ کے خلاف ہے بلکہ موجودہ غیر قبائلی نظام میں اس پر عمل پیرا ہونا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ لہذا یہ بار خود قاتل پر ہی ڈالنا ہو گا۔ لہذا حکومت اس نکتہ کو بھی ذہن میں رکھے کہ دیت (خون بہا) کی جو مقدار بھی مقرر کی جائے وہ لازماً اتنی ہو کہ ایک فرد واحد اسے ادا کر سکے۔ ہماری اسلامی نظریاتی کونسل نے اس ضمن میں جو سفارشات پیش کی ہیں، ہمیں افسوس ہے کہ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ دیت کی جو مقدار انہوں نے بتائی ہے وہ ایک فرد واحد کی استطاعت سے یقیناً زیادہ ہے۔ لہذا اس پر مزید غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کفارہ | قتل خطار میں قرآن کریم نے دو کفارے بتائے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی غلام یا کنیز آزاد کی جائے۔ اگر

اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے جائیں۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ کفارے صرف یہ دو ہی ہو سکتے ہیں۔ اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف بھی نظر سے نہیں گذرا۔ موجودہ حالات میں جبکہ ایک غلام کو آزاد کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر کوئی شخص اتنا ضعیف ہے کہ وہ دو مہینے کے لگاتار روزے نہیں رکھ سکتا تو اس کے لئے کفارہ کی صورت کیا ہوگی؟

یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ میرے خیال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنین کے بدلے میں جبکہ دو عورتوں میں لڑائی ہوئی تھی اور ایک عورت نے دوسری عورت کے پتھر مار دیا تھا جس سے اس کا حمل ساقط ہو گیا تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام یا کنیز آزاد کرنے کا حکم دیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ نے پانچ سو درہم یا پچاس دینار ایک غلام کی قیمت ادا فرمانے کی اجازت دی تھی۔ اس سے غلام کی قیمت ادا کرنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جبکہ غلام دستیاب تھے ایک غلام کی قیمت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ لہذا پانچ سو درہم کے بقدر موجودہ کرنسی میں غلام کی قیمت ادا کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔ فقہاء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ غلام کی قیمت دیت کا نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہوتی ہے۔ لہذا حکومت وقت دیت کی جو مقدار طے کرے۔ اس کا بیسواں حصہ کفارہ کا بھی مقرر کر دے جو غرباء مساکین اور یتامی کو دلوا یا جائے کہ یہ انہیں کا حق ہے۔ دیت کی رقم مقتول کے ورثاء کو دلائی جائے اور کفارہ کی رقم یتامی، مساکین اور فقراء کو دلوائی جائے۔ واللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں روایات کی تفصیل حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلیٰ السنہ ۱۹۸۱ء مطبوعہ سیر آرٹ پریس کراچی، میں بیان فرمادی ہے۔ وہاں دیکھنی چاہیے۔

عورت کی دیت | ہمارے فقہاء عموماً اس کے قاتل ہیں کہ اگر کسی کے ہاتھ سے غلطی یا شبہ سے کوئی عورت قتل ہو جائے تو قتل خطا میں عورت کی دیت مرد کی دیت (خونی بہا) سے نصف ہوگی کیونکہ عورت کا حال مرد کے حالی سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد کی منفعت سے کم تر ہے۔ یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد کہاں سے پیدا ہوں۔ مردوں اور عورتوں دونوں کی پیدائش ہی عورت پر منحصر ہے لہذا یہ کہنا کہ عورت کا حال مرد سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد سے کم تر ہے۔ ایسی بات ہے جسے عقل و بعیرت قبول نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے عام حکم دیا ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مَّقْرَئَةً
وَدِيَّةٌ مَسْلُومَةً إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يُصَدَّقَ قَوَاد

(۴۶۹)

ترجمہ :- اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے تو ایک مؤمن گروں کو آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے اہل (ورثہ) کو دیت ادا کرنی ہوگی بجز اس کے کہ وہ صدقہ کر دیں یعنی دیت معاف کر دیں۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ دونوں کے لئے دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے عام حکم کو خاص نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ ابن قدامہ نے مغنی میں کہا ہے کہ ابن المنذرؒ اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد سے آدمی ہوتی ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے علمائے بیان کیا ہے کہ ابن علیہؒ اور اصم دونوں کا قول یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر مؤمن جان میں سوا دنت دیت کے ہوتے ہیں اور یہ قول شاذ ہے جو صحابہ کے اجماع اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔ کیونکہ عمر ابن حزم کے نام خط میں یہ موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدمی ہوتی ہے الخ

(اعلام السنن ص ۱۳۶ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)
حضرت شیخ الاسلامؒ نے اعلام السننؒ ”باب دیت المرأة“ میں تفصیل سے ان تمام روایات کو بیان کر دیا ہے جو اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ تمام روایات مجروح ہیں۔ لے دے کر ایک وہی روایت رہ جاتی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامہ مبارک کے نام سے پیش کی جاتی ہے جو آپ نے حضرت عمر ابن حزم رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا اور جس میں عورت کی دیت، مرد کی دیت سے نصف بتائی گئی ہے۔ لیکن خطوط سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی جب تک دو شاہد اس

نہیں ہے۔

کافر کی دیت عجیب بات ہے کہ ذمی (اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے کافر) کی دیت

پوری ہوتی ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم نے خصوصیت کے ساتھ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسْكِنَةً لِّاهْلِ الْاَهْلِ (۹۳) فرمایا ہے۔ یعنی جو غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے تو ایک مؤمن گردن کو آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے گھر والوں (ورثاء) کو دیت حوالہ کرنا ہوگی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ذمی کافر مؤمن ہوتا ہے اور ایک مؤمن عورت مؤمن نہیں ہوتی ؟

ہم ذمی کافر کی دیت میں کسی کمی کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیئے اور ہم اس ضمن میں فقہائے حنفیہ کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن مؤمن عورت کے سلسلہ میں ہمیں اس سے اختلاف ہے اور ہم اس سلسلہ میں امام ابن علیہ اور امام ابو بکر الاصلم کے قول کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی قول ہمارے خیال میں قرآن کریم کے مطابق ہے۔ واللہ اعلم

اس سلسلہ میں امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہونی چاہیئے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہونی چاہیئے۔ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ

یہودی اور نصرانی کی دیت چھ ہزار درہم ہونی چاہیے۔ امام مالکؒ نے عمر و ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت آتی ہے اس سے استدلال فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقل الکافی نصف عقل المسلم یعنی کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی ہے اور مسلم کی دیت ان کے نزدیک بارہ ہزار درہم ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی عمر و ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے اس روایت سے استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان سے جس نے اہل کتاب کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا چار ہزار درہم دلوائے تھے۔ اس روایت کو عبد اللہ بن ابیہ نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ نیز امام شافعیؒ نے خود اپنی مسند میں عن فضیل بن عیاض عن منصور عن ثابت عن سعید بن المسیب عن عمر بن الخطابؓ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم دلوائی تھی (ملا علی قاری)۔ فقہائے حنفیہ کی دلیل وہ روایت ہے جو امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں سعید بن المسیب سے روایت فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یدیعہ یکل ذی عہد فی عہدہ الف دینار یعنی ہر وہ شخص جس سے معاہدہ ہو چکا ہو معاہدہ کے دوران اس کی دیت ایک ہزار دینار ہوگی۔ یہ روایت باوجودیکہ مرسل ہے۔ لیکن چونکہ

قرآن سے قریب تر ہے اس لئے قابل اعتماد ہے اور ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اعضام میں دیت | غلطی سے اگر کسی نے کسی کے کسی عضو کو کاٹ دیا جس سے اس کی

منفعت ختم ہو گئی تو پوری دیت واجب ہوگی۔ چنانچہ اگر کسی نے کسی کی ناک (بانہ) کاٹ دیا، یا زبان کاٹ دی یا آلہ تناسل کاٹ دیا یا سر پر چوٹ ماری جس سے اس کی عقل زائل ہو گئی یا ایسی چوٹ ماری کہ اس کی بصارت و سماعت سونگھنے یا چکھنے کی قوت زائل ہو گئی تو پوری دیت واجب ہوگی۔ نیز کسی نے کسی کی ڈاڑھی اس طرح مونڈ دی کہ وہ دوبارہ نہ اُگ سکے یا اس طرح سر کے بال مونڈ دیئے کہ وہ دوبارہ پیدا نہ ہو سکیں تو پوری دیت واجب ہوگی۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں دو معتبر آدمی جو کچھ فیصلہ کریں وہ مقدار دلوائی جائے گی۔ دیت واجب نہیں ہوگی۔

اگر کسی نے دوسرے کی مونچھیں مونڈ دیں تب بالاتفاق دو معتبر آدمیوں کے فیصلے پر عمل کیا جائے گا۔ ایسے ہی کسی نے کسی کی دونوں بھنویں مونڈ دیں تو پوری دیت دینی ہوگی۔ اگر ایک بھوؤں مونڈ دی ہے تو نصف دیت دینی ہوگی۔

اگر کسی نے غلطی سے کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں یا دونوں ہاتھ کاٹ دیئے یا دونوں پاؤں کاٹ دیئے یا دونوں

ہونٹ کاٹ دیئے یا دونوں کان کاٹ دیئے یا دونوں بیضے
 کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہوگی۔ اگر ان میں سے کسی
 ایک عضو کو کاٹ دیا تو نصف دیت واجب ہوگی۔ اگر کسی نے
 کسی عورت کی دونوں چھاتیوں کاٹ دیں تو پوری
 دیت اور اگر ایک چھاتی کاٹ دی تو آدھی دیت واجب ہوگی
 ایسے ہی اگر کسی نے عورت کی چھاتی سے اس کے سرپستان
 کاٹ دیئے تو پوری دیت اور اگر ایک سرپستان کاٹ دیا
 تو نصف دیت واجب ہوگی۔

ایسے ہی اگر کسی نے دوسرے کی چاروں پلکیں کاٹ
 دیں تو پوری دیت دینی ہوگی۔ اگر صرف ایک پلک کاٹی ہے
 تو دیت کا چوتھائی دینا ہوگی۔ کیونکہ ہر آدمی کی چار پلکیں
 ہوتی ہیں۔

اگر کسی نے دوسرے کی پلکیں تو نہیں کاٹیں لیکن پلکوں
 کے سارے بال کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہوگی۔
 اگر صرف ایک پلک کے بال کاٹ دیئے ہیں تو دیت کا چوتھائی
 دینا ہوگا۔

اگر کسی نے ہاتھوں پیروں میں سے دوسرے کی ایک
 انگلی کاٹ دی تو دیت کا دسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ
 ہاتھوں اور پیروں میں دس دس انگلیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی
 انگلی کا صرف ایک پیر وا کاٹ دیا ہے تو دیت کے دسویں حصہ
 کا ایک تہائی ادا کرنا ہوگا۔

ایسے ہی اگر کسی نے غلطی سے کسی کا ایک دانت توڑ دیا تو پانچ اونٹ یا ان کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ اس میں دانت امدہ ڈاڑھیں سب کا حکم ایک ہی عضو کا ہے۔ اگر کسی نے کسی عضو پر ضرب لگادی جس سے اس کی منفعت زائل ہو گئی۔ مثلاً ہاتھ پر چوٹ ماری جس سے وہ شل ہو گیا یا آنکھ پر چوٹ لگی اور اس کی بصارت زائل ہو گئی یا ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگائی کہ اس کے توالد و تناسل کی قوت زائل ہو گئی یا وہ اس ضرب سے کبرا ہو گیا تو پوری دیت واجب ہوگی۔

زخموں کے بارے میں | اگر کسی نے دوسرے آدمی کو زخمی کر دیا ہے اور یہ جرم غلطی سے سرزد ہوا ہے تو ہمارے فقہاء نے زخموں کی دس قسمیں بیان کی ہیں جن کی تفصیلی شرح اور ان کے احکام کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق قرآن کریم سے نہیں ہے بلکہ وہ ارشادات نبوی اور فقہاء کے اجتہادات پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ان کے احکام کتب فقہ میں دیکھ لیتے جائیں۔

حمل ساقط کر دینا | کسی نے حاملہ عورت کو مارا پیٹا یا دو عورتوں کی آپس میں لڑائی ہوئی اس میں ایک عورت حاملہ تھی اور اس کا حمل ساقط ہو گیا تو اگر عورت نے ایسا حمل ساقط کیا ہے کہ اس میں جان پڑ چکی تھی

اور جنین زندہ ساقط ہوا تھا اور سقوط کے بعد مر گیا ہے تو پوری دیت واجب ہوگی اور اگر ابھی جان نہیں پڑی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں ایک غلام یا باندی آزاد کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا یا دیت کا نصف عشر یعنی پانچ سو درہم ادا کرنے ہوں گے۔ یہ پانچ سو درہم غریب اور مساکین کا حق ہوگا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے چھ سو درہم مقرر کئے ہیں۔ حنفیہؒ نے یہ پانچ سو درہم عاقلہ پر ڈالے ہیں۔ اور امام مالکؒ نے خود اس شخص پر ڈالے ہیں جس نے جرم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم دیت کے باب میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں عاقلہ پر دیت کا سوال آج کل خارج از بحث ہے۔ کیونکہ قبائلی نظام اب رائج نہیں ہے۔ البتہ اگر قبائلی نظام کہیں رائج ہو مثلاً صوبہ سرحد یا آزاد قبائلی علاقوں میں تو وہاں اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

اگر حمل ساقط ہوا اور ماں بھی مر گئی | اگر ضرب شدید سے حمل بھی ساقط

ہو گیا اور ماں بھی مر گئی تو اگر حمل پہلے ساقط ہوا تھا اور ماں بعد میں مری ہے تو مجرم پر دو دیتیں واجب ہوں گی۔ ایک حمل کی دیت یعنی پانچ سو درہم اور دوسری عورت کی دیت اور اگر عورت پہلے مر گئی اور حمل موت کے بعد ساقط ہوا ہے۔ تو اگر حمل زندہ ساقط ہوا تھا اور وہ بعد میں مر گیا تو مجرم پر

دو دیتیں کامل واجب ہوں گی کیونکہ وہ دو جانوں کا قاتل ہے اور اگر وہ مردہ ہی ساقط ہوا ہے تو حنفیہ فرماتے ہیں کہ اس پر ایک دیت ماں کی واجب ہوگی۔ بچہ کی کوئی دیت واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجرم کی ضرب ہی سے جنین کی موت واقع ہوئی ہو، ہو سکتا ہے کہ مجرم کی ضرب سے ماں کی موت واقع ہوئی ہو اور ماں کی موت کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہو گئی ہو۔ کیونکہ وہ ماں کے سانس لینے ہی سے سانس لیتا ہے۔ ماں کی موت کی وجہ سے اس کا سانس گھٹ کر اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ شک واقع ہو گیا اس لئے دیت ساقط ہو جائے گی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جنین کی دیت بھی واجب ہوگی۔ کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ ضرب ہی کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ ہم امام شافعیؒ کے ارشاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ موت مجرم کی ضرب سے واقع ہوئی یا ماں کے مرنے اور سانس گھٹنے سے موت واقع ہوئی اس سے نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ^۱ دو جانوں کی موت واقع ہوئی ہے اور مجرم دو جانوں کا قاتل ہے۔ جنین کا سانس گھٹ کر موت واقع ہوئی ہو تب بھی مجرم بے قصور نہیں ہے۔ جنین کا سانس بھی تو اسی لئے گھٹا کہ مجرم نے اس کی ماں کو مار ڈالا لہذا دونوں موتوں کا سبب وہی ضرب شدید ہے جس کا

ارتکاب مجرم نے کیا۔

یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مجرم کا ارادہ عورت کو جان سے مار ڈالنے کا نہیں تھا۔ بلکہ قتل غلطی سے سرزد ہوا ہے اور حاکم وقت قتل خطا کا فیصلہ کرے۔ اگر ارادۃً اس نے ایسا کیا ہے تو دہیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ہم نے شروع میں قتل عمد اور قتل خطا پر جو بحث کی ہے اسے دوبارہ دیکھ لیں۔

(باب البغاة)

بَغَاةٌ ، بَاغِيٌّ کی جمع ہے جو بَعَاوَةً سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ بَغِيَ ہے جس کے معنی درمیانہ روی کی حد سے بڑھ جانے کی خواہش (خواہ حد سے تجاوز کر سکے یا نہ کر سکے) کو کہتے ہیں۔ نیز بہت زیادہ بارش کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھ جائے بَغَتِ السَّمَاءُ بال دل اپنی حد سے بڑھ گیا۔ بہت زیادہ برسا۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔

مسلم عوام کی دو جماعتیں آپس میں کسی بات پر جھگڑا کریں اور حکومت اس میں فریق نہ ہو تو اس کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا یہ دونوں مسلم جماعتوں کا باہمی جھگڑا ہے۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ
فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

توجہ دے۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے میں سے اہل حکومت کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں تم میں آپس میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اگر حکام وقت سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تب بھی حکم یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حاکم اعلیٰ - FINAL AUTHORITY ہیں اس لئے ان سے رجوع کر کے فیصلہ کر لو۔ اور اپنا نزاع اس فیصلہ کے مطابق ختم کر دو۔ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں تو جو مسلمانوں کی مرکزی قوت آنحضرت کی نائب ہو مثلاً خلیفہ وقت - امیر ملت اس سے رجوع کیا جائے مثلاً آج کل کی اصطلاح میں ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ موجود ہیں وہاں اپیل کی جائے اور متنازعہ مسئلہ کا فیصلہ کر لیا جائے۔ مسلمانوں کا آپس کا باہمی اختلاف بغاوت نہیں ہے یہ ایک معمولی نزاع ہے۔ بغاوت وہ ہے جس میں ایک فرقہ حکومت ہو اور دوسرا فریق رعایا کی کوئی جماعت ہو اور یہ جماعت حکومت کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔

فقہ کی اصطلاح میں ”بِغَاوَت“ کسی تاویل کی بنا پر ایک طاقتور جماعت کا خلیفہ (یا حکومت اسلامیہ) کے خلاف خروج (یعنی ایسی مسلح اور جارحانہ مخالفت) کا نام ہے جس کا مقصد خلیفہ (یا حکومت اسلامیہ کے سربراہ) کو اس کے منصب سے

معزول کرنا یا اس کی رعیت بننے سے انکار کر دینا یا حکومت کے کسی ایسے حق کی ادائیگی سے انکار کر دینا جس کا ادا کرنا شرعاً اس پر واجب ہو۔

البتہ اگر سربراہ مملکت مرتد ہو جائے تو اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کو معزول کر دینا واجب ہے۔ اس کے خلاف خروج اور مسلح جدوجہد کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔

مملکت کا کوئی حصہ جو اس میں شامل ہے اور اب تک مرکز کی اطاعت کرتا رہا ہے اس سے علیحدہ ہونا چاہیے اور مرکز کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اگر وہ خود اپنی مستقل آزاد حکومت قائم کرنا چاہتا ہو جو مرکز کی ماتحتی میں نہ ہو تو یہ بغاوت ہے اور اگر وہ اپنا الحاق کسی دوسری اسلامی مملکت سے کرنا چاہتا ہو تب بھی یہ بغاوت ہے۔ کیونکہ وہ اب تک اول مملکت کی ماتحتی میں رہتا آیا ہے۔ اور اب اس سے آزادی حاصل کر کے دوسری کسی اسلامی مملکت سے الحاق چاہتا ہے۔ اس طرح وہ عہد شکنی کا مرتکب ہو رہا ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے،

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝

(۱۶/۳۴)

ترجمہ :- اور عہد کو پورا کرو۔ یقیناً عہد کے متعلق بازپرس ہونی ہے۔

مملکت اسلامیہ کے باشندوں کا ایک گروہ خلیفہ (سربراہ مملکت) کی مخالفت اس بنا پر کرے کہ اس منصب پر اس کا تقریر یا

اس کی بقاء احکام شریعہ کے خلاف اور از روئے شریعت ناجائز ہے اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھے کہ وہ گروہ حکومت مذکورہ کو معزول کر کے ایک دوسری حکومت قائم کرنے کے لئے تلوار اٹھالے جبکہ خلیفہ وقت اپنے تقرر یا بقاء کو احکام شریعہ کے عین مطابق اور از روئے شریعت جائز سمجھتا ہو تو عامہ مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرادیں اور جس فریق کی غلطی دیکھیں اس کے شبہات و شکوک کو دور کر دیں۔ اگر انہیں کوئی بجا شکایت ہو تو اس کا ازالہ کر دیں۔ اور ان دونوں جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ عامہ مسلمین کی ان کوششوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔

لیکن اگر ایک فریق اپنے موقف سے شس سے شس نہ ہوا اور وہ اپنے موقف پر جما رہے اور کسی مصالحت کو قبول نہ کرے تو جس فریق کی غلطی ثابت ہو جاتے۔ وہی فریق اب یعنی مصالحت کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد باغی ہے اور عام مسلمانوں کو اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ تا آنکہ وہ اپنی سرکشی سے باز آجائے اور مصالحت کو قبول کر لے۔

سورہ حجرات میں ہے :-

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا
بَيْنَهُمَا. فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى
فَمَا تَلَوْا التَّوْبَةَ حَتَّى تَنْفِخَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنَّ
فَاعَتَ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا يَأْتِ الدِّلِ وَأَقْسَطُوا وَإِنَّ

اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○ (۴۹)

ترجمہ :- اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں (ایک دوسرے سے) لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ تو اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں گروہوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو۔ اور (بہر حال) انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

اس آیت کریمہ پر غور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رکھتے کہ :-

① اول تو دونوں فریق، یعنی حکومت اور اس کی مخالفت کرنے والے افراد نہیں ہیں بلکہ ایک طائفہ یعنی ایک جماعت ہیں۔

② اور دوسرے یہ کہ دونوں مؤمن ہیں۔ یعنی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں جو بغیر کسی دلیل شرعی کے کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتے۔

③ اور تیسرے یہ کہ اِشْتَكَا یعنی وہ دونوں جماعتیں صلح تصادم یعنی قتال بھی کرتی ہیں۔ لہذا ان میں قتال اور جنگ کی صلاحیت بھی ہے اور وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کر رہی ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے فقہائے کرام نے دُوْ مَنَعَةٍ اور دُوْ شَوْكَةٍ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے یعنی دونوں فریق قوت و شوکت کے مالک

ہیں۔ اور چونکہ دونوں ایمان کے تقاضوں پر پورے اترنے والے ہیں۔ لہذا دونوں کے پاس شرعی دلائل موجود ہیں۔ یعنی وہ شرعاً اپنے آپ کو حق بجانب بھی سمجھتے ہیں۔

ایسے دونوں فریقوں میں آیت کا حکم یہ ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کو صلح کی کوشش کرنی چاہیئے اور فریقین کے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیئے لیکن اگر مصالحت کی کوشش اور شبہات کے ازالہ کے بعد بھی کوئی سا ایک فریق اپنی بات پر بضد رہے تو قرآن کریم اب اسے باغی کہتا ہے۔

فَاِنْ بَخَعَ اِحْدَاهُمَا عَلٰى الْاُخْرٰى ط

ترجمہ :- تو اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے۔

تو اب اس باغی (زیادتی کرنے والے گروہ) سے جنگ کرنی ضروری

ہے۔

نیز اگر حکومت اور اس کا مخالف گروہ، دونوں ہی اپنے اپنے موقف پر جمے ہوتے ہوں اور وہ صلح قبول نہیں کرتے اور جنگ بند نہیں کرتے تو دونوں گروہوں (حکومت اور حکومت کا مخالف گروہ) کو باغی کہا جائے گا اور دونوں سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ آیت مندرجہ بالا کے مخاطب عامۃ المسلمین ہیں۔ حکومت یا اس کا مخالف گروہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں عامۃ المسلمین کو خطاب کر کے

انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ فَاصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا یعنی تم ان دونوں

کے درمیان صلح کرادو یہاں یہ حکم نہیں دیا جا رہا ہے کہ تم ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کر دو۔ بلکہ صلح کرانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ صلح اس کے بغیر تو نہیں ہو سکتی کہ فریقین کی بات سنی جائے۔ معلوم کیا جاتے کہ ہر فریق کو دوسرے کے خلاف شکایات اور شبہات ہیں۔ ہر فریق کے شبہات و شکایات کا ازالہ کیا جائے دونوں کے مطالبات پورے کر کے دونوں کو مطمئن کیا جائے۔ لہذا شبہات و شکایات کا ازالہ کرنا ضروری ٹھہرا۔

دونوں فریقوں کا فرض ہوا کہ وہ مصالحت کنندہ جماعت سے پورا پورا تعاون کریں اور فریق مخالف کے شبہات و شکایات کو دور کریں تاکہ تصادم و تزاخم کی یہ فضا ختم ہو اور دونوں بھائی بھائی بن کر رہ سکیں۔
البتہ اگر بالفرض :-

- ① مملکت اسلامیہ کا کوئی حصہ خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کو از روئے آئین اسلام صحیح ہی نہ سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ یا
- ② اسے خلیفہ تو تسلیم کرتا ہو مگر ہنگامی خلیفہ سمجھتا ہو جو کسی ہنگامی حالت (EMERGENCY) کی وجہ سے فوری طور پر بطور عبوری حکومت (ENTERIM-GOVERNAMENT) منتخب کر لیا گیا ہو۔ اس وجہ سے وہ دوبارہ انتخاب کا طالب ہو اور اس کی خلافت کے استمرار کو ناجائز سمجھتا ہو۔ یا
- ③ خلیفہ کے بعض احکام کی تعمیل سے اس بنا پر انکار کر دے کہ

اس کے نزدیک اسے از روئے آئین اسلامی ان احکام کے صادر کرنے کا اختیار اور حق ہی نہیں۔

⑤ کسی خاص حکم کی تعمیل اور اس کے بارے میں خلیفہ کی اطاعت مصلح دینیہ کے خلاف سمجھ کر اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔

⑥ خلیفہ کو معزول نہ کرنا چاہتا ہو لیکن اس کے اور اپنے درمیان اختلافات طے کرنے کے لئے ثالثی، ارباب حل و عقد کے اجتماعی فیصلے یا استصواب رائے عامہ کا مطالبہ پورا ہونے کے بعد تک استمرار حال (STATUS - QUO) کا طالب ہو۔

ان سب صورتوں میں اگر اس گروہ نے خروج بالسیف نہیں کیا اور نہ اس کے عزم خروج کا کوئی واضح ثبوت ملا تو شرعاً اس گروہ کو باغی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ باغی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

ان سب صورتوں میں یہ گروہ، پرامن، آئینی ذرائع اور شرعی طریقہ سے انقلاب چاہتا ہے۔ اور اس طرح کے مطالبہ کا حق، مملکت کے ہر مسلمان باشندے کو حاصل ہے۔ جس طرح انتخاب کے وقت ہر مسلمان نصب خلیفہ کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسے معزول کرنے کی تجویز بھی ارباب حل و عقد یا جمہور مسلمین کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ اس بارے میں آزادانہ رائے دہی کا جو حق نصب خلیفہ کے بارے میں اسے حاصل تھا اس کے عزل کے بارے میں بھی حاصل ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں اس نے اپنے

اسی حق سے کام لیا ہے۔ اسے بغاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
 لیکن اگر خلیفہ یا سربراہ مملکت فریق مخالف کے شبہ اور استدلال
 کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ فریق کو اس کے شبہات دور
 کر کے مطمئن کرنے کے بجائے اس کے خروج بالسیف یا عزم خروج
 کا انتظار کئے بغیر ہی اس کے خلاف پولیس ایکشن کرتا ہے تو فریق
 مخالف کے لئے اپنی مدافعت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ مسلح دفاعی
 جنگ حدود بغاوت میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب ظاہر ہے کہ خلیفہ یا سربراہ مملکت کا فرض تھا
 کہ جب فریق مخالف کے پاس شرعی دلیل موجود ہے اور کسی شبہ
 اور شکایت کی بنیاد پر وہ خروج کر رہا ہے تو اولاً اس کے شبہات
 و شکایات کا ازالہ کرے اس سے پہلے اس کو پولیس ایکشن کرنے
 کا حق نہیں تھا۔ لہذا اس نے فریق مخالف کے خلاف شرعی اجازت
 کے بغیر فوج کشی کر دی ہے۔ لہذا فریق مخالف کو مدافعت کا
 حق یقیناً حاصل ہو گا۔

ایک ضروری توضیح | شبہ یا شکایت و تاویل کے الفاظ کو
 اس قدر عام نہیں سمجھنا چاہیے جس قدر
 وہ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے نظر آتے ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے
 خروج کرنے والوں کا ہر شبہ معتبر نہیں ہے نہ ان کی ہر تاویل قابل
 اعتبار ہے۔ اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف اس شبہ کا ازالہ
 اور اس تاویل کا ابطال خلیفہ اور جمہور مسلمین کے ذمہ ہے جو اجتہاد
 کی گنجائش رکھنے والے کسی مسئلہ میں پیدا ہوا ہو۔ مگر کسی ایسے

مسئلے میں کسی شبہ یا تاویل کو قابل سماعت نہیں سمجھا جاتے گا۔
جس میں اجتہاد و تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ مسلمانوں کے مسلمات
میں داخل ہو۔

اس کی روشن دلیل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے
عہدِ خلافت میں عرب کے بعض قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار
کر دیا تھا اور اس کے لئے وہ یہ تاویل کرتے تھے زکوٰۃ مرکز کو ادا کرنا
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں ضروری تھا۔ اب جبکہ
آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا سے تشریف لے گئے بیت المال
میں زکوٰۃ کا مال جمع کرنا ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ ہم حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو زکوٰۃ اس لئے ادا کرتے تھے کہ آپ نبی
تھے۔ ابوبکر صدیقؓ نبی نہیں ہیں۔ اب ہم کیوں زکوٰۃ ادا کریں۔
لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی اس تاویل کو قابل اعتناء اور
ان کے شبہ کو قابل ازالہ خیال نہیں فرمایا بلکہ ان سے جہاد کا
فیصلہ فرمایا۔ اگرچہ پہلے عام طور پر صحابہ کرام نے حضرت صدیق
اکبرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ
وغیرہ اکابر صحابہ نے بھی اختلاف کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ
مانعین زکوٰۃ سے قتال جائز نہیں۔ لیکن خلیفۃ المسلمین حضرت
صدیق اکبرؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور ان کی مدلل تقریر کے بعد
سب صحابہ ان سے متفق ہو گئے۔ بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحیح
میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور و اہل علم میں مشہور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد حبش اسامہؓ

کو روانہ کرنے میں بھی یہی صورت پیش آئی کہ اکابر صحابہ نے مخالفت کی تھی مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کی رائے نہیں مانی اور حبش اسامہؓ کو روانہ کرنے کا فیصلہ تنہا صدیق اکبرؓ نے اپنی رائے سے کیا تھا جس کو بعد میں تمام صحابہ نے صحیح تسلیم کیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں جن میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور جو امت مسلمہ کے مسلمات میں داخل ہوں کسی تاویل اور شبہ کو باجماع صحابہ قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا اور ایسے گروہ کے شبہات و شکایات کو دور کرنا تو کجا انہیں سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کو باغی سمجھ کر زور و قوت کے ذریعہ سے خلیفہ کی اطاعت پر مجبور کیا جائے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف فوج کشی کر کے ان کو قتل کر دیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے شبہات کو دور کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر فوج کشی کی جائے۔ انہیں خلیفہ کی اطاعت کی دعوت دی جائے گی۔ انہیں غور و فکر کرنے اور باہمی مشورہ کی مہلت دی جائے گی اگر وہ پھر بھی اطاعت سے انکار کریں اور مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں تو ان سے قتال کرنا جائز ہو گا۔

بغاوت کی تعریف اور
اطاعت خلیفہ کی شرعی
محدود پر غور کرنے سے

**خلیفہ کی ممانعت کے باوجود
مفدین سے قتال**

اس سوال کا جواب معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن پہلے اس مجمل سوال

کی تفصیل سمجھ لینا چاہیے۔ مسئلہ کی مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں۔
 (اول) مملکت اسلامیہ کے شہریوں کا ایک گروہ خلیفہ سے بغاوت
 کرے اور خلیفہ کسی معذوری یا مصلحت کی وجہ سے اس کی سرکوبی
 کرنے پر تیار نہ ہو اور اس سے استمات کا برتاؤ کرے۔ لیکن
 مملکت کے مسلم شہریوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو
 دینی نقطہ نظر سے ملت یا مملکت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہو
 اس وجہ سے وہ باوجود ممانعت خلیفہ اس سے جنگ کرے اور
 اس باغی گروہ کے مفسد اور واجب التعزیر ہونے پر حکومت
 اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت دونوں کا اتفاق ہو۔

(دوم) گمراہ اور مبتدع افراد پر مشتمل ایک پارٹی قوت حاصل
 کر کے مسلح انقلاب کی کوشش کرے۔ امام وقت کو قتل
 کر کے کسی دوسرے شخص کو امام بنالے جو صحیح المذہب متقی
 اور امامت کا اہل ہو اور جس کی خلافت و امامت پر اہل حق
 اسباب حل و عقد کی ایک معتدبہ جماعت کا بھی اتفاق ہو جائے
 مگر

(الف) اس نظام خلافت میں یہ فرقہ ضالہ باطلہ شریک ہو جائے۔
 (ب) اس حکومت کے نظم و نسق اور اس کی پالیسی پر یہ گمراہ
 گروہ حاوی ہو جائے۔

(ج) یا اس پر حاوی تو نہ ہو مگر اسے حکومت کے نظام اور
 پالیسی پر مؤثر حیثیت حاصل ہو جائے اور اس کا یہ اثر
 معتدبہ ہو۔

اگرچہ اس فرقہ باطلہ ضالہ کے زلیخ و ضلال، بطلان افکار و اعمال اور اس کے واجب التعزیر ہونے پر خلیفہ اور مسلمانوں کا یہ گروہ مخالف متفق ہوں، لیکن خلیفہ اور اس کے معاونین کسی مصلحت یا شرعی عذر کی وجہ سے ان سے استمالت کا برتاؤ کرتے ہوں اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے یا انہیں حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے کسی قسم کے تشدد کے مخالف ہوں۔

اس صورت میں مسلمانوں کی ایک جماعت خلیفہ کی رائے اور اس کی پالیسی کو ملت اسلامیہ یا مملکت اسلامیہ کے لئے دینی نقطہ نظر سے سخت نقصان دہ سمجھتی ہو اور اپنی اس رائے کی بنیاد پر ان اہل باطل پارٹی سے خلیفہ کی مرضی کے خلاف جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور وہ اپنی اس رائے کو عملی شکل دیدے۔

(سوم) (الف) مملکت اسلامیہ پر باہر سے کفار حملہ کر دیں۔ یا (ب) مملکت میں رہنے والے ذمی اور معاہدہ غیر مسلم بغاوت کر دیں۔ یا

(ج) مسلمانوں کا ایک گروہ العیاذ باللہ مرتد ہو کر حکومت کی اطاعت سے انکار کر دے۔

اور ان سب صورتوں میں حکومت باغیوں یا بیرونی حملہ آوروں سے جنگ نہ کرنا چاہتی ہو۔ مگر مسلمانوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو غلط اور دین و ملت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہو اور خلیفہ کی رائے کے خلاف ان سے جنگ کرنا ضروری سمجھتا ہو اور وہ اس مفسد گروہ کے خلاف جنگ کرے۔

چچا اہم مملکت اسلامیہ کا کوئی گروہ کسی ایسے واجب شرعی کے متعلق اختلاف کی وجہ سے خلیفہ اور اس کی حکومت کا مخالف ہو جائے اور اس کی اطاعت سے انکار کر دے جس میں کسی اجتہادی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ گویا وہ صاف صاف حکم شرعی کو ماننے سے انکار کر دے اس موقع پر خلیفہ اور اس کی حکومت کا رویہ یہ ہو کہ اس کی استمالت کی جائے بخلاف اس کے مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لئے جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور اس ضروری سمجھنے کا سبب یہ ہو کہ ۔

(الف) اس کی رائے میں اس واجب شرعی اور حکم اسلامی پر عمل کرنے سے انکار کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کرنا اور اگر ضرورت ہو تو اس سے قتال کرنا شرعاً جمہور مسلمین پر واجب علی الکفایہ ہو جو پہلے حکومت پر عائد ہوتا ہے اور اگر حکومت اسے ادا نہ کرے تو اس کے نزدیک یہ فریضہ جمہور مسلمین کا ہے۔ اس کے ساتھ قتال مذکور کے واجب علی الکفایہ ہونے پر خلیفہ اور زیر بحث جماعت کا اتفاق ہو۔

(ب) اس کی رائے میں زیر بحث منکر اطاعت کو مہلت دینا اور اس کی سرکشی پر اس کی سرکوبی سے گریز کرنا موجب فتنہ و مفسدہ اور دینی و ملی مصلحت کے خلاف ہو اور اس جماعت منکرہ کی گمراہی اور فتنہ پر دازی کے بارے میں خلیفہ اور اس کی پالیسی سے اختلاف کرنے والے متفق الرائے ہوں۔

مندرجہ بالا صورتوں میں سے ہر صورت کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں عامۃ المسلمین کا ایک گروہ اگر ان لوگوں سے جنگ کرے جنہوں نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کیا یا جنہوں نے غیر آئینی اور غیر شرعی طریقہ سے ایک منتخب خلیفہ کو معزول یا قتل کر کے دوسرا سربراہ مملکت مقرر کر دیا جبکہ موجودہ خلیفہ اسے باز رہنے کا حکم دے رہا ہو تو اس گروہ کے اس فعل کو جو خروج عن الطاعة ہے شرعاً بغاوت اور اس کے مرتکبین کو از روئے قوانین اسلام باغی کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ ان میں سے کسی صورت کو بھی شرعاً بغاوت نہیں کہا جاسکتا اور اس قسم کا اقدام کرنے والے از روئے آئین اسلام باغی نہیں ہیں۔

بغاوت کا شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس جماعت نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کر دیا اور اس کے حکم کے خلاف ایک ایسے گروہ سے جنگ شروع کر دی جس سے جنگ کرنے کی وہ مخالفت کر رہا ہے اور جسے حکومت اسلامیہ نے قانونی تحفظ عطا کیا ہے۔ گویا یہ جنگ خود خلیفہ اور حکومت کے خلاف ہے۔ یہ شبہ سطحی انداز فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ نظر غائر اسے غلط اور بے بنیاد قرار دیتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا زیر بحث گروہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے؟ یا اس کی یہ جنگ خلیفہ کو معزول کرنے کے لئے ہے؟ دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ وہ قولاً یا عملاً

ان دونوں باتوں میں سے کسی کا اظہار نہیں کرتا۔ رہا اطاعت سے انکار کا مسئلہ تو اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے کہ مطلق اطاعت سے انکار اور خروج کو بغاوت نہیں کہتے بلکہ اطاعت واجبہ سے خروج کو بغاوت کہتے ہیں جبکہ دوسری شرائط بھی موجود ہوں۔ اس لئے زیر بحث مسئلہ میں جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور کو بغاوت ثابت کرنے کے لئے یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس پر امام کے حکم مذکور کی اطاعت واجب بحق اور اس نے اطاعت واجبہ سے خروج کیا اور زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی یہ بات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہوتی بخلاف اس کے صورت حال پر غور کرنے سے یہ بات عقل و فہم کو زیادہ متاثر کرتی ہے کہ اس جماعت کا یہ اقدام بالکل جائز بلکہ ادائے واجب علی الکفایہ کا ایک مصداق ہے۔ کیونکہ یہ واجب علی الکفایہ بنی عن المنکر کی ایک شکل اور دین و ملت کو ایک ضرر سے محفوظ رکھنے کی کوشش ہے۔ اس لئے اسے عملی صورت دینا چاہیے اور خلیفہ کی مخالفت کی پروا نہ کرنا چاہیے۔ گویا اس معاملے میں خلیفہ کی اطاعت جائز بھی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔

زیر بحث جماعت جب ایک گروہ کی سرگرمی اور سرکشی کو ملت اسلامیہ کے لئے سخت مضر سمجھتی ہے تو اس کی سرکوبی سے احتراز اور اس کی استمالت کے بارے میں خلیفہ کا حکم کیسے مان سکتی ہے؟ شرعاً اس کے لئے جائز ہے کہ اس معاملے میں خلیفہ کی

اطاعت سے انکار اور باغیوں سے جنگ کا آغاز کر دے خصوصیت کے ساتھ جبکہ زیر بحث مفسد گروہ کی فساد انگیزی پر فریقین یعنی حکومت اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت متفق ہوں۔

مندرجہ بالا مسائل میں حکومت سے اختلاف کرنے والی جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور پر بغاوت کی تعریف صادق نہیں آتی۔ کیونکہ زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی فریق مذکور کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا نہیں ہوتا اس لئے بغاوت کی حقیقت کا ان میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس جماعت نے حکومت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے بلکہ ایک دوسری جماعت کے خلاف اٹھائے ہیں جو خود حکومت کی مخالف ہے۔ درحقیقت ان کی جنگ بالواسطہ مملکت کی مصلحت اور خلیفہ کی موافقت اور تقویت کے لئے ہے۔ اسے بغاوت کہنا روشنی کو ظلمت کہنا ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُعَاتِلُوكَ يَا نَعْمُ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ
عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ أَلَّذِينَ أَخْرَجُوا
مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا
اللَّهُ ۖ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لَّهَدَّتْ صَوَامِعُ وَيَعٍ وَصَلَوَاتُ
وَمَسْجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا
وَلَا يَنْصُرُونَ اللَّهَ مَن يَنْصُرُهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ

عَزِيزٌ ۝

ترجمہ :- جن سے جنگ کی جاتی ہے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیتے گئے محض اس جرم میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں کے ذلیل سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعہ، گمبج، عبادت خانہ اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر ڈالے گئے ہوتے۔ اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اللہ (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔ اور اللہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی جماعت کو اگر ان پر ناجائز طور پر ناحق حملہ کیا جائے تو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ اگرچہ کفار کے متعلق ہے مگر اذن جنگ کی علت کفر نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ظلم اور زیادتی (یا ظلم و ظلمت) بتائی گئی ہے جس کا مال یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاں بھی اور جو بھی ظلم زیادتی کرے وہاں مسلمانوں کو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ مسلمانوں کی اس جماعت میں مدافعت کی قوت ہو اور کسی بڑے فتنہ اور فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ چونکہ اذن جنگ کو کفر پر مبنی نہیں کیا گیا ہے بلکہ ظلم پر مبنی کیا گیا ہے اس لئے اگر مبتدع اور فتنہ پرور جماعت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہو تو یہی حکم اس وقت

بھی ہو گا۔

ظلم انفرادی بھی ہو تا ہے اور اجتماعی بھی، حتیٰ بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی۔ آیت میں لفظ ظلم عام ہے اور یہ سب اقسام اس کے تحت داخل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی گروہ کی طرف سے کفر و ضلال کی ترویج کر کے دین اسلام کو نقصان پہنچانے یا اجتماع امت میں انتشار پیدا کرنے یا مملکت اسلامیہ کی قوت کمزور کرنے یا اسی طرح کا کوئی ایسا اجتماعی نقصان یا ایسی اجتماعی تکلیف و اذیت پہنچانے کی کوشش کی جائے جو شرعاً معتد بہ نقصان یا اذیت سمجھا جاتا ہو تو مسلمانوں کی ہر ایسی جماعت کو جس کی تعداد معتد بہ ہو اور جو قتال کی استطاعت رکھتی ہو اس گروہ سے جو کافروں یا اہل بدعت و ضلال کا گروہ ہو قتال کرنا جائز ہے اور آیت اسے اذن قتال دے رہی ہے۔

یہ اذن قتال عام مسلمانوں کو بشرائط مذکورہ دیا گیا ہے جس میں حکومت بھی شامل ہے۔ لیکن یہ اذن خلیفہ یا حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اصل مخاطب جمہور المسلمین ہیں۔ بغاوت کی مذکورہ بالا تفصیل کے بعد غالباً سمجھ میں آگیا ہو گا کہ نہ مملکت کے خلاف ہر خروج بغاوت ہے اور نہ ہر خروج میں عامۃ المسلمین کو خروج کرنے والوں سے قتال جائز ہے۔ بلکہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود خلیفہ وقت کے خلاف خروج کریں (مذکورہ بالا شرائط ذہن میں رہیں)

اور کسی شہر پر قبضہ جمالیں اور امام کی اطاعت سے روگردانی کریں تو حکومت کو چاہیے کہ ان کو جماعت کا ساتھ دینے کی دعوت دے اور ان کے غیبات کے ازالہ کی کوشش کرے۔ بغاوت فی نفسہ کفر کی موجب نہیں ہے۔ وہ مسلمان ہیں اور کسی مسلمان کو بلا وجہ شرعی قتل کر دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ مخنک پر آمادہ ہوں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوں یا جنگ شروع کر دیں اور صلح و صفائی کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور ان کی جمعیت کو بے گندہ کر دیا جائے گا۔ اگر ان کی باقاعدہ جمعیت ہو تو زخمیوں کو قتل کر دیا جائے گا اور جو شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوں ان کا تعاقب کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی جمعیت کے ساتھ مل کر دوبارہ فتنہ و فساد کا باعث نہ بن سکیں۔ لیکن ان کے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرنے اور ان کے ساندو سامان کو مال غنیمت سمجھ کر مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے :-

لَا تَجِدُ أُمَّةَ إِلَّا بِمَنْعٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَلَا يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا وَلَا يَكْفُلُ
أَن يُقَتَّلَ آتِيًا يَحِيَّةً وَأَن تَكُونُ الْخُلَافَةُ
أَوْ يُنْفَخُوا مِنَ الْأَرْضِ ط ذَٰلِكَ لَعْنَةُ اللَّهِ فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○

تو جملہ دہریہ لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے

اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں

خوب قتل کیا جائے۔ یا رسول پر لشکا یا جائے یا ان کے ہاتھ

پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا سر زمین اسلام

سے ملک بدر کر دیا جائے۔ اس جرم کی وجہ سے ان کو کئے

دنیا میں رسوائی اور ذلت ہے اور آخرت میں بڑا عذاب

ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ

کرنے کی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ اور اس

کا رسول باطل پر نہیں ہو سکتے۔ لہذا جس حکومت کے خلاف

بغاوت کی یہ سزا ہے اس کا برحق اور مبنی بر عدل و انصاف ہونا

ضروری ہے۔ اگر وہ کسی مسلمان مگر بابرو ظالم حکومت کے

خلاف بغاوت کا علم بلند کریں جو حدود اللہ کو قائم نہ کرتی ہو اور

انتظام حکومت شرعی احکام کے خلاف چلا رہی ہو، مظلوم کی

داد رسی اور ظالم کی سرکوبی کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، شعائر

اسلامی کی توہین کی مرتکب ہو رہی ہو، اللہ اور اس کے رسول

کے احکام کی کھلم کھلا مخالفت کا ارتکاب کر رہی ہو تو ایسی

حکومت کے خلاف خروج کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔ ایسی حکومت

کے خلاف خروج کرنے والوں کی یہ سزا نہیں ہے۔

اللہ اور اس کے رسول سے (یعنی مبنی برحق حکومت سے)

جنگ اور قانون شکنی، سرزمین اسلام میں فتنہ و فساد پھیلانے

کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ڈاکے ڈالے جائیں، تخریب کاری کی جائے، لوگوں کے قتل کیا جائے۔ اس کی سزا بھی قتل ہے۔ تفصیل باب قطع الطريق میں گزر چکی ہے۔

باغیوں کی تحصیل و وصول | اگر کسی علاقے پر باغی قبضہ کر لیں اور وہاں کے

لوگوں سے خراج، عشر، زکوٰۃ وصول کر لیں اور ان سے جنگ کرنے کے بعد اسلامی حکومت باغیوں کا استیصال کر کے پھر اس علاقے پر اقتدار حاصل کرے تو اس علاقے کے لوگوں سے عشر، خراج اور زکوٰۃ دوبارہ وصول نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ تھا کہ وہاں کے باشندوں کی حمایت و حفاظت کرتی اور باغیوں کی زور بردستی سے بچاتی۔ اسلامی حکومت اپنا واجب فریضہ ادا نہیں کر سکی یہ اس کا قصور ہے۔ وہاں کے باشندے اس کی سزائیں بھگتیں۔ اگر باغیوں نے جو کچھ وصول کیا تھا اسے اس کے جائز مصارف میں صرف کیا ہے تو ظاہر ہے کہ لوگوں کا فریضہ صحیح طور پر ادا ہو گیا اور اگر انہوں نے صحیح مصروف میں صرف نہیں کیا تو حکومت کو تو ان سے دوبارہ وصول کرنے کا حق نہیں، البتہ یہ اللہ اور ان کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنا خراج، عشر اور زکوٰۃ کی بقوم صحیح مصارف میں دوبارہ خرچ کر دیں۔

(باب الخوارج)

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے باغیوں کی تفصیل

الخوارج ، خارجۃ کی جمع ہے جو خَرَج سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ خَرَج کے معنی نکلنے کے ہوتے ہیں۔ خَرَجَ عَلَیْہِ اس نے اس کے خلاف خروج کیا یعنی بغاوت کی۔ خَارِجۃ کے معنی بغاوت کرنے والی جماعت کہے ہیں۔ جس کی جمع خَوَارِجُ آتی ہے۔ اَلْخَوَارِجُ اس آدمی کو کہتے ہیں جو شاہی خاندان سے نہ ہو اور بادشاہ بن جائے نیز اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماں باپ تیز دوڑنے والے نہ ہوں مگر وہ ماں باپ کے خلاف تیز دوڑے ایسے ہی اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلطان یا جماعت کی مخالفت پر اتر آئے۔ نیز اس شخص کو بھی جو خارجی فرقوں کے عقائد کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسلامی بڑے فرقوں میں سے سات فرقے خوارج کہلاتے ہیں۔ جن کی تفصیل عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔ (المنجد ص ۱۶۹ و تاج العروس و محیط المحيط)

تاریخ اسلام میں خوارج دراصل وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف خروج اور بغاوت کی ہو اور وہ جماعت

سے الگ ہو گئے ہوں۔ اسلام آیا تو تین قسم کی جماعتیں سامنے آئیں۔ ان تینوں کا تذکرہ قرآن کریم نے پہلے ہی پارے (پارہ الٹھ) میں کر دیا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ مؤمنین ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے شرح صدر کے ساتھ اسلامی دعوت کا انکار کر دیا۔ قرآن کریم نے انہیں کافر اور کفار کہا ہے۔ تیسرے وہ جو بظاہر حلقہٴ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن وہ دل سے اسلام نہیں ملائے۔ انہیں منافقین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان منافقین ہی میں قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ جنہوں نے اسلام کو ظاہر میں قبول کر لیا۔ اور انہیں کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی لیکن وہ درپردہ مخالفین اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے رہے۔ یہ تو منافقین ہی کہلاتے انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے کہ انہوں نے کبھی کچھ طاقت حاصل کر لی اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بھی اسلامی حکومت اور اسلامی جمعیت کے خلاف مسلح مزاحمت اور مسلح بغاوت پر اتر آئے۔ یہ لوگ تھے تو منافقین ہی لیکن ان کو تاریخ اسلام نے خوارج کے لقب سے یاد کیا۔ بہر حال یہ منافقین جو اسلام کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے پر اتر آئے خوارج کے لقب سے یاد کئے گئے۔ آگے چل کر انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور عام مسلمانوں کے عقائد کے برخلاف انہوں نے چند عقائد میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے

لئے کچھ نئے عقائد کا پرچار کیا۔ اور شدہ شدہ مسلمانوں سے ان مختلف مخصوص عقائد رکھنے والوں ہی کو خوارج کہا جانے لگا لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے وہ ان منافقین ہی کا حصہ تھے جنہوں نے اسلامی حکومت اور اسلامی جماعت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ اس معنی میں بھی خارجی تھے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے بہتر مسلمان ہونے کے مدعی تھے بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو مسلمان سمجھتے تھے اور باقی مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے جیسا کہ عربوں میں خارجی اس گھوڑے کو کہتے تھے جو اپنے آپ کو اپنے ماں باپ سے بہتر ثابت کرتا تھا کہ جس تیز رفتاری اور عمدگی کا ثبوت اس کے ماں باپ نہیں دے سکے تھے وہ اس کا ثبوت مہیا کرے اور ان سے بازی لے جائے

خوارج رسول اکرمؐ | ان خواص کا وجود ہر زمانہ میں رہا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے مبارک عہد میں بھی ان کا وجود ملتا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

حدثنا عبد الله بن محمد قال حدثنا هشام

قال اخبرنا معمر عن الزهري عن ابي سلمة

عن ابي سعيد قال بينا النبي صلى الله عليه وسلم

يقسم جاء عبد الله ذو الخويصرة التميمي فقال

اعدل يا رسول الله قال ويلك من يعدل

اذما عدل قال عمار بن الخطاب امثذني

فأضرب عنقه قال دعه فان له اصحابا يحقرون
احداكم صلاته مع صلاته وصيامه مع
صيامه يمرون من الدين كما يمرق السهم
من الرمية ينظر في قدخة فلا يوجد فيه
شيء ثم ينظر في نصله فلا يوجد فيه شيء
ثم ينظر في رصانه فلا يوجد فيه شيء
ثم ينظر في نصيبه فلا يوجد فيه شيء -
قد سبق الغرث والدم - ايتهم رجل
احدى يديه او قال ثدييه مثل ثدى
المرأة او قال مثل البضعة قد ردو ويخرجون
على حين فرقة من الناس - قال ابو سعيد
اشهد انى سمعت من النبي صلى الله عليه
وسلم واشهد ان عليا قتله وانا معه
جئى بالرجل على التعت الذى نعت النبي
صلى الله عليه وسلم قال فنزلت فيه - و
منهم من يلزمك فى الصدقات -

کا مال) تقسیم فرما رہے تھے عبداللہ ذوالخویصرہ تمیمی آیا اور اس نے کہا: اے رسول اللہ! انصاف کیجئے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا ناس ہو، اگر میں بھی انصاف نہیں کروں گا تو کون انصاف کرے گا؟ حضرت عمر بن الخطابؓ نے آنحضورؐ سے عرض کیا: مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپؐ نے فرمایا اسے چھوڑو۔ اس کے ساتھ ہی ایسے ہیں کہ تم ان کی نماز کے سامنے اپنی نماز کو، ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزے کو حقیر سمجھو گے۔ لیکن وہ دین سے اس طرح نکل چکے ہوں گے جیسے کمان سے تیر نکل جاتا ہے کہ اس کے ریش کو دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے، اس کے بھالے میں دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے اس کے بھالے کے نیچے عصب میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے۔ پھر اس کی لکڑی میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے۔ وہ گوبر اور خون سے صاف نکل جائے۔ ان کی نشانی ایک ایسا آدمی ہوگا کہ اس کا ایک ہاتھ عورت کے ہاتھ کی طرح ہوگا یا یوں فرمایا کہ اس کے سینہ کا ایک ابھار عورت کے پستان کی طرح ہوگا یا یوں فرمایا کہ گوشت کے ایک ٹوٹے کی طرح ہوگا جس میں ایک طرح کی لہزش اور کپکپی ہوگی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے باہم اختلاف کے وقت نکلیں گے۔ ابوسعیدؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں

نے یہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور
میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو قتل کیا
تھا۔ اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ اس وصف کے مطابق
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تھا ایک شخص کی
نعش حضرت علیؓ کے سامنے لائی گئی تھی۔ اسی سلسلہ
میں یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ ان منافقوں میں ایسے
لوگ بھی ہیں جو آپ کو صدقات کے بارے میں مطعون
کرتے ہیں۔

اس حدیث پہا امام بخاری نے ”من ترک قتال الخوارج
للتألف“ کا باب باندھا ہے یعنی ”تالیف قلب کی خاطر خوارج
سے قتال کرنے کو ترک کر دینا“

امام بخاریؒ ہی نے اس سے پہلے ”باب قتال الخوارج
والمحدثین“ کے تحت ”یعنی خوارج اور ملحدین سے جنگ کرنا“
یہ حدیث نقل فرمائی ہے:-

حدثنا عمرو بن حفص بن غياث قال حدثنا ابی
قال حدثنا الاعمش قال حدثنا خيثمة قال
حدثنا سويد بن غفلة قال علی اذا حدثتکم
عن رسول الله صلی الله علیه وسلم فوالله لان
اخر من السماء احب الی من ان الکذب علیه
واذا فیما بینی وبينکم فان الحرب خدعة وانی
سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول

سیخرج قوم فی آخر الزمان حداث الاسنان
سفهاء الاحلام یقولون من خیر قول البریة
لا یجاذر ايمانهم حناجرهم یرقون من
الدين كما یرق السم من الرمية - فايها
لقیموهم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجرا
لمن قتلهم يوم القيامة -

(صحیح بخاری ص ۱۰۲۳ مطبوعہ مطبعہ مجتہائی دہلی)

ترجمہ :- عمر بن حفص بن غنیث نے (اپنی سند سے)
----- حدیث بیان کی کہ حضرت علیؑ نے فرمایا
حب میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی
حدیث بیان کروں تو اللہ کی قسم مجھے آسمان سے گر پڑنا۔
اس سے زیادہ پسند ہو گا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر جھوٹ بولوں۔ اور حب میرے اور تمہارے درمیان
کوئی بات ہو تو (یعنی آپس میں ہمارا کوئی جھگڑا ہو تو
اس میں الزام تراشی یا غلط بیانی ہو سکتی ہے) کیونکہ جنگ
تو یقیناً الزام تراشی اور فریب کا ہی دوسرا نام ہے پھر حال
میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آخری
زمانہ میں ایک قوم ایسی نکلے گی جو نو عمر ہوں گے۔ دانش
میں پرے۔ رجب کے بیوقوف ہوں گے۔ منہ سے دنیا کی
بہترین باتیں نکالیں گے۔ لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے
نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے ایسے باہر نکل جائیں گے

جیسے تیز کمین سے باہر نکل جاتا ہے۔ تم جہاں کہیں بھی ان سے ہملو، ان کو قتل کرو۔ کیونکہ انہیں قتل کرنے میں ثبات کے دن بڑا اجر ملے گا۔

الحدودوں حدیثوں پر امام بخاریؒ نے جو باب باندھے ہیں وہ خوارج ہی سے متعلق ہیں جس سے ہمارے اس موقف کا تائید ہوتی ہے کہ خوارج کا وجود حضور اکرم ﷺ کے عہد کے مبارک عہد سے شروع ہو چکا تھا۔

یہ وہی منافقین اور خوارج تھے جنہوں نے قباہ میں کفر پھیلانے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور مخالفین اسلام کی سازشوں کے لئے ایک پناہ گاہ اور مرکز کے طور پر استعمال کرنے کے لئے مسجد مزار بنائی تھی جس کا حق تعالیٰ نے سورہ توبہ میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِصْرًا الَّذِينَ حَارَبُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّكُمْ لَكُمْ بُونٌ ۝ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لِمَسْجِدٍ أَشْبَهَ عَلَى النَّاسِ مِنَ آثَلٍ لِيَمِزَ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ وَلَا فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ۝ أَفَمَنْ أَشْبَهَ بُنْيَانَهُ عَلَى النَّعْرَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانِ حَلَدٍ أَمْرٍ مِنَ أَشَسِ

بُنِيَانَهُ عَلَى شَفَا جَوْفِ هَادٍ فَأَنهَارَ بِهِ فِي
نَارٍ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظَّالِمِينَ ○ لَا يَزَالُ بُنِيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً
فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ وَاللَّهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ (١٠٩-١١٠)

ترجمہ ۱۔ اور جن لوگوں نے اس مقصد سے ایک
مسجد بنا کر کھڑی کر دی کہ وہ (اسلام کو) نقصان
پہنچائیں، کفر کریں، مسلمانوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان
لوگوں کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے
اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں
کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ
(اسلام کی) کھلائی ہو۔ لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ
اپنی قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم کبھی
اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا۔ اس بات کی کہ تم اس میں
کھڑے ہو (اور بندگان الہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں)
وہی مسجد حق دار ہے جس کی بنیاد اگلے دن سے تقویٰ
پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اُس میں
ایسے لوگ آتے ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے
ہیں۔ اور اللہ بھی پاک صاف رہنے والوں ہی کو پسند
کرتا ہے۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت
کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی (جو

کبھی پلنے والی نہیں) یا وہ جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کھنڈا رہنے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ اپنے کلین کے آتش و دوزخ (کے گڑھے) میں جاگری۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے (یعنی مسجد ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک و شبہ سے مضطرب رکھے گی (یہ کائنات نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتیں۔ کیونکہ یہ ان کے نفاق کی بہت بڑی شہرارت تھی جو چلی نہیں (اس لئے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف و ہراس کی حالت میں رہیں گے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا، اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

پہلی بار جب مدینہ منورہ میں آئے، تو پہلے قبائلی مقام میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو عہد اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ بعض مینافقوں نے جن کی تعداد بعض روایات سے بارہ ثابت ہوتی ہے، اسی مسجد کے پاس ایک نئی مسجد تعمیر کی، اور جب پیغمبر اسلام تبوک کھتے نکل رہے تھے تو آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا۔ ایک دن وہاں آکر نماز پڑھا دیجئے۔ آپ نے فرمایا ابھی تو سفر و تہیہ ہے۔ واپسی پر دیکھا جائے گا۔ پھر جب آپ تبوک سے واپس ہوئے اور

مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو آیت نازل ہوئی اور اللہ نے
بانیان مسجد کے منافعانہ مقاصد سے آپ کو مطلع کر دیا۔ آپ
نے فوراً حکم دیا کہ یہ مسجد گرا دی جائے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ مدینہ
پہنچیں مسجد منہدم کر دی گئی۔

اس آیت میں منافقوں کی مسجد کے چار مقصد بیان کئے

گئے ہیں:-

(۱) ”وَنُورِئُہُ“ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی ڈھیر بھاری اینٹ کی
مسجد الگ بنا کر مخلص مؤمنوں کو نقصان پہنچائیں۔

(ب) ”وَكُفْرًا“ کفر کے مقاصد پورے ہوں۔ معلوم ہوا کہ نیک
کاموں کا نیک ہونا مقصد اور نیت پر موقوف ہے۔ ورنہ مسجد بنانے
جیسا نیک کام بھی کفر کے لئے ہو جاتا ہے۔

(ج) ”وَتَفْرِئَہُ الْکَافِرِیْنَ الْمُوْہِنِیْنَ“ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو لئے
کیونکہ قبائلی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔
اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی، تو جماعت بٹ
جائے گی، کچھ لوگ پھیلی مسجد میں جائیں گے، کچھ نئی مسجد میں
اور خب ایک جماعت نہ رہے گی، تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع
و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے
اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

(د) ”وَلَا ضَادَّ اِلَیْہِ حَادِبُ اللّٰہِ وَ سُوْلَہُ مِنْ قَبْلِہُ“ اللہ اور

اس کے رسول سے جن لوگوں نے جنگ کی، ان کے لئے ایک
کھین گاہ پیدا کر دی جائے۔ یا اس کے انتظار و توقع میں

پہلے سے ایک محفوظ جگہ بنا دی جائے۔ یعنی دشمنان اسلام
کے لئے جو جگہ سے یہ لوگ ساز باز رکھتے تھے، ٹکٹے کی ایک جگہ پیدا
ہو جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک
آدمی ابوہریرہؓ تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا۔
حیدر علیہ السلام مدینہ تشریف لائے تو کلمہ اسلام کا عروج اس
پیشانی گذرا اور وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔
پہلے قریشی مکہ کا ساتھ دیا، پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا
اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی۔ قبائ کے بعض منافقین میں
افواہیں مچیں قدیم سے رسم و رواج تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف
اکھٹاتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا۔ یہاں تین حدیث
اللہ کو نہ بخولہ، اسے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۱۲-۱۱۳

حفاظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

”یہودی لڑائی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب رکھا
تو ابو عامر پر یہ بات بہت شاق گذری اور کلام کلام عداوت ظاہر
کرنے لگا اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین قریش سے
جاملے اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر پنے پر
مائل کرتا تھا۔ اب عرب کے سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے اور جنگ
احد کے لئے پیش قدمی کی۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو ضرر پہنچا۔۔۔
اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گروہے کھود

رکھے تھے۔ ان میں سے ایک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 گر پڑے آپ کو مصرت پہنچی۔ آپ کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ نیچے کی طرف
 سے سامنے کے چار دانت آپ کے ٹوٹ گئے، سر بھی نبی کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم کا زخمی ہو گیا۔۔۔۔۔ اسلام بڑھتا چلا جا رہا تھا تو وہ
 ملک روم ہرقل کے پاس گیا۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 کے برخلاف مدد مانگی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ اس نے اپنی اہلیہیں
 کا میاب ہوتی دیکھیں تو ہرقل کے پاس بھٹک گیا اور اپنی قوم انصار
 میں سے ان لوگوں کو مدینہ بھیجا جو اہل نفاق تھے کہ شکر لے کر
 آ رہے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب جنگ ہو گئی۔
 ان پر غالب آ جاؤں گا اور انہیں اپنی اسلام سے پہلے کی سابقہ
 حالت پر آنا پڑے گا اور ان اہل نفاق کو حکم بھیجا کہ اس کے لئے
 پناہ کی جگہ بنائے رکھو اور میرے احکام اور مراعات جو لے کر آیا
 کریں ان کے لئے قیام گاہ اور مامن بنائے رکھو تاکہ اس کے
 بعد جب وہ خود آئے تو اس کے لئے کمین گاہ کا کام دے چنانچہ
 ان منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک اور مسجد بنا ڈالی۔ اس
 کی تعمیر کر دی اور اس کو سچتہ کر دیا۔۔۔۔۔ ابو عامر نے ان
 سے کہا کہ تم ایک مسجد بناؤ اور جس قدر بھی تم سے ممکن ہو اس
 میں ہتھیار اور سامان جنگ چھپائے رکھو۔ کیونکہ میں قیصر
 ملک روم کی طرف جا رہا ہوں، اُدھر سے لشکر لے کر آؤں گا۔
 اور محمد اور ان کے اصحاب کو مدینے سے نکال دوں گا۔ الخ
 (تفسیر ابن کثیر پارہ ۳ ص ۱۳ مطبوعہ نور محمد کراچی)

تصریحات بالاسے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ ”مسجد ضرار“ بنانے والے دراصل وہی منافقین تھے جو مسلح بغاوت کرنا چاہتے تھے اور مملکت اسلامیہ کے خلاف خروج کی سوچ رہے تھے انہوں نے بظاہر ایک مسجد بنائی تھی، لیکن ان کا اصل مقصد اسلام کے خلاف اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لئے ایک مرکز، ایک کمین گاہ اور ایک پناہ گاہ بنانا تھا جہاں ان کے اجتماعات ہو سکیں اور ابو عامر راہب کے گماشتے اور قاصد جو اس کے احکام اور پیغامات لے کر آتے تھے وہاں قیام کر سکیں اور جہاں مسلح جدوجہد کے لئے اسلحہ اور سامان جنگ کا ذخیرہ کر سکیں۔ لہذا یہ مسجد دراصل خوارج (باغیوں) کا مرکز تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہدم کر کے اس میں آگ لگوا دی۔

خوارج صدیق اکبرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب بحیثیت خلیفہ و رسول اللہ عمل میں آگیا تو انہی خوارج (باغیوں) کے ٹوٹنے نے حکومت اسلامیہ کے خلاف فتنہ ارتداد کی صورت میں خروج کیا۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ طفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ السنن میں فرماتے ہیں :-

قال القاضي عياض وغيره كان اهل الوحدة
ثلاثة اصناف - صنف عادوا الى عبادة الاوثان

وصنف تبعوا مسیلمة والاسود العنسی فقاتلهم
 عمار النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی خلافة ابی بکر
 واعد مسیلمة فجهز الیہ ابوبکر الجیش وعلیم
 خالد بن ولید فقتلوه - وصنف ثالث استمروا
 علی الاسلام لیکنہم محمد و الزکوة ہوتا ولوا
 یا تھا خاصہ ہزمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
 لقولہ تعالیٰ "خُذْ مِنْ أَموَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُ
 وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلَّ عَلَیْهِمْ إِنْ صَلَّوْا تَاقَ
 سَكَنُ لَهُمْ" فرعموا ان دفع الزکوة خاص
 عمار النبی صلی اللہ علیہ وسلم لان غیرہ لا
 ایلطہرہم فلا یصلی علیہم فکیف تكون صلوتہ
 سکنانہم - قلت وصنف رابع اقرؤا بوجوب
 الزکوة ولم یتأولوا کما قبل الصنف الثالث
 ولکنہم منعوا شحابا موالہم وکثروا سواد
 المباحین و نصیوا القتال المسلمین کما نصیوا
 وھذا الذین ناظر عمرو ابی بکر فی قتالہم کما
 وقع فی حدیث الباب الخ

(اعلام السنن ص ۳۵۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

ترجمہ - قاضی عیاضؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ مرتدین کی
 تین اصناف (انواع) تھیں یا ایک صنف تو وہ تھی جو (اسلام)
 سے مرتد ہو گئی بت پرستی کی طرف لوٹ گئی تھی - اور ایک

قسم وہ بھی جنہوں نے مسیلہ کذاب اور اسوہ عشق کا اتباع
 کر لیا تھا ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنروں
 نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ
 میں جنگ کی۔ اور مسیلہ کذاب کی طرف تو حضرت
 صدیق اکبر نے باقاعدہ فوج کشی کی تھی جن کے سردار
 حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے قتل
 کر دیا۔ اور تیسری نوع وہ بھی جو بظاہر اسلام پر
 تھے تو مستقیم رہی لیکن انہوں نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا اور
 اس کی تاویل یہ کی کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
 کے ساتھ خاص تھا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ
 ”اے پیغمبر! ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو۔ اسی
 طرح انہیں پاک کر دیا اور ان کے لئے عفا کرو۔ یقیناً آپ کی دعا ان
 کے لئے باعث سکون ہے“ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ دینا
 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا کیونکہ
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد وہ اور کوئی نہ تو انہیں
 پاک کر سکتا تھا اور نہ ان کے لئے ایسی دعا کر سکتا
 تھا تو ان کی دعا ان کے لئے کیسے باعث سکون ہو سکتی
 تھی میں کہتا ہوں ایک چوتھی قسم بھی تھی جو خوب
 زکوٰۃ کا اقرار کرتے تھے اور تیسری قسم کی طرح کوئی
 تاویل بھی نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اموال

پر حرص کی وجہ سے زکوٰۃ روک لی تھی اور منکرین کی جماعت کی کثرت کا باعث بنے تھے۔ اور مسلمانوں سے جنگ کے لئے اسی طرح آمادہ ہو گئے تھے جیسے دوسرے منکرین۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے ان سے جنگ کرنے کے بارے میں بحث کی تھی۔ جیسا کہ اس باب کی حدیث میں آیا ہے۔

یہ چاروں گروہ مسلح بغاوت پر آمادہ تھے۔ آمادہ ہی نہیں تھے بلکہ عملی اقدام کر چکے تھے۔ جیسا کہ ہم نے ”احکام مرتد“ کے باب میں تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔

ان الارض کافرة وقد رأى وفد هم منكم
قلة - وانكم لا تدرون ايلاً تؤتون ام
نهاراً - وادناهم منكم على بريد وكان
القوم ياملون ان تقبل منهم ونواعدهم
وقد ابينا عليهم ونبذنا اليهم عهدهم
فاستعدوا واعدوا فما لبثوا الا ثلاثا حتى
طرقوا المدينة غارة مع الليل وخلفوا بعضهم
بذي حسي ليكنوا لهم دواً

(تاریخ طبری ص ۴۴۸ مطبوعہ یورپ)

ترجمہ :- ساری سرزمین (عرب) کفر کے آغوش میں چلی گئی ہے اور ان کے وفد نے تمہاری قلت تعداد دیکھ لی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں

یاد دے۔ اور ان کا قریب ترین لشکر تم سے ایک برید
 (منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان لوگوں کو
 کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات مان لیں گے۔
 اور ان سے معاہدہ کر لیں گے مگر ہم نے انکار کر دیا
 اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا۔ وہ جنگ کے لئے
 تیار ہو گئے۔ لہذا تم بھی تیاری کرو۔ پھر تین دن
 پہلے ہی گزرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر رات کے
 وقت ہلہ بول دیا اور اپنی ایک جمیعت کو ذی حسی کے
 مقام پر اپنی پشت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کے پشت پر نہ
 ثابت ہوں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ابتداء عہد خلافت
 میں ایسا نہیں ہے کہ ان خارجیوں کا گروہ ناپید ہو گیا ہو۔ بلکہ
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حشر آیات کے بعد ان کی
 سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھا تھا اور
 کچھ غلط نہیں سمجھا تھا کہ جن تحریکوں کا مدار شخصیتوں پر ہوتا ہے
 وہ تحریک کے سربراہ کے بعد ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ اسلامی تحریک
 کا مدار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شخصیت پر ہی تھا
 اور دینی تحریکات کا مدار تو نبی اور رسول کی شخصیت پر ہی ہوتا
 ہے۔ لہذا نبی اور رسول کی شخصیت اوجھل ہو جانے کے بعد اسے
 ختم کر دینا آسان ہو گا۔ عرب جو صدیوں سے قبائلی نظام کے خوگر
 چلے آ رہے تھے ان کے قدیم نظریات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

آنکھیں بند ہوتے ہی انگڑائیاں یعنی شروع کر دیں۔ اور قبائلی تصویبات پھر جاگ اٹھے۔ انہیں یہ چیز انتہائی ناگوار تھی کہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کا محکوم اور تابع فرمان ہو۔ وہ فطری اور جبلی طور پر آزاد چلے آ رہے تھے اور ایک واحد نظام مملکت کے ماتحت زندگی گزارنا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی کہ ان کے طبعی اور جبلی تصورات کو پر پرزے نکالنے کا آپ کی حیات طیبہ میں موقعہ نہیں مل سکتا تھا اور نہیں ملا۔ انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسلام کا مدار کسی ایک شخصیت پر نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عظیم تربیت سے ایک ایسی ملت کی تشکیل فرمادی ہے جو آپ کے بعد بھی اس تحریک کو ارتقاء سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ سے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنہ ارتداد اتنا ہمہ گیر تھا کہ اکثر سرزمین عرب کفر کے آغوش میں جا چکی تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے جو اپنے آبائی دین، یعنی کفر و مشرک اور اصنام پرستی کی طرف لوٹ گئے تھے۔ عرب جاہلیت کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے ہر قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا اور کوئی قبیلہ اپنے بت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلہ کے بت کے سامنے سرنگوں ہونا اپنے قبیلہ کی توہین سمجھتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد ان کی یہ قبائلی عصبیت چند روز میں

ختم نہیں ہو سکتی تھی اور نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق قریش کے خاندان سے تھا۔ قریش کے ایک فرد نے ”اعظم، لا الہ الا ھو“ کی آواز بلند کی تھی۔ لہذا ان کی نگاہوں میں یہ ایک قریشی پیغمبر کا دین تھا غیر قریش اس کی پیروی کیوں کریں۔ لہذا ہر قبیلہ کو اپنے اپنے قبیلہ کا بت یاد آنے لگا۔ اور انہوں نے اپنی قبائلی عصبيت کی تسکین اس میں پائی کہ وہ اپنے قبائلی بت کی پرستش شروع کر دیں۔

اُدھر کچھ طوائف آزمائوں نے دیکھا کہ محمد قریشی نے ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی اور بھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب سے اپنے اس دین کو منوالیا اور سب اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ کل جدید لائحہ عمل (ہرنئی چیز مزیدار ہوتی ہے) کے مطابق عوام ہمیشہ ہرنئی چیز کی طرف لپکتے ہیں۔ محمد عربی ایک انسان ہی تو تھے، اگر وہ اپنے مشن میں اس قدر کامیاب ہو سکتے ہیں تو ہم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے چنانچہ متعدد مدعیان نبوت نے مذہب سازی کا کاروبار شروع کر دیا۔ ان میں سے مسیلمہ کذاب، اسود عقی، سجاح وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے قبیلوں نے ان کی آواز پر لپیک کہا اور ان کی متابعت شروع کر دی۔ قبیلہ ہستی کی انتہا یہ تھی کہ مسیلمہ کذاب کو اس کے ماننے والے خود بھی جھوٹا نبی سمجھتے تھے لیکن بغیر کسی جھجک کے وہ علانیہ کہتے تھے۔

کذاب ربيعة احب الينا من صادق مضر۔

(صدق اکبر ص ۳۲)

ترجمہ :- (ہمارے قبیلے) ربيعة کا کاذب ترین (نبی)

ہمیں قبیلہ مضر کے صادق (نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم) سے زیادہ پسند ہے۔

مسيلمہ کذاب محض دنیوی اقتدار و حکومت کا بھوکا تھا

امام بخاریؒ نے ایک مفصل روایت میں مسيلمہ کذاب کے یہ

الفاظ نقل کئے ہیں :-

فجعل يقول : ان جعل لي محمد من بعده تبعته

ترجمہ :- مسيلمہ کہنے لگا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے

بعد حکومت میرے لئے کر دیں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کی پیروی کر لوں گا۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ خواہش پوری

نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بعد ہے :-

وقد صحافي بشر كثير من قومه فاقبل اليه

رسول الله صلى الله عليه وسلم ومعه ثابت بن

قيس بن شماس وفي يد رسول الله صلى الله عليه

وسلم قطعة جويد حق وقف على مسيلمة في

اصحابه فقال لو سألتني هذه القطعة ما

اعطيتكها۔

(صحیح بخاری ص ۶۲۸ مطبوعہ مطبعة مجتبائی دہلی)

موجہ ۱۔ وہ اپنی قوم کے بہت سے آدمیوں کے
ساتھ مدینہ میں آیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اس کے پاس تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ حضرت
ثابت بن قیس بن شماس (خطیب انصار) بھی تھے۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں کھجور کی ٹہنی کا
ایک ٹکڑا تھا۔ آپ مسیلمہ کے پاس کھڑے ہوئے۔ وہ
اپنے ساتھیوں میں بیٹھا تھا۔ تو آپ نے اس سے فرمایا
کہ اگر تو مجھ سے یہ ٹہنی کا ٹکڑا بھی مانگے تو میں اسے
تجھے نہیں دوں گا۔

چنانچہ مسیلمہ ناکام و نامراد واپس ہوا اور اپنے قبیلہ میں جا کر
اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی ایک حکومت قائم کر لی۔ وہ
خود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتا تھا، اور خلیفہ رسول
کے لئے پیغمبرانہ خصوصیات کا حامل امام ہونا ضروری سمجھتا
تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے نبی ہونے کے ساتھ وہ اپنے لئے خلافت
کا لقب بھی استعمال کرتا تھا اور اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلاتا
تھا۔ چنانچہ امام بخاری نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول مسیلمہ کذاب
کے قتل کے سلسلہ میں نقل کیا ہے۔

فلخبرني سليمان بن يسار انه سمع عبد الله بن
عمر يقول فقالت جارية علي ظهر بيت
امير المؤمنين قتله العبد الاسود -

(بخاری کتاب المغازی باب قتل حمزہؓ ص ۵۸۳)

ترجمہ ۱۔ تو مجھے سلیمان بن یسار نے بتایا کہ انہوں نے
حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا: تو مکان
کی چھت پر چڑھ کر ایک کنیز نے یہ اعلان کیا کہ یہاں اللہ
کو ایک حبشی غلام (وحشی) نے قتل کر دیا ہے۔

مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر نہیں تھا۔
اسی لئے اپنی اذان میں اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ کہلواتا
تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے لئے نبی کی برابری کا مدعی تھا اس لئے
اس کے بعد اَشْهَدُ اَنْ مَسِيْلَمَةَ رَسُوْلُ اللّٰہِ بھی کہلواتا تھا۔
(ملاحظہ ہو تادم بخاطر)

مسئلہ کذاب کا قبیلہ نہایت شجاع، زور آور اور جنگجو واقع
ہوا تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید
رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک جزار لشکر سے اسی سے یہاں
کے مقام پر جنگ کی اور بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی کشتوں کے
پشتے لگ گئے۔ اگرچہ اسلامی لشکر کامران و کامیاب ہوا۔ لیکن
بے شمار آدمیوں سے اسے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ جنگ یہاں
ہی تھی جس میں قرآن کریم کے حفاظ اور قرار کی بہت بڑی تعداد
شہید ہو گئی اور حضرت عمرؓ کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ قرآن کریم
کے حفاظ و قرار یونہی شہید ہوتے رہے تو قرآن پڑھانے والے
ختم ہو جائیں گے اور انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
سے اصرار کیا کہ قرآن کریم کے تحریر کردہ نسخے زیادہ سے زیادہ
تیار کئے جائیں۔

تیسرا اگر وہ منکرین زکوٰۃ کا تھا۔ جو کہتے تھے کہ زکوٰۃ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص تھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ وہ دوسرے احکام اسلامی کے منکر نہیں تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی وحی نبوت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ لہذا حق تعالیٰ کے منکر نہیں تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور باقی احکام اسلام پر عمل پیرا تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ ۚ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ إِنَّ صَلَواتَكَ

(۹)

یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی ہے۔ ان کے پیغمبر ان کے ایمان سے مدد فرماتے تھے۔ اور صلوات کرو۔ انہیں پاک کرو اور اس کے ذریعہ سب کو ان کی نشوونما کا سامان کرو اور ان کے لئے دعا کرو۔ یقیناً ان کے لئے آپ کا دعا فرمانا سکون کا باعث ہے۔

اس آیت کریمہ میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ کسی اور کو نہیں ہے۔ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ آپ اس کے ذریعہ سب کو پاک کرتے تھے۔ ہماری نشوونما اور بالیدگی کا سامان کرتے تھے۔ ہمارے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ آپ کی دعائیں ہمارے لئے باعث سکون تھیں۔ نبی کے علاوہ دوسرے لوگ نہ تو ہمیں پاک کر سکتے ہیں نہ ہماری روحانی بالیدگی کا کوئی سامان کر سکتے ہیں۔ نہ ان کی دعائیں ہیں۔ وہ

تاثیر ہے جو آپ کی دعاؤں میں ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمارے لئے باعث سکون ہوا کرتی تھیں۔ یہ تمام خصوصیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں تھیں۔ اب جو لوگ بھی سربراہ مملکت چنے جائیں وہ نبی اور رسول نہیں ہیں نہ خصال نبوی کے حامل ہیں۔ لہذا وہ زکوٰۃ کا انسٹی ٹیوشن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قائم تھا، خود بخود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔

چونکہ اگر وہ ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر نہیں تھا۔ لیکن جاہلیت کے تصور کے مطابق ایک قبیلہ اگر کسی دوسرے قبیلے کو کچھ مقررہ رقم ادا کرتا تھا تو دراصل یہ جنگ کے بعد اپنی ہزیمت اور مغلوبیت کا ایک تاوان ہوتا تھا چنانچہ یہ محکومیت اور تابع فرمان ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ جس قبیلہ کو یہ رقم ادا کی جاتی تھی وہ قبیلہ غالب اور حاکم ہوتا تھا جسے یہ تاوان ادا کیا جاتا تھا۔ عرب قبائلی عصبیت کے ماتحت ہر قبیلہ اس میں اپنی ذلت سمجھتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کو کسی قسم کا تاوان ادا کرے۔ زکوٰۃ جو الہی فریضہ تھا اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ جس قبیلے سے صدقات و زکوٰۃ کی کچھ رقم وصول کی جائے وہ اسی قبیلے کے نادار اور غریب طبقے کی امداد پر خرچ کی جائے۔ یہ بات ان سرمایہ داروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اس طرح تو پیمانہ طبقات ہمارے برابر ہو جائیں گے۔ پھر ہم ان سے اپنی مرضی کے مطابق

کس طرح خدمت لے سکیں گے۔ حق تعالیٰ نے عزیز اور نادار طبقہ کو پیٹا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ مالدار اور سرمایہ دار طبقہ کی خدمت کریں۔ اور سرمایہ دار طبقہ ان سے خدمت لے سکے معیشت کا کاروبار ہی اس طرح چلتا ہے کہ کچھ لوگ خدمت کریں اور کچھ لوگ مخدوم ہوں۔ اگر سب کے سب برابر ہو گئے تو سرمایہ داری کا سارا نظام ہی چھوٹ ہو جائے گا۔ ان کا قول ہی یہ تھا جو حق تعالیٰ نے سورۃ یس میں نقل فرمایا ہے۔

أَنظُرُكُمْ مِّنْ لَّدُنَّ إِذْ يَسْأَلُ اللّٰهُ أَطَعْتُمُونِ ۖ إِنَّا نُنْزِلُ السَّمَاءَ مِثْرًا ۚ
 (الذی صُلّٰی مُبِیْنِ) (۱۳۳)

ترجمہ :- کیا ہم ان لوگوں کو کھلا نہیں (اشارہ) نے نہیں کھلا یا۔ جنہیں) اللہ اگر چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا کہ ان کو بھی ہماری طرح دولت مند بنادیتا) تم لوگ تو کھلی گرا ہی میں مبتلا ہو۔

ایک طرف مال کی محبت اور دوسری طرف اسلامی حکومت کے سربراہ کو جو ان کے قبیلے کے بھائے کسی دوسرے قبیلے کا آدمی تھا زکوٰۃ کی رقوم ادا کرنا ان کے خیال میں تاوان تھا جو وہ حاکم قبیلے کو ادا کریں۔ یہ ان کے قبائلی شعور کی توہین تھی۔ اس لئے وہ مملکت کو زکوٰۃ یا صدقات کی صورت میں کچھ بھی ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس چمکتے گروہ کے خلاف فوجی کارروائی سے حضرت عمرؓ کو اختلاف تھا۔

مملکت اسلامیہ کے خلاف عکم بغاوت بلند کرنے والے

عرب کے یہ چار گروہ تھے جن کے نظریات اور مطمح نظر ایک دوسرے سے اگرچہ مختلف تھے۔ لیکن چونکہ چاروں گروہوں کو اسلامی مملکت کے خلاف جدوجہد کرنی تھی اور اس مقصد میں سب متحد و متفق تھے اس لئے چاروں گروہوں نے اس مقصد کے لئے ایک متحدہ محاذ بنالیا تھا اور سب ایک دوسرے کے مدد و معاون بن گئے تھے اور مسلح تصادم کے لئے آمادہ پیکار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ فی الحال میسر ہے اور چوتھے گروہ کے خلاف فوجی کارروائی نہ کی جائے۔ وہ توحید و رسالت کی شہادت دے رہے ہیں۔ کسی اسلامی فریق کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز رد فرمادی اور ان کو بطور سرزنش کے فرمایا۔

اجبار فی الجاہلیۃ و خوار فی الاسلام۔

ترجمہ :- جاہلیت کے زمانہ میں تو بڑے سوار مانتے

تھے۔ اسلام میں بڑوں نے جبار ہے ہو۔

وہ عربوں کے اس اقدیم اور اس سے پتیا ہونے والے دور رس نتائج سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ جو بھی صلوة اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا آپ کی اس بصیرت قلبی پر صحابہ کرام کا جماع ہو گیا اور سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کر لیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ طاقتور مزید ایک آدھ جگہ کے علاوہ سارا

عرب اس فتنہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ یہ اسلام کے لئے نازک ترین لمحہ تھا جس میں اسلام اپنی موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اسلام کی نیا بیج منبھدار میں ڈول رہی تھی کہ اب عزقاب ہوئی کہ تب عزقاب ہوئی۔ یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ایسے وقت میں ایک ایسا قائد میسر آ گیا تھا۔ جس کے عزم و استقلال اور ثبات قدمی کے آگے حضرت عمرؓ بھیما کوہ آٹھا جنت و حوصلہ کا مالک بھی پانی پھرنا نظر آتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بقول تاریخ نگاروں کے اسلام کی حالت اس بکری کی سی ہو گئی تھی جو موسم سرما کی بارش میں کھڑی بھیگ رہی ہو اور جسے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملے۔ لہ

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۶۱)

لہ ماتم کیجئے ان بے بصیرت راویوں کی دین و دانش کا جو اس قسم کی روایات نقل کرتے ہیں کہ اسلام کے ایسے نازک وقت میں جبکہ اسے اپنی بقا اور فنا کا سوال درپیش تھا بنو ہاشم کے سربراہ آوردہ حضرات اسلامی مملکت کے مترنزل گھنڈرات کی بنیاد پر اپنی خلافت کا محل تعمیر کرنے کے درپے تھے۔ اور حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، اور حضرت فاطمہ زہراؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے وفات یافتہ خسر، بھتیجے اور باپ کی وراثت کے دعوے لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کو بیرونی خطرات کے سامنے سامنے اندرونی خلفشار میں بھی مبتلا کر دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے خیال میں یہ ساری روایتیں جعلی اور بناوٹی ہیں جو ان صحابہ کرام پر بہت بڑا ہتھان ہیں۔ اس وقت یہ

بہر حال یہ زبردست خارجی (باغیانہ) تحریک تھی جس کا مقصد اسلامی مملکت کا تختہ الٹنا ہی نہیں تھا بلکہ خود اسلام کو صغیر ہستی سے مٹا دینا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا وہی منافقین تھے جو خود عہد رسالت مآب میں بھی پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ارشاد الہی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ
وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔

(۹/۲۴)

ترجمہ :- اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے خلاف سختی کیجئے۔

چنانچہ منافقین کے خلاف جنگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں شروع ہو چکی تھی جس کی تکمیل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی اور مسلمانوں نے متحد و متفق ہو کر ان کا زور بڑی حد تک توڑ دیا اور اسلامی مملکت کو ثبات و استحکام عطا کر دیا جس کی بنیاد پر آگے چل کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شاندار حکومت کی تعمیر فرمائی۔ یہ منافقین جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تمام حضرات تو اسلام کی نیا کو چاروں طرف سے ہجوم کر کے آنے والے متلاطم طوفانوں سے بچا کر کنارے پر لگانے میں مصروف تھے۔ اس وقت انہیں ان پیش پا افتادہ ذاتی مفادات سے نہ کوئی سروکار ہو سکتا تھا، نہ تھا۔

عہد میں زبردست بغاوت کا علم بلند کیا تھا خوارج ہی تھے۔ خوارج ایک مخصوص عقائد کے پیرو ہونے کی حیثیت سے تو بعد میں چل کر روشناس ہوئے۔ لیکن شروع میں وہ منافقین جو حکومت کے خلاف مسلح خروج کرتے تھے وہی خوارج کہلاتے تھے۔ چنانچہ یہ سب خوارج ہی تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت کچھ طویل عرصہ پر محیط نہیں ہے وہ صرف اڑھائی سال کا مختصر ترین عرصہ ہے لیکن اس مختصر ترین عرصہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ان کے تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ سارا عرب فتنہ ارماد کی گرفت میں آچکا تھا۔ ان سے ٹٹنا آسان کام نہیں تھا۔ ان کے چار بڑے بڑے گروہ تھے۔ کچھ تو اپنے آبائی عین کی طرف لوٹ گئے تھے۔ کچھ جموٹے مدعیان نبوت کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔ کچھ زکوٰۃ سے انکار کر رہے تھے کچھ زکوٰۃ کی فرضیت کے تو منکر نہیں تھے مگر مرکز حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور ہر ایک گروہ کے متبعین کثیر تعداد پر مشتمل تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ چند مقامات کو چھوڑ کر اکثر جزیرۃ العرب اس کی گرفت میں آچکا تھا۔ خوارج (باغیوں کے) اس زبردست فتنہ کو فرو کرنا اور اس کے ساتھ ہی ان فتنوں کو بھڑکانے والی ایران اور روم کی صدیوں پرانی مستحکم حکومتوں سے بھی نبرد آزمائی کی ابتداء کر دینا بڑے ہی دل گرے کا کام تھا۔ (واضح رہے

کہ اسلام خواہ مخواہ دوسرے غیر مسلم ممالک پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ خوارج کی اس شورہ پستی کی امداد و اعانت ایران و روم کی حکومتوں کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھی اور اس قسم کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں کہ ایرانی اور باز نطینی حکومتیں اسلام کے خلاف حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور ان کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ ہوا چاہتا ہے جس کی روک تھام کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو عملی اقدام کرنا پڑا تھا اور ان تمام محاذوں پر پیہم کامیا بیاں حاصل کرتے چلا جانا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے مثال شجاعت، بصیرت، دور اندیشی اور فراست ایمانی کی دلیل ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا ہی احسان تھا کہ ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو ایسا سربراہ عطا کر دیا۔ ورنہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور شخص فائز ہوتا تو وہ ان تمام مشکلات سے اس قلیل ترین عرصے میں عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے پناہ صلاحیت کا ثبوت ہے۔

خوارج فاروق اعظم | حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت

فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے۔ ان کا دور خلافت لمظاہر نہایت کامیاب رہا اور روز افزوں فتوحات و غنائم سے مسلمان ایک عظیم طاقت بنتے چلے گئے ہر طرف

خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا۔ بظاہر خوارج (باغیوں) کے فتنہ نے ان کے عہد میں سر نہیں اُٹھارا لیکن زیر زمین سازشیں اور ریشہ دوانیاں ان کے دور میں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن خوارج (باغیوں) کو کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ مؤطا امام محمدؒ میں حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ کی یہ روایت موجود ہے :-

عن سالم بن عبد اللہ قال قال عمر رضی اللہ عنہ لو علمت ان احدا اقویٰ علی هذا الامر منی لکان ان اقد فر فی ضرب عنقی اھون علی۔ فمن ولی الامر بعدی فیعلم ان سیرودہ عند القریب والبعید وایم اللہ ان کنت لا قاتل الناس عن نفسی۔

(مؤطا امام محمدؒ باب النوادر ص ۸۲)

ترجمہ :- حضرت سالم بن عبد اللہ (حضرت عمرؓ کے پوتے) فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے سے زیادہ کسی شخص میں اس امر (خلافت) کی زیادہ قوت و صلاحیت دیکھتا تو میرے لئے اپنی گردن کٹوا دینا اس منصب کو قبول کرنے سے زیادہ آسان ہوتا۔ لہذا جو شخص میرے بعد اس منصب پر فائز ہوا سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے نزدیک اور دور کے سب لوگ ہی اس منصب سے ہٹانے کی کوشش

کریں گے اور مجھے بھی اپنے نفس کی طرف سے لوگوں سے
نبرد آزما رہنا پڑا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہیں۔
اول تو یہ کہ حضرت عمرؓ منصب خلافت کے ہرگز خواہشمند نہیں تھے
بلکہ انہوں نے اس منصب کو اس مجبوری سے قبول کیا تھا کہ
ملتِ اسلامیہ میں اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر کوئی زیادہ
باصلاحیت اور قوی تر شخص موجود نہیں تھا۔ اگر حضرت عمرؓ اس
منصب کو قبول نہ فرماتے تو مسلمانوں کو نہ معلوم کس قدر مشکلات
سے گزرنا پڑتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ یہ صرف حضرت عمرؓ کا ارشاد
ہی نہیں ہے بلکہ تمام اہل الائمۃ حضرات، (دورِ اول سے آج
تک) اس کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ وہ اسلام کے دوست ہوں
یادشمن سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ کا ثانی آج تک پیدا
نہیں ہوا، اور ان کا انتخاب بالکل صائب اور صحیح تھا۔

دوسری بات جو حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اس
کے باوجود انہیں بھی مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے اور
انہیں بھی اپنے نفس کی طرف سے شورش پسندوں سے نبرد آزما
رہنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ انتباہ
فرما رہے ہیں کہ دور اور نزدیک کے سب لوگ اس کو رد کرنے
کی کوشش کریں گے لہذا اسے برابر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔
بہر حال موطا امام محمدؓ کی اس روایت سے یہ تو معلوم ہو گیا
کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ان کے خلاف مسلسل

سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ہمارے مؤرخین نے ان سازشوں کی کوئی تفصیل نہیں دی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت انتہائی کامیاب رہا تھا۔ ان کی کامرانیوں اور کامیابیوں کے سامنے ان سازشوں اور درپردہ ریشہ دوانیوں کی کوئی بڑی اہمیت نہیں تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جب تدوین و تصنیف کا دور آیا تو قلم اُن ہی مصنفین یعنی عجمیوں کے ہاتھ میں تھا جو خود ان سازشوں کے بانی مبنی تھے تو وہ اپنی پردہ درئی کیوں کرتے لیکن پھر بھی ہمیں ان کی تصانیف میں اس کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل خطبہ ملتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ :-

ثم انه بلغني ان قائلًا منكم يقول والله لو مات عمرؓ بايعت فلانًا فلا يغترون امرؤ ان يقول انما كانت بيعة ابي بكر فلتة وتمت الا وانما قد كانت كذا لله ولكن الله وقي شرها وليس منكم تقطع الاعناق اليه مثل ابي بكر - من بايع رجلا من غير مشورة من المسلمين فلا يتابع هو ولا الذي تابعه تغرة ان يقتلوا انه كان من خير ناحين توفي الله نبيه صلى الله عليه وسلم -

(صحیح بخاری ص ۹۳ مطبوعہ مطبعہ مجتہبی دہلی)

ترجمہ :- پھر مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ اگر عمر مر گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کروں گا۔ اور خبردار کوئی شخص اس فریب میں نہ رہے کہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت بھی یوں ہی (بغیر مشورہ کے) یکبارگی ہو گئی تھی اور اس کا انجام بخیر ہوا (لہذا بغیر مشورہ کے ہماری اس بیعت کا انجام بھی بخیر ہو جائے گا) بیشک ابو بکرؓ کی بیعت یکایک ہو گئی تھی۔ لیکن اللہ نے اس کے شر سے (سب کو) بچا لیا۔ لیکن تم میں کوئی اور ایسا نہیں ہے جس میں ابو بکرؓ جیسی فضیلت ہو۔ اب جس کسی شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کی بیعت کر لی تو اس کی اور اس کے متبع کی بیعت نہ کی جاسکے گی بلکہ اندیشہ ہے کہ دونوں ہی قتل کر دیئے جائیں۔ اور یقیناً ابو بکرؓ تو ہم سب سے بہتر تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا۔

یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو ان کے آخری حج کے موقعہ پر مئی میں دی گئی تھی۔ پلان یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو جائے تو یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی کی بیعت کر لی جائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت بھی یوں ہی یکبارگی ہو گئی تھی اور پھر امت نے اسے قبول کر ہی لیا تھا۔ ایسے ہی ہم اگر یکبارگی اپنی مرضی کے شخص سے بیعت کر لیں گے تو امت اسے بھی تسلیم کر لے گی۔ یہ سب خوارج تھے یعنی حکومتِ وقت کے مخالفین ہی تھے جو اس قسم کی پلاننگ

کر رہے تھے اور ان کی یہ پلاننگ مدینہ منورہ میں خوب مشہور تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ خدا نخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ لہذا یہی بہتر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی جیت ہی میں اس کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے بعد خلیفہ کون ہو گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں وہ خطبہ نقل کیا گیا ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے دیا تھا۔ حضرت سعدانؓ فرماتے ہیں:-

”وفات سے چند دن پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن خطبہ دیا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا: ”میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین کھونٹیں ماریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری موت قریب آگئی ہے۔ بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد کر دیجئے۔ (میں کہتا ہوں کہ) اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت اور اس چیز کو جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا (یعنی قرآن) منافع نہیں کرے گا۔ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک راضی رہے (یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ) اور میں سمجھتا ہوں کہ

بعض لوگ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارا ہے (یعنی ایرانی،
رومی اور خوارج) اس کام میں اسلام پر طعن کرتے ہیں۔ اگر
انہوں نے پھر ایسا کیا تو وہ اللہ کے دشمن اور گمراہ کافر ہیں۔“
(صحیح مسلم کتاب المساجد باب من اکل ثوماً من
معدان)

اپنی اسکیم کو رو بہ عمل لانے کے لئے یہ خوارج (باعنی) زیادہ
دیر تک صبر نہیں کر سکے چنانچہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبعی
وفات کا انتظار بھی نہیں کر سکے۔ انہوں نے حارسِ تیار کی کہ
حضرت عمرؓ کو قتل ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ ابو لؤلؤ فیروز ہرمزان
جفینہ اور کعب الاحبار وغیرہ نے مل کر حضرت عمرؓ کو راستہ
سے ہٹانے کی اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم میں جیسا کہ آپ دیکھ
رہے ہیں۔ ایرانی، رومی، یمنی یہودی اور منافقین شریک
تھے اور ایک دن نماز فجر میں حضرت عمرؓ پر ابو لؤلؤ فیروز نے
خنجر سے حملہ کر دیا۔ اسکیم تو یہی تھی کہ حضرت عمرؓ کو شہید کر کے
یکبارگی طود پر اپنی مرضی کے آدمی سے بیعت کر لی جائے۔ پھر سب
لوگ اس بیعت کو تسلیم کر ہی لیں گے۔ لیکن حضرت عمرؓ بہت
سخت جان ثابت ہوئے اور وہ حملے کے بعد تین دن تک زندہ
رہ گئے اور تمام معاملات حسن و خوبی کے ساتھ طے کر کے یکم محرم
کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (ایک اور روایت کے مطابق ان
کا یوم شہادت سات یا دس محرم ہے۔ ملاحظہ ہو ہیکل کی سوانح
عمرؓ)۔

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر اعلان فرمادیا تھا کہ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی۔ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک خوش رہے۔ (مسلم کی حدیث جو اوپر درج ہو چکی ہے) چنانچہ آپ نے اسی کے مطابق خلافت کے فیصلے کے لئے انہی چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنادی جو تین دن تک باہم فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون خلیفہ ہوگا اور جس پر اتفاق ہو جائے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ چنانچہ ان چھ حضرات کی کمیٹی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ کیا اور ان کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کر لی گئی۔ اور خوارج نے جو اسکیم بنائی تھی وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

خوارج عثمان ذوالنورین | لیکن خوارج (باغیوں) کا یہ ٹولہ اپنی سازشوں

میں برابر مصروف رہا اور وہی ٹیکنیک انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پھر استعمال کی جو وہ حضرت عمرؓ کے خلاف استعمال کر کے ناکام رہے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انہیں اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے میں بارہ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اور اس مرتبہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یعنی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے یکبارگی طود پر اپنی مرضی کے آدمی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن

ان کی یہ کامیابی دیر پا ثابت نہ ہو سکی اور اکابر صحابہ نے اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار فرمایا جس کے نتیجہ میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے حوادث فاجعہ پیش آئے۔ اس طرح خوارج (باغیوں) کی وہ سازش طشت از بام ہو گئی جو وہ عرصہ دراز سے زیر زمین تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی کا خلیفہ تو منتخب کر لیا۔ لیکن جب یہ خود پسند کردہ خلیفہ بھی ان کے اشارہ پر چلا تو بالآخر اسے بھی شہید کر دیا۔

خوارج کون تھے؟ جیسا کہ آپ صفات گذشتہ میں ملاحظہ فرماتے آ رہے ہیں یہ خوارج دو اصل

وہ منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن درپردہ وہ اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سرفہرست یہودی تھے، کچھ ایرانی اور رومی تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ عرب بھی تھے اور عربوں میں اکثریت قبیلہ بنو تمیم کے افراد کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے عہد رسالت مآب میں خوارج کی ابتداء بتاتے ہوئے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی تھی جس میں عبداللہ ذوالخوئصرہ تمیمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اموال غنیمت کی تقسیم میں انصاف نہ فرمانے کا الزام لگایا تھا۔ یہ عبداللہ ذوالخوئصرہ بھی قبیلہ بنو تمیم ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

خوارج حضرت علی اس کے بعد بھی قبیلہ بنو تمیم ہی کے لوگ ہی خوارج میں کثرت سے

شامل تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں جنگ صفین کے بعد جو خوارج سامنے آئے ان میں بھی اسی قبیلہ کی اکثریت ملتی ہے۔

پروفیسر احمد امین مصری خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وبعد جدالی وتروء قبل علی التحکیم، واختار معاویة عمرو بن العاص یمثلہ، واختار اصحاب علی ایما موسیٰ الاشعری، اخذوا من قریب من جنود علی اکثرهم من قبيلة تمیم نفروا من ان یحکم احد فی کتاب اللہ، وادوا ان التحکیم خطأ لان حکما اللہ فی الامر واضح جلی۔ (نہج الاسلام ص ۱۵۶ مطبوعہ مصر)

ترجمہ:- باہمی بحث و تروء کے بعد حضرت علیؑ نے تحکیم کو قبول کر لیا اور حضرت معاویہؓ نے اپنی نمائندگی کے لئے حضرت عمرو بن العاصؓ کو منتخب کیا اور اصحاب علیؑ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو منتخب کیا، اس وقت حضرت علیؑ کے لشکر میں سے ایک جماعت ظاہر ہوئی جن کی اکثریت قبیلہ بنو تمیم سے تھی۔ وہ اس بات سے بد کے کہ کوئی شخص کتاب اللہ میں حکم بنایا جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ تحکیم غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس معاملہ میں بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

نیز پروفیسر احمد امین مصری دوسری جگہ لکھتے ہیں:-
 ولقد كان اكثر من اعتنق المذهب الخارجي
 في اول الامر عربيا سكنوا البصرة والكوفة
 بعد فتوح عمر، وكان تغلب على اكثرهم
 البداوة، وكان كثير منهم من بني تميم
 ثم رأينا ان بعض الموالى دخل في عقيدتهم
 ولعل السبب في دخولهم انهم اشتروا
 مع الخوارج في بغض الامويين واعتقادهم
 بعدم صلاحيتهم، ووجوب الخروج عليهم
 حتى تزول دولتهم۔

(فتح الاسلام ص ۳۳۳ مطبوعہ مصر)

ترجمہ: شروع میں حضرت عمرؓ کی فتوحات کے بعد
 جن لوگوں نے خارجی مذہب کا قلابہ اپنی گردن میں
 ڈالا وہ بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان
 میں سے اکثر پر بدوی بن غالب تھا اور ان میں سے
 زیادہ تر بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ہم
 دیکھتے ہیں کہ بعض موالی (ایرانی اور رومی آزاد کردہ
 غلام) بھی ان کے عقیدے میں داخل ہو گئے۔ اور غالباً
 ان کے داخلے کا سبب خوارج کے ساتھ بنو امیہ سے
 بغض میں اشتراک تھا اور بنو امیہ کے خلافت کے حق دار
 نہ ہونے کا اعتقاد تھا۔ اور یہ عقیدہ بھی کہ جب تک ان

کی حکومت بالکل ختم نہ ہو جائے ان کے خلاف خروج

واجب ہے۔

پروفیسر احمد امین مصری نے بتایا ہے کہ خارجی فرقے میں ایرانی اور رومی موالی کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کے دیہاتی لوگ بھی شامل تھے جن کا تعلق قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔ عرب قبائل کے دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ لیکن اکثریت بنو تمیم ہی کی تھی۔

جنگ جمل میں بھی جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف بھرپور جنگ میں حصہ لیا تھا ان میں بھی ہمیں قبیلہ بنو تمیم کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں اس قبیلے کے لوگ اس کثرت سے شامل تھے کہ صرف ایک قبیلہ کے مقتولین کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔

(الافغانی ص ۱۴۴)

یعنی ایک طرف صدیق اکبرؓ کے عہد میں فتنہ ارتداد میں بنو تمیم پیش پیش تھے۔ پھر قاتلین عثمانؓ میں بنو تمیم کی اکثریت تھی اسی لئے قصاص عثمانؓ کا علم بلند کرنے والوں (یعنی حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے مقابلے کے لئے جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اسی بنو تمیم کے قبیلے کی اکثریت تھی کہ صرف ان کے پانچ سو آدمی جنگ جمل میں کام آئے اور دوسری طرف تحکیم کے

بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف احتجاج کر کے ان سے الگ ہو جانے والوں میں بھی اکثریت انہی بنو تمیم کی تھی۔

پھر کربلا کے مقام پر حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں میں بھی یہی بنو تمیم کے لوگ پیش پیش تھے چنانچہ جناب عمر کھالہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

وَقَعْدُ تَمِيمٍ مِنَ الْقِبَائِلِ الَّتِي قَاتَلَتْ الْحُسَيْنِ
وَشِيعَتَهُ فَجَاءَتْ بِسَبْعَةِ عَشْرَ أَسْوَاقٍ مِنْهُمْ.

(معجم قبائل العرب مطبوعہ دار العلم للملاہم بیروت ص ۱۳۱)

ترجمہ: اور بنو تمیم کا شمار ان قبائل میں کیا جاتا ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے شیعوں سے جنگ کی۔ چنانچہ جنگ کے بعد بنو تمیم قبیلے کے افراد حسینی قافلے کے سترہ سرلائے گئے۔

قبائل کے علاوہ نمایاں شخصیتوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے کہ حواریہ و مدد میں پیش پیش تھے وہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بھی آگے نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاتلین حضرت حبیہ رضی اللہ عنہ میں ایک شخصیت شبث بن ربعی بہت مشہور ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

أَذْنُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُصِغْ بِهِ
كَانَ مُؤَذِّنَ سَجَاحٍ ثُمَّ قَاتَبَ وَأَسْلَمَ وَكَانَ

یُبغض عثمانٌ ویوابی علیاً۔ ثم صار خارجیا
وقاتل الحسینؑ بکربلا۔

(الاصابة فی اسماء الصحابة لابن حجر عسقلانی ص ۱۶۲ طبع مصر)

ترجمہ :- شید بن ربیع نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کا زمانہ پایا تھا مگر شرفِ صحبت حاصل نہیں کر سکا۔ وہ سجاح

(مذبحہ نبوت) کا مؤذن تھا۔ پھر اس نے توبہ کی اور مسلمان

ہو گیا۔ وہ حضرت عثمانؓ سے بغض رکھتا تھا اور حضرت علیؓ

سے محوالات رکھتا تھا۔ پھر حضرت علیؓ کا بھی مخالف ہو کر

خارجی بن گیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کربلا میں

نبرد آزما ہوا۔

ایسے ہی بے شمار لوگ ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ

ہمارے مؤرخین نے کر دیا ہے اور بہت سوں کو نظر انداز کر دیا

ہے۔

بہر حال یہ سب خوارج یعنی حکومت وقت کے خلاف مسلح

بغاوت اور خروج کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے

اپنے عہد کی حکومتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ سربراہان

مملکت کو قتل اور شہید کیا اور ان کی حکومتوں کا تختہ الٹا۔

یہ سب منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن

بہ باطن کافر تھے۔ ان میں سے جو لوگ اپنے ذاتی مفادات حاصل

کرنے کے لئے بظاہر اسلام لے آئے تھے یا اسلامی حکومت

میں کفر کی وجہ سے انہیں جو نقصانات پہنچ سکتے تھے ان سے اپنے

آپ کو محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا وہ مسلمانوں کی تاریخ میں منافقین کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے کچھ طاقت حاصل کرنے کے بعد مسلمان حکومتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اسلامی مملکت کے خلاف خروج کیا وہ خوارج کے لقب سے یاد کئے گئے۔ لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ سب منافق ہیں جن کے لئے حضور اکرم جلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ
وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! کفار اور منافقین سے
جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

آج بھی ایسے خفیہ منافقوں اور کھل کر سامنے آ جانے والے
باغیوں سے جہاد فرض ہے اور انہیں کیفر کردار کو پہنچانا اُمتِ
مسلمہ کا فریضہ ہے۔

(کتاب التعزیر)

تعزیر فقہاء کی اصطلاح میں وہ سزائیں کہلاتی ہیں جو قرآن کریم سے ثابت نہیں ہیں بلکہ امام یا قاضی اپنی صوابدید سے مختلف جرائم میں جاری کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے چند انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں مقرر کر دی ہیں۔ اور باقی جرائم کو مسلمانوں کی اجتماعی راستے پر چھوڑ دیا ہے۔ جرائم چار طرح کے ہیں۔ دوسرے کی عزت سے کھیلنا۔ دوسرے کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ کسی کے مال پر حملہ کرنا۔ کسی کی جان لینے کی کوشش کرنا۔ ان میں انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں۔ قتل کرنے کی سزا، خون کے بدلے خون۔ یعنی قصاص۔ اعضاء کو ناکارہ کر دینا یا ٹکڑ ڈالنا تو وہاں بھی قصاص لازم ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان، ہاتھ کے بدلے ہاتھ علیٰ ہذا القیاس۔

(۲) کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی سے زنا کرنا اس کی سزا سٹو کوڑے مارنا۔

(۳) کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا یعنی زنا کی تہمت لگانا اس کی

سزا اسٹی کوڑے مارنا۔

(۴) کسی کا مال چرانا اس کی سزا کاٹ دینا۔ لیکن ایسے جرائم بے شمار ہیں جو انہی کے ذیل میں آتے ہیں لیکن ان انتہاؤں کو نہیں پہنچتے مثلاً کسی کو مارنا اور ضرب پہنچانا جس میں کوئی انسانی عضو بیکار نہیں ہوتا، ضائع نہیں ہوتا یا کسی سے زنا تو نہیں کیا مگر کسی کا بوسہ لے لیا ہے۔ کسی سے چھڑ چھاڑ کی ہے۔ اس پر آوازے کسے ہیں۔ کسی پر زنا کی تہمت تو نہیں لگائی لیکن کوئی دوسری تہمت لگائی ہے۔ کسی کا مال تو نہیں چرایا مگر کوئی ایسی تدبیر کی ہے کہ اس کے مال پر ناجائز قبضہ ہو جائے۔ تو ایسی صورتوں میں نیز ایسی صورتوں میں بھی جو ان جرائم کے ذیل میں نہیں آتے لیکن وہ جرم ہیں مثلاً بھنگ، افیون، چرس وغیرہ فروخت کرنا تو اس صورت میں ایسے مجرموں کو سزا دینا ضروری ہے تاکہ ان جرائم کا سد باب ہو سکے۔ لیکن ان جرائم کی قرآن کریم نے کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی ہے تو امام یا قاضی ایسے مجرموں کو اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے گا۔ ایسی سزاؤں کو تعزیر کہتے ہیں۔ مثلاً سورہ نسا میں ہے۔

وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّكَ الْفَاحِشَةُ مِنْ نِسَائِكَ فَامْسِكْهُنَّ
عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكَ ۖ فَإِنْ شِئْتَ فَامْسِكُوهُنَّ
فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّيَنَّ الْمَوْتَ أَوْ يَبْعَدَنَّ اللَّهُ
لَهُنَّ سَبِيلًا ۝ وَالَّذِينَ يَأْتِيَنَّهَا مِنْكُمْ فَادْمَعُوا
فِي أَنْفُسِكُمْ وَأَصْلَحُوا فَأَعْلُو عَنْهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ۝

(۴-۱۳)

ترجمہ :- اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی

کی مرتکب ہوں تو ان پر تم اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔ پس اگر چار گواہ گواہی دیدیں تو انہیں گھروں میں روکے رکھو حتیٰ کہ انہیں موت ہی آجائے یا خدا ان کے لئے کوئی سبیل نکال دے۔ اور جو مرد اور عورت تم میں سے اس بے حیائی کے مرتکب ہوں تو ان کو ستاؤ۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کرو۔ یقیناً اللہ بھی توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ان آیات میں الفلحشة (بے حیائی) سے مراد ایسے ہی جرائم ہیں جو دنیا کی حد تک تو نہیں پہنچتے البتہ زنا کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ یعنی کسی عورت کا بوسہ لے لینا، اس کی چھاتیوں کو چھونا اور لمس کرنا اس سے گندی باتیں کرنا۔ اسے چھیڑنا۔ اس پر آواز دے کنا تو ایسے جرائم کے لئے قرآن کریم نے ایذا رسانی کا حکم دیا ہے۔ اس ایذا رسانی کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ یہی حال دوسرے اُن تمام جرائم کا بھی ہے جو قرآن کہ رو سے جرم ہیں۔ لیکن قرآن نے ان کی کوئی سزا مقرر نہیں کی تو حکومت وقت ایسے تمام جرائم کی تعزیرات مقرر کر سکتی ہے۔ اور اگر حکومت مقرر نہ کرے تو امام یا قاضی اپنی صوابدید کے مطابق مناسب سزا دے سکتا ہے البتہ یہ سزائیں قرآنی حدود سے عام حالات میں تجاوز نہ کرنی چاہئیں۔ چنانچہ فقہاء نے کہا ہے کہ تعزیر میں کم سے کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس ^{۳۹} کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کے لئے قذف کی مشروع حد چالیس ^{۴۰} کوڑے ہے۔ لہذا اس سے ایک کم انتالیس ^{۳۹} کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ امام

ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اصل حد احرار کے متعلق اشیٰ کوڑے سے لہذا اس سے کم پچھتر کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اُن اشیٰ کوڑے مارنے چاہئیں۔ امام ابو یوسفؒ سے بھی ایک روایت امام زفرؒ کے مطابق ہے۔ کم سے کم تین کوڑے اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اس سے کم میں کوئی مقصد ہی حاصل نہیں ہوتا۔ اگر امام چاہے تو کوڑوں کے ساتھ قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ حکومتِ وقت اہل حل و عقد (پالیمینٹ کے ممبران) کی رائے سے مختلف جرائم کے لئے ان کی نوعیت کے پیش نظر جرائم کی شدت و خفت کو مد نظر رکھتے ہوئے نیز مملکت کے حالات و قوانین کے پیش نظر سزائیں مقرر کر دے اور ان کے لئے ایک ضابطہ تعینات مدون کرے تاکہ پوری مملکت میں سزائیں دینے میں یکسانیت پیدا ہو سکے۔

(شراب کی تعزیر)

شراب خوری کی نزایان کرنے سے پہلے چند امور پر بحث کر لینا ضروری ہے۔ پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کی رو سے خَمْرُ یعنی شراب کیا ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم نے شراب کے متعلق کیا حکم صادر فرمایا ہے اور کیا قرآن کریم نے اس کی کوئی حد مقرر فرمائی ہے۔ اگر کی ہے تو وہ کیا ہے۔

قرآن کریم نے شراب کے لئے خَمْرُ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ شراب کے متعلق ہمیں قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ملتی ہیں۔

سب سے پہلے آیت سورہ بقرہ کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا
إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ لِنَاسٍ ذُرِّيَّتِهِمَا
كَبُورٌ (۲/۲۱۹)

ترجمہ: اور اے پیغمبر! سلام! لوگ آپ سے شراب

اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ انہیں

بتادیتے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے

ان میں کچھ منفعتیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے زیادہ بڑا ہے۔

دوسری آیت سورۃ نسا میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔
لَا تَقْرَءُوا الصَّلَاةَ وَآنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا
مَا تَقُولُونَ۔ (۲۳)

ترجمہ۔ نماز کے قریب بھی نہ جاؤ دریاں حالیکہ تم
مہوش ہوتا آنکہ تم سمجھ سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

تیسری آیت سورۃ مائدہ کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْمُونُ
الْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّمَّنْ عَمِلَ الشَّيْطَانُ
فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ
أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ
وَالْمَيْمُونِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ
فَهَلْ أَنتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا
الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا
إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ۝ (۲۴)

ترجمہ۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! بات یہی ہے کہ
شراب، جوا، بت اور پانسے سب گندی چیزیں اور شیطانی
کام ہیں لہذا ان سے بچو، توقع ہے کہ (اس طرح) تم فلاح
پا جاؤ گے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں
شراب اور جوائے کے ذریعہ بغض اور عداوت کا بیج بوسے

اور تمہیں خدا کی یاد سے یعنی نماز سے روک دے تو کیا تم ان چیزوں سے باز آ رہے ہو؟ (یا نہیں)۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ڈرتے رہو۔ تو اگر تم نے اطاعت سے منہ موڑا تو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف وضاحت سے پہنچا دینا ہے۔

۱۔ آیات کریمہ میں بنیادی لفظ خَمْرُ ہے جس سے خمر، خمریہ، خمریہ لگتی ہے۔ لہذا خَمْرُ کے لفظ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ خَمْرُ کے معنی کسی چیز کو ڈھانپ دینے اور چھپا دینے کے ہوتے ہیں۔ خَمْرُ الشَّيْءِ يَخْمُرُهُ اس کو چھپا دیا ڈھانپ دینا۔ خَمْرُ فَلَانٍ الشَّهَادَةَ۔ فلاں نے گواہی کو چھپا دیا۔ الخَمْرُ ہر نشہ آور چیز کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے کہ الخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ یعنی خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں فتور اور اضمحلال پیدا کر دے۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ لَا تَخْمُرُ الْعَقْلَ یعنی شراب کو خَمْرُ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ عرب عام طور پر شیرۃ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اور اسے خَمْرُ کہتے تھے ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی خَمْرُ کہتے ہیں۔ تَخْمِيرُ کے معنی غیبی اٹھانے کے ہیں۔

شراب کا حکم | تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ شراب جو شیرۃ انگور سے تیار کی جائے وہ مطلقاً حرام

ہے۔ خواہ حقوڑی پی جائے یا بہت پی جائے۔ اس سے نشہ کی کیفیت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وہ ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جو شراب شیرۃ انگور کے علاوہ دوسری چیزوں سے بنائی جائے مثلاً شہد، گیہوں، جو، چاول، کھجور وغیرہ سے تیار کی جائے اس کے متعلق جمہور محدثین اور فقہائے حجاز تو اس کے قائل ہیں کہ شراب کسی چیز سے بھی بنائی جائے وہ حرام ہے، حقوڑی سی بھی جس سے نشہ نہ ہو حرام ہے اور زیادہ بھی جس سے نشہ ہو جائے۔ شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ لیکن فقہائے عراق مثلاً نخعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ، شریک، ابن شبریمہ امام ابو حنیفہ اور تمام فقہائے کوفہ اور اکثر فقہائے یمن اس کے قائل ہیں کہ شیرۃ انگور کے علاوہ دوسری شرابیں صرف نشہ کی صورت میں حرام ہیں۔ اگر حقوڑی سی چکھی جائیں کہ ان سے نشہ نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہیں۔ البتہ اگر اتنی پی لی جائیں کہ ان سے نشہ ہو جائے تو وہ حرام ہیں۔ عرب کے لوگ چونکہ شیرۃ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اور اسی کو خَمْرُ کہتے تھے اور قرآن کریم نے خَمْرُ کو حرام قرار دیا ہے اس لئے اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ شیرۃ انگور سے جو شراب تیار کی جائے اس کے پینے سے نشہ ہو یا نہ ہو، حقوڑی سی چکھی جائے یا بہت پی جائے ہر حالت میں حرام ہے۔

فقہائے عراق فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کی حرمت کے ساتھ ساتھ اس کی علت بھی بتادی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ خمر اور

میسرہ کے ذریعہ شیطان تمہارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دینا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ذکر الہی یعنی صلوٰۃ سے روک دے تو کیا تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ باہمی بغض اور عداوت ڈال دینا نیز ذکر الہی یعنی صلوٰۃ سے روک دینا اسی وقت ممکن ہے جب نشہ ہو جائے۔ اگر تھوڑی سی شراب چکھ لی جائے جس سے نشہ نہ ہو تو یہ کیفیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ لہذا وہ قرآن کی رو سے مکتوح بھی نہیں ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ دلیل کی رو سے فقہائے عراق کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص تھوڑی شراب پیتا ہے جس سے نشہ نہ ہو اس کے متعلق یہ اندیشہ موجود ہے کہ تھوڑی شراب پیتے پیتے وہ بالآخر زیادہ شراب بھی پینے لگے گا۔ لہذا احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا جائے۔ البتہ بعض دوائیں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کی تیاری میں الکوحل شامل کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ خراب نہ ہو جائیں مثلاً بعض شربت الکوحل کے بغیر تیار نہیں ہو سکتے یا ہو میو پتیٹھک دوائیں جو الکوحل ہی میں تیار کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ قطرات کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں اور ان سے نشہ وغیرہ کا احتمال نہیں ہوتا ان کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

کیا شراب حرام ہے | آج کل بعض حضرات کی طرف سے عجیب و غریب سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ قرآن کیا

نے شراب کو حرام نہیں کہا۔ قرآن کریم نے تو صرف چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ
وَمَا أُهْلَ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ط (۲۴)

ترجمہ: اللہ نے تو تم پر صرف مُردار، تازہ خون، مود کا گوشت اور حین جانوروں پر ذبح کئے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جاتے (ان کا گوشت) حرام قرار دیا ہے۔

تو شراب کو حرام کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام میں حرام کے معنی کیا ہیں؟ اس کا مادہ اشتقاق حُرْمٌ ہے جس کے بنیادی معنی کسی چیز سے شدت کے ساتھ روک دینے اور ممانعت کر دینے کے ہیں (ابن فارس) الْحَرَامُ تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کر دی گئی ہو۔ جن کے کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ یہ الْحَلَالُ کی ضد ہے جس کے معنی ہیں۔

رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کر دینا۔ أَحْرَمَ الْحَاجُّ حَاجًی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک چیزیں ممنوع ہو گئیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا۔ اسی کو حالتِ احرام کہتے ہیں (کتاب الحج میں بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے) لہذا ”حرام“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے شدت کے ساتھ روک دیا گیا اور ممانعت کر دی گئی ہو۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں وہ چیزیں جو کتابِ الہی کی رو سے ممنوع ہوں حرام کہلاتی ہیں اور جو اخبارِ آحاد یعنی احادیث کی رو سے ممنوع ہوں وہ ناپسندیدہ اور مکروہ کہلاتی ہیں۔ اس کے

برعکس جو چیزیں کتاب الہی کی رو سے مامور بہا ہوں وہ فرض کہلاتی ہیں اور جو چیزیں اخبارِ آحاد یعنی احادیث کی رو سے مامور بہا ہوں وہ واجب یا سنت کہلاتی ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ آیاتِ محولہ بالا میں شراب سے شدت کے ساتھ روکا اور منع کیا گیا ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ چکے ہیں کہ شراب کو قرآن کریم رَجَسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ گندی چیز اور شیطانِ کلام فرمانے کے ساتھ ساتھ فَاجْتَنِبُوْهُ (لہذا اس سے بچو، اس سے الگ رہو) کے حکم کے ساتھ آگے پھر مزید تاکید فرماتے کہ لَنْ يَجْعَلَ لَكَ مِنْهُ فَهْلٌ اَنْتُمْ مُّتَنَبِّهُونَ (پھر تم اس سے باز رہنا چاہئے) کی تہدید بھی فرمائی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں ممانعت ہیں یا اجازت ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ممانعت ہی ہے اور بڑی ہی سخت قسم کی ممانعت ہے۔ جو چار چیزیں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (خُلائے تو تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں) کے لفظ سے بیان فرمائی ہیں۔ اس قدر شدت کے ساتھ ممانعت تو ان کی بھی نہیں فرمائی گئی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کسی چیز کی ممانعت شدت کے ساتھ کی جائے تو اسی کو حرام کہتے ہیں۔ حرام اُسی کو نہیں کہتے جسے حرام کے لفظ سے بیان کیا جائے۔ فقہاء کرام کی اصطلاح کے مطابق بھی، چونکہ شراب کی ممانعت کتاب الہی سے ثابت ہے اس لئے فقہی اصطلاح میں بھی اس کو حرام ہی کہا جائے گا لہذا حَرَّمَ کے لفظ پر اصرار کرنا بے معنی بات ہے۔ تاہم چونکہ عام طور پر لوگ حرام کے لفظ پر ہی مقتصد ہیں اس لئے ان کی تسلی کے لئے عرض ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں

سورۃ اعراف میں یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي
يَجِدُهُ ذَنْبُهُ مَكَتُوبًا عِنْدَهُ هُمْ فِي التَّوْرَةِ وَ
الْإِنْجِيلِ ذِي أُمِّهِمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (١٥٤)

ترجمہ۔ جو رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جو

اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جو انہیں

دستور کے مطابق اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں

سے روکتا ہے اور سب پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال

کرتا ہے اور سب ناپاک چیزوں کو ان کے لئے حرام کرتا

ہے اور ان سے ان کے اس بوجھ اور ان بیڑیوں کو اتار

دیتا ہے جو ان پر پڑی ہوئی تھیں۔

اس آیت کریمہ کے ساتھ سورۃ مائدہ کی اس آیت کریمہ کو

ملا لیجئے جس میں شراب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ گندی چیز ہے

شیطانی عمل ہے۔ اس سے بچو۔ پھر تم اس سے باز رہتے ہو یا نہیں؟

اب سوال یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی ان تصریحات کی روشنی میں شراب

کو طیبات (پاکیزہ چیزوں) کی فہرست میں شامل کیا جائے گا یا

خبائث (ناپاک چیزوں) کی فہرست میں؟ اگر شراب ناپاک

چیزوں کی فہرست میں شامل ہے، اور یقیناً ہے، تو سورۃ اعراف کی

اس آیت کی رسم سے وہ حرام بھی ہے۔ یہاں یحییٰ مر علیہ السلام (وہ ان پر حرام کرتا ہے) کا لفظ موجود ہے جو ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے کافی ہے جو قرآن کریم سے حرام ہی کا لفظ سننا چاہتے ہیں۔

شراب نوشی پر حد | تیسرا سوال یہ تھا کہ کیا قرآن کریم نے شراب نوشی کے لئے کوئی حد (سزا) مقرر فرمائی ہے اسی کا مختصراً جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالیٰ نے اس کی کوئی حد (سزا) مقرر نہیں فرمائی۔ قرآن کریم میں اس کی کوئی سزا بیان نہیں ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی کوئی متعین سزا مقرر نہیں فرمائی۔ چنانچہ بخاری و مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ:

عن أبي بن كعب عن النبي صلى الله عليه وسلم اني برجل قد شرب الخمر فخلد، بجوید نحو اربعين وفعله ابو بكر فلما كان عمرو استشار الناس فقال عبد الرحمن اخف الجدة ثمانون فامر به عمرو ترجمہ :- یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جس نے شراب پی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھجور کی چھڑی سے کوئی چالیس مرتبیں لگوائیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے بھی یہی سزا دی لیکن جب دور فاروقی آیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا۔

عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا کہ حد کی سب سے کم مقدار
اشی کوڑے ہیں رہتہا زنا لگانے والے کے لئے چنانچہ
حضرت عمرؓ نے اسی کو نافذ کر دیا۔

امام مالکؒ کی روایت میں جو ثور بن زید سے مروی ہے
ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی اشی کوڑے ہی کی تائید فرمائی تھی
اور وہ یہ بتائی تھی کہ :

فانه اذا شرب سكر واذا سكر هذى واذا
هذى افترى فجده عمر ثمانين ۔

ترجمہ : یعنی جو شراب پئے گا ہر مست ہوگا ، ہر مست
ہوگا بکواس کرے گا ، جو بکواس کرے گا وہ ہتھان پڑے گا
بھی کرے گا۔ لہذا حضرت عمرؓ نے قذف کی حد ہی قائم
کر دی۔

لیکن مسلم اور ابوداؤد میں حصین بن منذرؓ سے روایت
ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ولید کو صرف چالیس کوڑے لگوائے تھے
اور فرمایا تھا کہ :

جلد النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ابوبکر ابین
وعمر ثمانین و کل سنة و هذا احب الی ۔

ترجمہ : یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ابوبکرؓ
نے چالیس کوڑے لگوائے تھے اور عمرؓ نے اشی کوڑے
لگوائے۔ دونوں ہی سنت ہیں۔ مگر مجھے چالیس ہی پسند
ہیں۔

بخاری اور ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شرابی کی سزا کے سلسلہ میں صحابہ سے فرمایا اضربوه (اسے مارو) اس کے بعد

فمننا المضارب بیده ومننا الضارب بنعله ومننا الضارب بشوبہ ثم قال لنا بکتوفه فاقبلنا علیہ نقول اما اتقیت اللہ؟ اما خشیت اللہ؟ اما استحيیت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

موجہ۔ تو ہم میں سے کسی نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا اور کسی نے اپنے جوتے سے مارا، کسی نے اسے اپنے کپڑے (کا کھڑبنا کر اس) سے مارا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا، اسے شرمندہ کرو، تو ہم نے کہنا شروع کیا کہ تو اللہ سے نہیں ڈرتا، تجھے خوفِ الہی نہیں ہے، تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آتی؟

ان تمام روایتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ میغوری کی کوئی تعزیر (سزا) مقرر نہیں ہے۔ ہر ذور میں یہ سزا مناسب ترمیم قبول کر سکتی ہے۔ مطلب تو عادت چھڑانے سے ہے۔ سزا کی کسی مقدار کو باقی رکھنے سے نہیں ہے۔ کسی سوسائٹی میں کم سے کم سزا مؤثر ہو سکتی ہے تو وہ بھی دی جاسکتی ہے اور اگر انشی کوڑوں سے بھی کام نہ چلے تو زیادہ میں بھی کوئی شرعی قباحیت

نہیں ہے۔ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔

تعزیر کا مقصد | یہاں ایک نکتہ پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ میخواری کی سزا اگر اشی درے ہی مان لی جائے تو اس کا مقصد پھر بھی مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے عہد نبوی نیز خلافت راشدہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی شرابی کو سزا دیتے دیتے اس کی جان لے لی گئی ہو۔ یہی صورت تہمت نہا کی حد میں بھی ہے لہذا یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ زنا کی حد میں بھی صرف بیس کوڑوں کا اٹھاؤ کر کے زانی کو سو درے لگانے کی غرض بھی اسے جان سے مار ڈالنا نہیں ہے جان صرف اس صورت میں لی جاسکتی ہے جب جرم کی نوعیت اپنی سنگینی کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرتی ہو۔ اس وقت جان سے مار ڈالنا کچھ زنا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر اس جرم پر مزائے موت دی جاسکتی ہے جو اپنی سنگینی کی وجہ سے سبوتاژ کی حد تک پہنچتا ہو۔

نسائی اور ابو داؤد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ :

ایک انصاری اس قدر بیمار تھے کہ ہڈی چھڑا ایک ہو گیا تھا اسی دوران ایک عورت کو دیکھ کر ولولہ شباب عود کر آیا اور وہ حد شرعی کے مستحق ہو گئے۔ اس کے بعد جذبہ ایمانی کے تقاضے ابھرے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگوں کو بھیج کر اپنے لئے حکم دریافت کرایا۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

گھس گیا اور وہاں جا کر حضرت عباسؓ سے چمٹ گیا۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے اور فرمایا کہ کیا واقعی اس نے یہ حرکت کی؟ لیکن اسے کسی سزا کا حکم نہیں دیا۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں حضرت ابو محجن ثقفیؓ کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ:-

قادیسیہ کا میدان جنگ گرم ہے۔ ابو محجن کو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے شراب نوشی کے جرم میں قید کر رکھا ہے۔ قید خانہ کے دیکھے سے جھانک کر ابو محجن نظارۃ جنگ دیکھ رہے ہیں اور جذبۂ جہاد اندر سے بے چین کر رہا ہے۔ ابو محجن سعد کی بیوی سلمہ سے التجا کرتے ہیں کہ میری بیڑیاں کھول دو، اگر میں زندہ رہ گیا تو واپس آ کر خود ہی بیڑیاں پہن لوں گا۔ انہوں نے انکار کیا لیکن بار بار کے اصرار سے انہوں نے بیڑیاں کھول دیں۔ ابو محجن نے حضرت سعدؓ ہی کا گھوڑا لے کر نیزہ بازی کے وہ وہ جوہر دکھا کر دشمن کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور پھر واپس آ کر خود ہی بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے کارنامے معلوم ہوئے تو انہیں بغیر کسی تعزیر کے رہا فرما دیا اور کہا کہ: ”بجدا میں ایسے شخص کو شراب نوشی کی سزا نہیں دے سکتا جو اہل اسلام کی حمایت اور جاں نثاری کے نشہ سے اتنا سرشار ہو۔ ابو محجن بھی غیرت و حمیت کا پتلا تھا۔ اس نے بھی قسم کھالی کہ آج سے شراب نہیں چکھوں گا۔“ (کتاب الخراج لابن یوسف)

حضرت سعد بن ابی وقاص عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہیں اور سنت رسول کی اطاعت و محبت میں ماوشما کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے طرز عمل نے یہ بتا دیا کہ شراب نوشی کی کوئی تعزیر اور سزا مخصوص نہیں۔ اگر ہوتی تو وہ چالیس یا اسی کوڑے مارتے اور ابو بکر کو قید میں نہ ڈالتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ موقع جہاد کا تھا۔ جہاں تعزیرات و حدود کا قانون عام حالات سے مختلف ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہاں حدود بھی ساقط ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ تعزیرات و حدود ازیں نہ فہوائے ان الحسنات یدہبن السیات (نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں) ایریا قاضی کو اختیار ہے کہ اعلیٰ کارگزاری کے عوض تعزیر کو معاف کر دے۔

میغوری اگرچہ ام النجاشی ہے لیکن بفہوائے:

وَاتَّخِذْهُمَا اكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا۔ (۲۱۹)

ترجمہ: اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔

اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیسز بگو

علامہ صبحی محسانی نے ہدایۃ المجتہد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

وَكُلُّ لَاحٍ مَاجُوزَةٍ لِبَعْضِ الْفُقَهَاءِ مِنْ شُرْبِ الْخَمْرِ

للشہادۃ۔ (فلسفۃ التشریح الاسلامی)

ترجمہ: اور اسی رخصت دینے کے ذیل میں یہ چیز بھی

آتی ہے کہ بعض فقہاء نے دوا کے طور پر شراب کے استعمال کو جائز کہا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں کو اونٹوں کے ابلان و ابوال بطور علاج کے استعمال کو جائز فرمایا تھا حالانکہ بول حرام بھی ہے اور نجس بھی۔

الغرض میخواری چوں کہ اپنے اندر ایک روشن پہلو بھی رکھتی ہے اس لئے اس کی تعزیر میں بھی زیادہ شدت نہیں ہے۔ اور صرف اسی ایک جرم کی وجہ سے کسی کی دوسری خوبیاں خاک میں نہیں ملائی جاسکتیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عبداللہ نامی (الملقب بہ حمار) ایک صحابی تھے جو اپنی خوش کلامی اور بذلہ بھی سے حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی کبھی کبھی ہنسایا کرتے تھے۔ انہیں کئی بار شراب نوشی کے جرم میں تعزیر کی گئی۔ مگر ضرر چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ایک بار پھر اسی جرم میں ماخوذ ہوئے اور سزا دی گئی۔ بعض صحابہ کی زبان سے نکل گیا اللھم العنہ ما اکثرا ما یؤتی بہ (اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ بار بار یہ اسی جرم میں ماخوذ ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن لیا تو فرمایا۔

لا تلعنوه فواللہ ما علمت الا انہ یحب اللہ

ودسولہ۔ (بخاری عن عمر بن الخطاب)

ترجمہ ہے اس پر لعنت نہ کرو، بخدا میں تو یہی جانتا

ہوں کہ یہ (ہاوجود سترابی ہونے کے) اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہی رکھتا ہے۔

یہ حدیث بڑی معنی خیز ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ صرف اسی ایک بھائی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی میں ایک بھائی کے ساتھ ایسی دس خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں جو دوسروں میں موجود نہ ہوں۔ اگرچہ وہ اس بھائی سے پاک علیحدہ اعمال و اوقات اس قسم کے مجرم وہ کام کر جاتے ہیں جو بے گناہ مقبول سے نہیں ہوتے۔ کسی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ اس کے اپنے برے سب کاموں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے آپ کو زندگی میں بیسیوں سابقے ایسے ہوتے ہوں گے کہ ایک فاسق نے مظلوم کی حمایت میں اپنی جان لڑا دی اور متقی خاموش بیٹھ رہے۔ گناہ گار نے اپنی بونجی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دیدی اور پرہیزگار خزانہ کا سانپ بنے رہے۔ جاہل نے اپنی اسلامی خودی کو ہر قیمت پر باقی رکھا اور عالم کفر کے ہاتھوں بک گیا۔ پس انسان دراصل اپنے مجموعی کردار سے اپنا مقام متعین کرتا ہے نہ کہ صرف بادی النظر میں نظر آنے والے چند اعمال سے۔

حد نہیں بلکہ تعزیر ہے | اس سے معلوم ہو گیا کہ شراب نوشی پر کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ بلکہ حاکم

وقت کو اس پر تعزیر جاری کرنے کا حق ہے۔ حدود میں یہ نہیں ہوتا کہ آج ایک سزا دی جا رہی ہے کل دوسری سزا دی جا رہی ہے یہ شان تعزیر کی ہوتی ہے کہ حاکم وقت حالات اور ضرورت کو

ملفوظ رکھتے ہوئے جو سزا مناسب سمجھے دیدے۔ یا سربراہ مملکت اپنے اہل شوریٰ سے مشورہ کر کے کوئی ایک سزا مقرر کر دے تاکہ اس کے قلم رومیں سزاؤں میں یکسانیت قائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک شہر کا حاکم ایک سزا دے رہا ہے اور دوسرے شہر کا حاکم دوسری سزا دے رہا ہے۔ لیکن شوریٰ کے ذریعہ سے یہ مقرر کردہ سزا ہمیشہ کے لئے حتمی نہیں ہوگی کہ اس میں کوئی دوسرا سربراہ مملکت کوئی تبدیلی ہی نہ کر سکے۔ ہر زمانہ کے حالات اور مقتضیات کے ماتحت مختلف فیصلے کئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال قرآن کدیم نے اس کی کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی جسے قرآنی حد کہا جاسکے اور جسے حتمی قرار دیا جاسکے۔ البتہ شراب نوشی کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جس پر تعزید ہونی چاہیئے۔

احکام مرتد

آپ کسی چھوٹی یا بڑی مشین کو لے لیجئے اس میں ہر پرزہ کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی محولہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے تو وہ مشین حرکت کرے گی ورنہ کھڑی ہو جائے گی، گھڑی کا ایک پرزہ، موٹر کا کوئی حصہ و اپنا کام چھوڑ دے تو نہ گھڑی چل سکے گی اور نہ موٹر حرکت کر سکے گی، یہی حال کائنات کا ہے۔ اس کی کارگاہ میں بھی لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں چیزیں ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص کام ہے جو وہ انجام دے رہی ہے۔ اگر کوئی چیز اپنا مفوضہ کام انجام دینا چھوڑ دے تو کائنات کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتے۔ اگر زمین اپنے راستہ سے ایک انچ ادھر اُدھر ہو جاتے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی تبدیلی پیدا کر لے۔ اگر ہوائیں اپنے رخ کو ایک سینکڑ کے لئے خلاف قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی بجائے نشیب کی طرف بہنے کے فراز کی طرف بہنے لگے۔ اگر آگ حرارت کی بجائے برودت دینے لگے۔ اگر لکڑی دریا اور سمندر میں نہ نشین ہونے لگے۔ غرض کہ کارگہ عالم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا پرزہ اپنے نظام اور قانون سے سرتابی اختیار کرے

تو یہ عظیم الشان پوری کائنات کا کارخانہ ٹھپ ہو جاتے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۳۶، ۳۷، ۳۸)

ترجمہ ۱۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔

اور

لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا (۳۹)

ترجمہ ۱۔ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنی چیزیں ہیں وہ اللہ کے قانون کے سامنے خوشی اور ناخوشی سے سجدہ ریز ہیں۔

اور

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ

وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ○ (۴۰)

ترجمہ ۱۔ اور کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنے چلنے پھرنے والے جاندار اور فرشتے ہیں وہ سب اللہ کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور مرتابی نہیں کر سکتے۔

انہی چلنے پھرنے والی ہستیوں میں انسان بھی ہے۔ وہ قوانین الہی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور سرمو ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ جتنے کچھ اس کے حیوانی تقاضے ہیں وہ ان میں قوانین فطرت سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کی زندگی کے چند محدود انسانی معاملات ہیں جو اس کی زندگی کا ۱/۱۰۰ بھی مشکل سے ہوں گے ان میں حق تعالیٰ نے اسے اختیار و ارادہ کی آزادی عطا فرمادی ہے

وہ ان میں قانون قدرت سے انحراف کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔
 قدرت کی طرف سے اسے یہ قدرت عطا فرمائی گئی ہے کہ وہ چاہے
 تو قوانین قدرت کی اتباع کرے اور چاہے تو ان سے انحراف کی صورت
 اختیار کرے۔ یہ چند معاملات وہ ہیں جو انسانی شعور و ادراک سے متعلق
 ہیں ان کے متعلق حق تعالیٰ نے آدم کو اس ”دنیا“ میں بھیجنے کے ساتھ
 ہی فرما دیا تھا کہ:-

فَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىَٰ فَيَهْدِيَكَ إِلَىٰ فَسَادٍ ۖ فَتَذَرُ الْبَيْتَ ۚ
 عَلَيْهِ سَلَامٌ ۚ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىَٰ فَيَهْدِيَكَ إِلَىٰ فَسَادٍ ۖ فَتَذَرُ الْبَيْتَ ۚ
 (۲/۳۸)

ترجمہ:- تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت
 آئی تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں نہ کسی قسم کا
 خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
 اور اس کے برعکس:-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۚ
 (۲/۳۹)

ترجمہ:- اور جو لوگ (میری ہدایت کا) انکار کریں گے
 اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے تو یہی لوگ جہنمی ہوں گے
 اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں راہوں کو بالکل واضح اور ممتاز کر دیا
 ہے۔ ہر انسان اپنی مرضی سے جو کسی راہ چاہے اختیار کرے۔
 حق تعالیٰ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی جبر، اکراہ یا استبداد
 نہیں۔

وَهَذَيْنَا التَّجْدِيْنِ ○ (۹۱)

ترجمہ :- اور ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

اس سے پہلے اس نے بتا دیا ہے کہ کیا ہم نے اسے دیکھنے کیلئے دو آنکھیں اور بولنے کے لئے ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں فرما دیئے ؟

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ○ وَ لِسَانًا وَ شَفَتَيْنِ ○

(۹۱)

ترجمہ :- کیا ہم نے اسے (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں اور (بولنے کے لئے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کر دیئے ؟ اور ساتھ ہی گوش ہوش اور دیدہ حق نبوش بھی عطا فرما دیئے۔

فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ○ (۹۲)

ترجمہ :- اور ہم نے اسے شنوا و بینا بنا دیا۔ اور اچھی طرح راستہ دکھا دیا تھا۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا ○ إِمَّا كَفُورًا ○

(۹۲)

ترجمہ :- ہم نے اسے راستہ دکھا دیا تھا اس کے بعد وہ جی چاہے تو شکر گزار بندہ بن جاتے اور چاہے تو نافرمان منکر بن جاتے۔

بہر حال حق تعالیٰ نے انسان کو پورا پورا اختیار عطا فرما دیا کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کرے یا کفر کی راہ اختیار کرے۔ یعنی

ایمان اور کفر کے بارے میں اس پر کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ

شَاءَ فَلْيُكْفُرْ۔ (۳۸)

ترجمہ :- اور اے پیغمبر اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ

کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے تو (اب) جس کا جی

چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کی راہ اختیار

کریے۔

جو ایمان کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے فیوض و برکات سے

بہرہ مند ہوگا اور جو کفر کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے عواقبِ آلام

سے حصہ پائے گا۔

فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّٰ فَلِنَافْسِهِ

عَلَيْهَا۔ (۳۹)

ترجمہ :- تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ

اس کی ذات کو ہوگا۔ اور جو گمراہی کی راہ اختیار کرے گا تو

اس کی گمراہی کا وبال بھی اسی کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

وَمَا أَنْتَ بِمُكَلِّمٍ ۖ (۴۰)

ترجمہ :- اور اے پیغمبر اسلام! آپ ان پر کوئی ذمہ دار

نہیں ہیں۔

اگر حق تعالیٰ کی مشیت یوں ہوتی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں

تو وہ انسان کو بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک روشِ زندگی

کا پابند بنا کر پیدا کر دیتا۔ کائنات میں اور بھی تو کروڑوں اربوں مخلوق

ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کی آزادی مرحمت نہیں فرمائی
وہ کبھی بھی اپنی مقررہ روش سے سرمو انحراف نہیں کرتیں۔ آپ نے
بھیڑ بکریوں کو کبھی گوشت کھاتے اور شیر اور چیتے کو گھاس کھاتے
نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کے لئے جو قانون اس نے مقرر کر دیا ہے وہ
سرمو اس سے انحراف نہیں کرتے۔ ارشاد الہی ہے کہ انسان کو ہم نے
شعوری امور میں ارادہ و اختیار کی آزادی سے نوازا ہے اور اسے
عقل و شعور عطا کر کے کائنات میں آزاد چھوڑا ہے۔ ہم اسے ان
امور میں کسی ایک روش کا پابند بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری مشیت
کا تقاضا ہی یہ ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَعَلْنَاهُ
أَنَاسًا مُّكْرِمًا ۖ النَّاسُ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُّؤْمِنِينَ ﴿١٠٧﴾
توجہ دے اور اے پیغمبر اسلام! اگر تیرے پروردگار کی
مشیت ہوتی تو روئے زمین پر جتنی آدمی بستے ہیں وہ سب کے
سب ایمان لے آتے (مگر اللہ کی مشیت ہی یہ نہیں ہے)
تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب
ایمان لے آئیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ انسان کو با اختیار اور با ارادہ بھی
بنائے اور پھر اس کو مجبور بھی بنادے۔ ارشاد ہے کہ اے پیغمبر اسلام!
آپ صاف صاف اعلان کر دیجئے کہ۔

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ
وَمَنْ عَمِيَٰ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ﴿١٠٨﴾

ترجمہ :- اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ توجو آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو آنکھیں بند کر کے ٹھہر جائے گا چلے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا اور میں تم پر کوئی نگران نہیں بنایا گیا ہوں۔

اے آپ ﷺ
 اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ رِّبِّیْكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
 عَاوِیْضًا عَنْ الشَّیْءِ کَیْنٍ ۝ وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَسْرَقْنَا
 مَا جَعَلْنَاكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا وَّمَا اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِرَکِیْبٍ ۝
 (۱۰۶-۱۰۷)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! آپ تو اس کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے وحی کی جارہی ہے۔ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور مشرکوں کی طرف سے کنارہ کیجئے (ان کی فکر ہی نہ کیجئے) اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ بھی مشرک نہ ہوتے۔ ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران نہیں بنایا اور نہ ہی آپ پر ان کی کوئی ذمہ داری ہے۔

انسان اگرچہ اب عہد شعور کو پہنچ چکا ہے لیکن پھر بھی ان کی اکثریت ابھی تک طبیعت کے اعتبار سے بڑی کمزور واقع ہوئی ہے۔ کوئی مشکل کام نہیں سمجھا کہ چند خوارق عادت (معجزات) کی رو سے اسے درطہ حیرت میں ڈال کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جاتی لیکن یہ بھی اکراہ (MENTAL COMPULSION) ہی کی ایک صورت

ہوتی جو اختیار و ارادہ کی حریت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ لہذا حق تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو کوئی حسی معجزہ بھی عطا نہیں فرمایا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ اِنْ
نَزَّلْنَاهُ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ اَعْيُنُهُمْ
لَهَا خَضِيعِينَ ۝ (۲۶)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! آپ تو شاید اپنے آپ کو اسی
غم میں ہلاک کر ڈالیں کہ لوگ مؤمن کیوں نہیں ہو جاتے۔
اگر ہم (انہیں جبراً مؤمن بنانا) چاہتے تو ان پر آسمان سے
کوئی نشانی (معجزہ) اتار دیتے کہ ان کی گردنیں اس کے لگے
جھک جاتیں (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا)۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر اعلان کرا دیا
گیا کہ اب خوارق عادات کا دور ختم ہو گیا اب دلائل و براہین کا دور
ہے۔ اب اسلام کی دعوت علی وجہ البصیرت دی جائے گی۔

قُلْ هَلْ مِنْ سَبِيلٍ لِّيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا
وَمَنْ تَبِعَنِىْ ۝ (۲۷)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ
ہے۔ میں اور میرے پیروکار علی وجہ البصیرت اللہ کی طرف
دعوت دیتے ہیں۔

ہماری دعوت غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت ہے۔ ہم
فہم و فراست اور عقل و بصیرت سے اپیل کرتے ہیں۔ سوچو، سمجھو
غور و فکر کرو۔ اگر بات سمجھ میں آتی ہے تو مانو، نہیں سمجھ میں آتی

ہے تو نہ مانو۔ ہماری دعوت جو روا کرہ یا زبردستی اور جبر کی دعوت نہیں ہے۔ ہم نے انسان کو شعوری معاملات میں اختیار و ارادہ کی آزادی بخشی ہے۔ اب کسی قسم کا جبر و اکراہ کر کے اس کے اختیار و ارادہ کی آزادی کو سلب کر لینا ہمارے فیصلہ کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور شرف انسانیت کا سلب و نہب ہے۔ اگر تم مشرکین سے برسرِ جنگ بھی ہو، وہ تمہیں قتل کر رہے ہوں اور تم ان کو قتل کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں کوئی مشرک تم سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے آئے تو بھی تم اس پر جبر نہ کرو۔

وَلَا تَحِدُّوا مَعَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَ لَهُ فَأَجْرُهُ مُحْتَقٌ
يَسْمَعُ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ آتَا بِلُغَةٍ مَا مَنَّاهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ
قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ ○ (۹)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! اگر مشرکین میں سے کوئی آدمی (عین حالت جنگ میں) تم سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دیدو حتیٰ کہ وہ کلام الہی کو سن لے (اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کر لے) پھر اسے (اپنی حفاظت میں) اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسے حالت جنگ میں بھی امان دیدو اسے اللہ کا کلام سناؤ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرو۔ پھر اسے اس کے پڑاؤ تک جہاں وہ خود کو مامون و مصئون سمجھتا ہو پہنچا دو۔ اور اس طرح اسے مہلت دو کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ اس پر تدبیر و تفکر کر کے کسی نتیجہ

تک پہنچ سکے۔ اگر اس کا دل مطمئن ہو جائے تو وہ اسلام کو قبول کرے اور اگر اسے اطمینان حاصل نہ ہو سکے تو اسلام کو قبول نہ کرے بغیر اطمینان قلبی کے ایمان لے آنے سے کچھ حاصل نہیں اس لئے کہ ایمان کا تعلق انسان کے دل سے ہے زبان سے نہیں۔ جب تک انسان کا دل ہی مطمئن نہ ہو وہ زبان سے لاکھ ایمان کے دعوے کرے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی میزان میں منافق ہیں اور وہ کافروں سے بدتر ہیں۔ بہت سے لوگ زمانہ عہد نبوت میں مسلمانوں کی روز افزوں فتوحات سے مرعوب ہو کر ایمان لے آئے تھے ان کا ایمان کچھ عقل و بصیرت پر مبنی نہیں تھا۔ حق تعالیٰ نے ان سے واضح طور پر فرما دیا تھا:-

قَالَتِ الْأَعْرَابُ الْمَتَاءُ قُلُ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ..... إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ لَمْ يَزُوا فَوْزًا وَجْهَهُ ذَا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ ○ (۲۹/۱۵۱)

ترجمہ:- اعرابی کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ ایمان نہیں لائے البتہ یوں کہو کہ ہم مطیع و فرمان بردار ہو گئے ہیں۔ اور (یہ اس لئے کہ) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں

دل ایمان کے ساتھ مطمئن نہ ہو اور زبان سے ایمان کے بلند بانگ
دعوے کر رہا ہو۔ اللہ کے ہاں اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے
ایمان اور کفر کا مدار قلبی کیفیت پر ہے۔ زبانی دعووں پر نہیں ہے
لَا اكْرَاهُ فِي الدِّينِ | قرآن کریم نے واشگاف الفاظ میں اعلان
فرمادیا ہے:-

لَا اكْرَاهُ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الزُّشْدُ مِنَ الْغِيِّ

(۱۸۶)

ترجمہ:- دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے
ہدایت، گمراہی سے واضح اور متمیز ہو چکی ہے۔

اور

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ وَمَنْ شَاءَ
فَلْيُكْفَرْ (۱۸۷)

ترجمہ:- اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار
کی طرف سے (آچکا) ہے تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور
جس کا جی چاہے وہ انکار کر دے۔

اور

إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝

(۱۸۸-۱۸۹)

ترجمہ:- (اے پیغمبر!) آپ تو محض نصیحت کرنے والے
ہیں آپ ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔
آپ کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ آپ انہیں زور اور زبردستی سے

مسلمان بنائیں۔

ایک شخص جو مسلمان ہوا اور اس کے بعد اس کا دل ایمان پر مطمئن نہ رہا، اسے کسی دوسرے مذہب پر انشراح قلب ہو گیا ہے اور وہ اسلام کو چھوڑ دینا چاہتا ہے تو قرآن کی ہدایت کے مطابق اسے تبدیل دین کی اجازت نہ دینے اور تبدیل دین کے بعد اسے قتل کی سزا دینے کے معنی یہی تو ہیں کہ آپ اسے اسلام پر کاربند رہنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ آپ سوچئے تو سہی کہ دل میں ایمان نہیں مگر آپ زبردستی اسے مسلمان کہلوانے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ موت کے خوف سے اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا ہے اور کہلوا رہا ہے۔ کیا آپ اسے مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ اگر اسے مسلمان کہا جاسکتا ہے تو مجھے بتایا جائے کہ منافق اور کسے کہتے ہیں؟ اس طرح تو ہم اپنے حلقہ میں منافقین کا ایک طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کی رو سے منافقین تو کفار اور مشرکین سے بھی بدتر ہیں:-

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَةِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ

يُجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ○ (۱۳۵)

ترجمہ:- منافقین تو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور اے پیغمبر آپ ان کے لئے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔

ایسا آدمی جس کا دل اسلام پر مطمئن نہیں اور اسے کسی اور مذہب پر انشراح قلب ہو گیا ہے کیا اسلام کے لئے کسی درجہ میں بھی کچھ مفید ہو سکتا ہے؟ وہ یقیناً مفید نہیں ہو سکتا۔ وہ آگے چل کر مارا آستین ہی ثابت ہوگا۔ یقیناً ایسے مسلمانوں کی اسلام کو ضرورت

نہیں ہے۔

قرآن کریم کی عام تعلیمات کا مآل یہی ہے کہ نہ کسی کو مسلمان بنانے کے لئے کسی قسم کا جبر واکراہ کیا جاسکتا ہے نہ کسی کو مسلمان رہنے کے لئے کسی قسم کا جبر واکراہ جائز ہے۔

ویسے قرآن کریم نے اشارۃً بھی مرتد کے لئے کسی قسم کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ ملاحظہ فرمائیے سورۃ ال عمران میں ہے:-

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ (۳۶)

ترجمہ :- اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہش مند ہوگا تو وہ اس سے کبھی بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا۔

یہ تو ان لوگوں کا بیان ہوا جو دین اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ وہ شروع ہی سے کسی اور دین کے پیرو ہیں۔ وہ جس دین کے بھی پیرو ہوں حق تعالیٰ کے ہاں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان لوگوں کا بیان آ رہا ہے جو اسلام قبول کر لیتے ہیں اور پھر اسلام سے پھر جاتے ہیں اور کفر اختیار کر لیتے ہیں یعنی مرتد ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد ہے:-

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ
وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ أُولَٰئِكَ جَزَاءُ مَن
أَنَّىٰ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○

خَلِيدَيْنِ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنظَرُونَ ○ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَ
اصْتَحَرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ (۸۵-۸۸)
ترجمہ :- اللہ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ کیسے دکھا سکتا ہے
جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں (یعنی مرتد ہو جائیں)
حالانکہ وہ اس بات کی شہادت دے چکے تھے کہ رسول برحق
ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں۔ اور
اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتے جو
خود ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوں۔ ان لوگوں کا بدلہ یہی
ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت
اور پھٹکار برستی رہے۔ وہ اس لعنت میں ہمیشہ گرفتار
رہیں اور اللہ کے عذاب میں ان سے کوئی تخفیف نہ کی جائے اور
نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے بجز ان لوگوں کے جو اس کے
بعد توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو یقیناً حق تعالیٰ
بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔

قرآن کریم میں مرتدین کا بیان یہ ہے۔ اس بیان میں آپ دیکھتے
ہیں کہ حق تعالیٰ نے اشارۃً بھی نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کو اس جرم کی
پاداش میں قتل کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے ان کی سزا (اَوْ كَلِيلًا
جَزَاءً مِمَّا هُمْ) صراحت کے ساتھ یہی بتائی ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں
اور تمام انسانوں کی لعنت اور پھٹکار برے اور اس لعنت میں وہ
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرفتار رہیں، وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوں اور

انہیں کوئی مہلت نہ دی جائے۔ یہ ساری آخری سزائیں ہیں۔ اس کے بعد پھر یہ بھی تصریح ہے کہ اس کے بعد بھی ان لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔ وَأَصْلَحُوا کا لفظ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یعنی تقیہ کے طور پر موت کے خوف سے مسلمان ہونا سودمند نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ سچ سچ دل سے مسلمان ہوں اور اپنے اعمال درست کریں تو حق تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت انہیں قبول کرنے کے لئے اب بھی تیار ہے۔ اگلی آیات میں ایسے لوگوں کے طبعی موت سے مر جانے کا ذکر ہے۔ ارشاد الہی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا كُفْرًا
لَنْ تَقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ○
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَا تَوَّابُوا هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَتَّخِلَ
مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ

(۳۱-۹۰)

نَصِيرِينَ ○

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا، پھر وہ کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہی لوگ تو گمراہ ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور کفار ہونے کی حالت میں ہی وہ مر گئے تو اگر وہ زمین بھر سونا بھی اپنے فدیہ میں پیش کریں تو ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی لوگ تو ہیں جن کے لئے دردناک عذاب

ہوگا اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔

غور فرمائیے اس آیت کریمہ میں بھی ایمان لانے کے بعد لوگوں کے کفر کرنے کا ذکر ہے۔ نہ صرف کفر کرنے کا بلکہ کفر میں بڑھتے چلے جانے کا۔ یہ لوگ مرتد بلکہ شدید درجہ کے مرتد ہیں۔ ان کے متعلق قتل کرنے کے حکم کے بجائے یہی بتایا گیا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ پھر اگلی آیت میں ارتداد ہی کی حالت میں اپنی طبعی موت مر جانے کا بیان ہے اور ان کے لئے یہی بتایا گیا کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور انہیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ انہی کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر وہ عذاب الہی سے چھوٹنے کے لئے زمین بھر سونا بھی فدیہ میں پیش کریں گے تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان آیات کریمہ میں **ثُمَّ اِذَا دُاعُوا** **كُفْرًا** (پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے) کا ٹکڑا خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ یعنی وہ مرتد ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں۔ قتل کر کے ان کی زندگی ختم نہیں کر دی جاتی بلکہ وہ مرتد ہونے کے بعد اس قابل رہتے ہیں کہ وہ اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ اگر وہ ارتداد کے بعد ہی قتل کر دیئے جاتے تو اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اس کے بعد آگے بڑھتے۔ سورۃ نسا میں ارشاد الہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا

ثُمَّ اَزَادُوْا کُفْرًا لِّمَکْرِیْنِ اللّٰهِ لَیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا

(۴/۱۳۷)

لَیْھُمْ یَھْدِیْہُمْ سَبِیْلًا ○

ترجمہ :- یقیناً جو لوگ ایمان لائے۔ پھر کفر کیا (مرتد ہو گئے)
پھر ایمان لائے۔ اس کے بعد پھر کافر (مرتد) ہو گئے۔ اس کے
بعد کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اللہ انہیں بخشے والا نہیں اور
نہ انہیں ہدایت کی راہ دکھانے والا ہے۔

یہاں صرف ایک بار مرتد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوبار مرتد
ہونے کا ذکر ہے کہ وہ ایک بار اسلام لائے اور مرتد ہو گئے۔ اس
کے بعد دوبارہ اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے بلکہ اپنے کفر میں
بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان کا کفر شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ان کے
متعلق بھی قرآن کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ انہیں ارتداد کی سزا میں
قتل کر دو۔ بلکہ یہی ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی بخشش نہیں ہو سکے گی
اور اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت کی راہ نہیں دکھائے گا۔

اس کے بعد اور آگے بڑھتے۔ سورہ مائدہ میں حق تعالیٰ ارشاد
فرماتے ہیں کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ
فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ
أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ
فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

(۵۸)

ترجمہ :- اے پیروان دعوتِ ایمانی! تم میں سے جو آدمی
بھی اپنے دین سے پھر جائے گا (مرتد ہو جائے گا) تو ہو جائے

حق تعالیٰ ایسے لوگوں کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہو گا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے۔ وہ مؤمنوں کے لئے نہایت نرم خو ہوں گے اور کافروں کے لئے نہایت سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیدے اور اللہ بڑی وسعتوں والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں تو مَنْ تَيَسَّدَتْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ (تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جاتے) ارتداد کا لفظ ہی حق تعالیٰ نے استعمال فرما کر بات کو واضح سے واضح تر کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کوئی مرتد ہو جاتا ہے تو مرتد ہو جاتے وہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ایسے لوگوں کی جگہ ہم ان لوگوں کو لے آئیں گے جو صحیح مؤمنانہ صفات کے پیکر ہوں گے۔ یعنی مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو جانے دو۔ تم اس کی ذرا پروا نہ کرو۔ اس آیت میں بھی کہیں اشارۃً تک نہیں فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو قتل کر دو۔ قتل کرنا تو دکنار یہاں تو صاف طریقہ سے مسلمانوں کو خطب کر کے فرما دیا گیا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو اسے ہونے دو۔ اس کی بالکل پروا نہ کرو۔ ایسے لوگوں کی جگہ دوسرے صحیح لوگ آجائیں گے جو اسلام کے لئے مفید ہوں گے۔

اس کے بعد سورۃ نحل کی اس آیت کریمہ پر پھر غور فرمائیے جس کا ایک حصہ پہلے بھی گذر چکا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات اس سے قتل مرتد

پر استدلال کرتے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا تھا ہر
 مَن كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنۡ اُكْرِهَ وَقَلْبُهُ
 مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِن مَّنۡ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدًا
 فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝
 (۱۶)

ترجمہ :- جو آدمی اپنے ایمان لے آنے کے بعد اللہ کے ساتھ
 کفر کرے (کافر اور مرتد ہو جائے) بجز اس آدمی کے جس کو
 (کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن
 ہو (تو وہ مستثنیٰ ہے) لیکن (بات اس کی ہو رہی ہے)
 جس کو کفر کے ساتھ شرح صدر ہو جائے تو ایسے لوگوں پر
 اللہ کا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا۔
 اس آیت کریمہ میں ارتداد کی سزا (قتل نہیں بلکہ) غضب الہی
 کا نزول اور آخرت کا بڑا عذاب بتائی گئی ہے۔ اس سے اگلی آیت
 میں بتایا گیا ہے کہ یہ سزا کیوں دی جائے گی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اسْتَحْبَبُوْا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلٰى الْاٰخِرَةِ
 وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ ۝ (۱۷)

ترجمہ :- یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے آخرت
 کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی ہی کو پسند کر لیا ہے اور اللہ
 کافروں کی قوم کو سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتا۔

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں پر غضب الہی نازل ہونے اور
 آخرت میں سخت عذاب دینے جانے کی وجہ حق تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ

شعبہ۔ یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے
میں حیات دنیوی ہی کو خرید لیا (اختیار کر لیا) ہے۔
تو ان سے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ان کی
کوئی مدد کی جائے گی۔

ان تمام آیات کریمہ سے ثابت ہے کہ بعینہ یہی کیفیت دوسرے
کافروں کی بھی ہوتی ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں ان لوگوں کی جو ایمان لانے کے
بعد کفر کرتے (یعنی مرتد ہو جاتے) ہیں ایک دوسری خصوصیت
یہ بیان فرمائی گئی ہے:-

اُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ سَمِعَتْهُمْ
وَاَبْصَارُهُمْ وَاُولَٰئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٦٨﴾

توجہ نہ دے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، جن کے
کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے (ان کی ملاحیت
گم کر دی ہے) اور یہی لوگ تو غافل ہیں۔

مگر یہ کیفیت بھی محض ایمان لانے کے بعد جو کافر (مرتد) ہو جائیں
انہی کی نہیں ہوتی بلکہ تمام کفار کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ سورۃ بقرہ
میں ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنٰمْ اَآذَنُوْا رَتَحُمُ
اَمْ لَمْ تَنْبِذْ رَحْمٰتُ لَآ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٦٩﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی
قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةً وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٠﴾

ترجمہ - یقیناً جو لوگ کافر ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے
 اسے پیغمبر آپ انہیں (ان کے کفر کے نتائج سے) ڈرائیں
 یا نہ ڈرائیں (وہ ایمان لانے والے نہیں) اللہ نے ان کے
 دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں
 پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

قرآن کریم تو بتا رہا ہے کہ شروع میں بھی اسلام سے انکار
 وہی لوگ کرتے ہیں جن میں صحیح بصیرت نہیں ہوتی اور جو اپنی
 صلاحیتوں (دلوں، کانوں اور آنکھوں) کو مردہ کر لیتے ہیں اور
 اسلام لانے کے بعد اسلام سے بھی وہی لوگ پھر جاتے ہیں جنہوں
 نے اپنی انہی صلاحیتوں کو ختم کر لیا ہو۔ لہذا اپنی خصوصیات کے
 لحاظ سے شروع ہی سے انکار (کفر) کرنے والوں اور اسلام لانے
 کے بعد انکار (کفر) کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہذا
 جس طرح شروع ہی سے کفر کرنے والوں کو اسلام کے لئے مجبور
 نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی اسلام لا کر کفر کرنے والوں (مرتدوں)
 کو مسلمان رہنے کے لئے بھی مجبور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ
 پھر قتل مرتد کا نظریہ پیدا کیسے ہو گیا جبکہ قرآن کریم اس سلسلے میں
 اس قدر واضح ہدایات دے رہا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
 اور خلفائے راشدین کے متعلق جو روایات میں بیان کیا جاتا ہے
 کہ وہ حضرات مرتدین کو قتل فرما دیا کرتے تھے تو اس کی حقیقت
 کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں عرب میں مسلمان اور مشرکین کے دو متخالف کیمپ تھے۔ جو شخص اسلام سے پھرتا (مرتد ہوتا) تھا وہ فوراً مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ یہ دونوں کیمپ متحارب کیمپوں میں شامل تھے وہ مخالف کیمپ میں شامل ہو کر اسلام کے خلاف سرگرمیاں شروع کر دیتا تھا اور باغیانہ حرکات کا صدور اس سے ہوتا تھا۔ ارتداد اور بغاوت ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اس زمانہ میں ارتداد محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا نام نہیں تھا بلکہ نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تخریب کاری، قتل و غارت گری اور بغاوت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایسے مرتدین کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

تمام صحاح ستہ کی کتابوں میں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں ارتداد کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے جو قبیلہ عکل اور عرینہ قبیلے کے آدمیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہونے کی باتیں کیں انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم جانور پالا کرتے تھے۔ کمیتی باڑی کے عادی نہیں ہیں۔ مدینہ کی آب و ہوا بھی ہمیں راس نہیں آرہی ہے۔ چنانچہ ان کو استسقا کی بیماری ہو گئی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صدقہ کے اونٹ دیتے اور ایک چرواہا بھی ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ ان اونٹوں کو لے جاؤ اور کسی جنگل میں رہائش اختیار کر لو اور ان اونٹوں کا دودھ اور ان کا پیشاب پیو

(اس زمانہ میں استسقار کی بیماری کا یہی علاج مشہور تھا) چنانچہ وہ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر حرہ کے ایک کنارے پر فروکش ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہیں قیام کیا اور تندرست ہو گئے اور اس کے بعد شیطان نے انہیں بہکایا چنانچہ وہ اسلام سے پھر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو داعی ان کے ساتھ کیا تھا اسے قتل کیا اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیریں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور اونٹوں کو مالک کے چلتے بنے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو لپٹے ان کی تلاش کے لئے ایک دستہ بھیجا۔ وہ گرفتار کر کے لاتے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیرائیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور حرہ کے میدان میں انہیں چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ وہ اسی حال میں مر گئے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ ابن سیرین نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ واقعہ حدود کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے جبکہ مشلہ کرنے (صورت بگاڑنے) کی ممانعت نہیں تھی۔ اسی روایت میں دوسری سند سے یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کے ساتھ یہی حرکت کی تھیں۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے چوری، ڈاکہ، قتل اور کفر کا ارتکاب کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کی تھی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہم تک یہ بات بھی پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد صدقے کا حکم فرمایا کرتے اور مشلہ کرنے (صورتیں بگاڑنے) سے منع فرمایا کرتے تھے۔

(بخاری، مسلم و باقی صحاح ستہ و مؤطا امام مالکؒ بحوالہ

جمع الفوائد ص ۲۸۴

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنہ ارتداد کا واقعہ بڑا مشہور ہے جس کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلح مزاحمت کے بعد بڑی تندہی کے ساتھ فرو فرمایا تھا۔ یہ بھی محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسلح بغاوت و مزاحمت اور مرکز کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار پر مشتمل تھا اور خود مرتدین کی طرف سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ اور مدینہ منورہ پر ان کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ یہ بھی مسلح بغاوت تھی۔ یہ اتنی واضح بات ہے جس کے لئے کسی حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ طبری سے نقل کئے دیتے ہیں۔ جس میں اس تمام صورت حال کی پوری نشان دہی کر دی گئی ہے مرتدین کے وفود کے مدینے سے چلے جانے کے بعد اہل مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:-

ان الارض كافة وقد دأى وفد هم منكم قلة
وانكم لاتدرون الا لا تؤتون امنهارا۔ و
ادناهم منكم على بريد وكان القوم ياملون ان
تقبل منهم ونوادعهم۔ وقد ابينا عليهم
ونبذنا اليهم عهدهم فاستعدوا واعدوا۔
فما لبثوا الا ثلاثا حتى طرقت المدينة غاة مع
الليل وخلفوا بعضهم بذى حسى ليكونوا لهم
ردا۔ (تاریخ طبری ص ۱۸۴ مطبوعہ یورپ)

توجہ دے ساری سرزمین (عرب) کافر ہو چکی ہے اور ان کے
 وفد نے تمہاری قلت تعداد دیکھ لی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں
 کہ وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں یا دن کو۔ اور ان کے قریب
 ترین لشکر تم سے ایک برید (منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلے
 پر ہیں اور ان لوگوں کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات
 مان لیں گے اور ان کے مطالبات تسلیم کر لیں گے۔ مگر ہم نے
 انکار کر دیا اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا تو وہ جنگ
 کے لیے تیار ہو گئے۔ لہذا تم بھی تیاری کرو۔ تو تین دن ہی
 گزرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور رات
 ہوتے ہی ہلہ بول دیا اور اپنی ایک جمعیت کو اپنے پیچھے
 ذی حسیٰ کے مقام پر تعینات کر دیا تاکہ وہ ان کی پشت پناہ
 ثابت ہوں۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ ابتداء اسلام میں
 ارتداد اور بغاوت کچھ لازم و ملزوم سے تھے۔ جو مرتد ہوتا تھا وہ
 بغاوت بھی کرتا تھا۔ وہ اسلامی مملکت میں تبدیلی دین کے بعد
 پُر امن شہری کی حیثیت سے ذی بن کر نہیں رہتا تھا بلکہ مسلح بغاوت
 کرتا تھا اور مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت کے حالات
 کو عام حالات پر قیاس کر لینا صحیح نہیں ہے۔ اس وقت اسلامی
 مملکت اپنے ابتدائی دور میں تھی اور اسے مختلف قوموں سے نبرد
 آزمائی کرنی پڑ رہی تھی۔ اسلامی مملکت کی تمام سرحدوں پر
 جنگ و جدال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اپنے ملک کے کسی آدمی

کے مرتد ہو جانے کے معنے صرف یہی نہیں تھے کہ اس نے اپنا نظریہ اور عقیدہ تبدیل کر لیا۔ بلکہ وہ محارب گروہ سے مل جاتا اور اپنی مملکت کے بہت سے قیمتی راز اپنے ساتھ لے جاتا اور دشمن کو بتا دیتا تھا۔ بہت سے لوگ محض جاسوسی کرنے اور ہمارے دفاعی راز معلوم کرنے کے لئے آ جاتے اور بظاہر مسلمان ہو جاتے تھے۔ اور اپنا کام کر لینے کے بعد اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کو سربراہ مملکت اور عمائدین سلطنت ہی سمجھتے تھے اور جیسا مناسب سمجھتے فیصلے کرتے تھے۔ اس وقت کے ہنگامی حالات میں جبکہ اسلامی مملکت ہر طرف سے دشمنوں کے زرعے میں تھی عمال حکومت نے جو فیصلے کئے تھے انہیں آج کے پُر امن حالات پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ روایات کے ذریعہ سے ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ اس وقت کے فیصلے ہی فیصلے ہیں۔ ان فیصلوں کا پس منظر اور اس وقت کے خصوصی حالات کو راویوں نے بیان نہیں کیا۔ اس لئے محض روایات کے ذریعے سے قرآن کریم سے بے نیاز ہو کر ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے فقہاء کرام میں خصوصیت کے ساتھ سادات حنفیہ نے (شکراً اللہ سعیم) اس حقیقت کو سمجھا ہے اور انہوں نے مرتد عودت، مرتد نابینا، مرتد معذور، مرتد شیخ فانی کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے صراحت فرمادی ہے کہ ان لوگوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ارتداد میں قتل کی اصل علت ارتداد نہیں ہے بلکہ حُرَابَہ (بغاوت اور مسلح جنگ) ہے۔ چونکہ یہ لوگ بغاوت اور

مسلم جنگ کی اہلیت نہیں رکھتے لہذا ان کو قتل بھی نہیں کیا جاسکتا چنانچہ ہدایہ میں **وَأَمَّا الْمُرْتَدَّةُ فَلَا تُقْتَلُ** اور مرتد عورت قتل نہیں کی جائے گی کے تحت میں لکھا ہے۔

وَلَنَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ قَتْلِ

النِّسَاءِ - وَلَإِنَّ الْأَصْلَ تَأْخِيرُ الْأَجْزِيَةِ إِلَى دَارِ الْآثَرَةِ

إِذَا تَعَجَّلَهَا يَخْلُ بِمَعْنَى الْإِبْتِلَاءِ وَأَنَّمَا عُدِلَ عَنْهُ

وَفِعَالُ شَرِّهَا جَزْ وَهُوَ الْحَرَابُ وَلَا يَتَوَجَّهُ ذَالِكُ

مِنَ النِّسَاءِ لِعَدَمِ صِلَا حِيَةِ الْبَنِيَةِ بِمُخْلَافِ الرِّجَالِ

فَصَارَتْ الْمُرْتَدَّةُ كَالْأَصْلِيَّةِ - (ہدایہ ص ۶۱۱)

ترجمہ :- اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور کیونکہ

سزاؤں میں اصول یہی ہے کہ انہیں دار آخرت تک مؤخر

کیا جائے۔ کیونکہ (دنیا ہی میں) جلد سزا دینا (بندوں کی)

آزمائش و ابتلا کے مفہوم کو غلط کر دیتا ہے۔ کسی فوری شر

کو دفع کرنے کے لئے ہی اس سے انحراف کیا جاسکتا ہے

اور وہ مسلح جنگ ہے جو عورتوں کی طرف سے ممکن نہیں

ہے کیونکہ عورتوں کی جسمانی ساخت ہی اس کی صلاحیت نہیں

رکھتی۔ بخلاف مردوں کے۔ اس لئے مرتد ہو جانے والی عورت

کا حکم اس کا فر عورت ہی کی طرح ہو گا جو شروع سے (اصل

میں) کافر ہی ہو۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ صاحب ہدایہ بتا رہے ہیں کہ سزاؤں کے

معاملہ میں اصل قانون یہی ہے کہ انہیں دارالجزائر تک موخر رکھا جائے البتہ کسی فوری شرکے دفعیہ کے لئے اس اصل سے انحراف کر کے اس دنیا میں سزا دی جاسکتی ہے جیسے وہ جرائم جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو مثلاً چوری، زنا، قذف وغیرہ ایسے ہی ارتداد میں مرتد کی طرف سے مسلح جنگ اور بغاوت، عورت اور معذور افراد میں چونکہ مسلح جنگ اور بغاوت کا امکان نہیں ہوتا اس لئے ان کو قتل بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال مرتد کا قتل ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ حرابہ کی وجہ سے ہے۔

براہیہ کے اس مسئلہ کے ذیل میں محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ :-

وهذا ای قوله نهی عن قتل النساء مطلق یعم
الکافرة اصلیا وعارضا وثبت تعليله صلی اللہ علیہ
وسلم بالعلة المنصوصة فی الحدیث من عدم
حرابها بقوله (ما كانت هذه لتقاتل) فكان محصماً
لعوم ما رواه الشافعی من قوله صلی اللہ علیہ
وسلم (من بدل دینه فاقتلوه) بعد ان عومہ
محض بمن بدل دینه من الاسلام الى الکفر
وايضاً فان الاصل تاخیر الاجزیه الى دار الاخرة
وانما عدل عنه دفعا لشرنا جز لمصالح تعود الينا
فی هذه الدار كالقصاص وحد القذف والشرب
والزنا والسرقه شرعت لحفظ النفوس والاعراض

والعقول والانساب والا موال فكذا يجب في القتل
في الردة ان يكون لدفع شر حرامه لاجزاء على
الكفر لان جزائهم اعظم من ذلك عند الله تعالى
فيختص بمن يتاقي منه الحراب وهو الرجل ولهذا
نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء
وعلمه بانها لم تكن تقاتل على ما صح من الحديث
ولهذا قلنا لو كانت المرتدة ذات رأى و تبع
تقتل لا لروتها بل لانها تسعى في الارض بالفساد
(فتح القدير ص ۳۳۰)

ترجمہ :- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ آپ
نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے مطلق ہے جو
اصلی کافر عورت کو اور اس عورت کو جو بعد میں کافر ہو گئی
ہو شامل ہے اور آپ کا اس کی یہ علت بیان کرنا (جو حدیث
میں منصوص علت ہے) یعنی اس کا جنگ نہ کرنا۔ چنانچہ آپ
کا یہ ارشاد ہے کہ ”یہ تو جنگ کرنے والی نہیں تھی“ تو یہ ارشاد
اُس روایت کے عموم کو خاص کر دیتا ہے جو امام شافعیؒ نے
بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو اپنا
دین بدل دے اسے قتل کر دو“ ہماری اس بیان کردہ شخص
سے پہلے بھی تمام حضرات کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد کا عموم اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنا
دین اسلام سے کفر کی طرف تبدیل کر لے (یہ نہیں کہ اگر کوئی

یہودی ہے اور وہ عیسائی ہونا چاہتا ہے تو اسے بھی دین تبدیل کرنے پر قتل کر دیا جائے) نیز یہ بات بھی ہے کہ اصل قانون جزاؤں میں ان کو دار آخرت کی طرف مؤخر کرنے کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شرکی مداخلت کے لئے ان مصلحتوں کی خاطر کیا جاتا ہے جو ہم بندوں کی طرف اس دنیا میں عائد ہوتی ہوں۔ مثلاً قصاص، حد قذف، حد شرب، حد زنا، حد سرقہ، نفوس، عزت و آبرو، دیات، انساب اور اموال وغیرہ کی حفاظت کے لئے تو ایسے ہی ارتداد کے اندر قتل میں بھی ضروری ہے کہ وہ بھی اس کے حراہ (بغاوت و جنگ) کے شرکی مداخلت کے لئے ہونہ کہ کفر کی جزا کے لئے کیونکہ کفر کی جزا تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی تو یہ جزا اس شخص کے ساتھ مخصوص ہوگی جس سے بغاوت اور جنگ صادر ہو سکے اور وہ مرد ہی ہو سکتا ہے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا ہے اور اس کی وجہ یہی بیان فرمائی کہ یہ بیچارہ کونسی جنگ کر رہی تھی۔ جیسا کہ حدیث نبوی سے صیح طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ اگر مرتد ہونے والی عورت صاحبِ رائے و اختیار ہو اور لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں تو وہ قتل کر دی جائے گی۔ لیکن اس کو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس لئے قتل کیا جائے گا کہ وہ زمین میں فساد اور فتنہ پھیلانے کی

کوشش کر رہی ہے۔

اسی طرح صاحب ہدایہ کے اس قول پر کہ ”ولا قتل الابوالحوب“
(اور قتل نہیں کیا جاسکتا مگر بغاوت کے جرم میں) صاحب عنایہ
(مشرع ہدایہ) نے لکھا ہے۔

فكان القتل هنا مستلزما للحرب لان نفس الكافر
لعين ببيع للمقتل حتى لا يقتل الاعمى والمقعّد
والشيخ الفاني: وقد تحقق الملزوم بالاتفاق وهو
كونه حربيا فمن يقتل فلا بد من كونه حربيا۔
(عنایہ برعاشیہ ہدایہ ص ۱۰۶)

ترجمہ :- تو اس سلسلہ میں قتل کی سزا جنگ اور بغاوت
کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ نفس کفر قتل کو حلال کرنے والا
نہیں ہے۔ حتیٰ کہ نابینا آدمی، معذور آدمی، بوڑھا پھولس
آدمی (اگر مرتد ہو جائیں) تو قتل نہیں کئے جاتے۔ جس امر پر
قتل کرنا لازم آتا ہے وہ بالاتفاق متحقق ہو گیا ہے یعنی اس
کا محارب ہونا تو جو شخص قتل کیا جائے گا اس کا محارب
ہونا ضروری ہے۔

صاحب ہدایہ اور ہدایہ کے شارح محقق ابن الہام رحمۃ اللہ
علیہ نے معاملہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے کہ :-
”اصل قانون سزاؤں میں ان کو دار آخرت تک مؤخر کرنے
کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شر کے دفعیہ کے لئے ان مصلحتوں
کی خاطر کیا جاتا ہے جن کا تعلق ہم بندوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً قصاص

حد قذف ، حد شرب ، حد زنا ، حد سرقہ ، جو نفوس ، عزت و آبرو ، دیات ، انساب و اموال کی حفاظت کا باعث ہیں۔ ایسے ہی ارتداد میں بھی ضروری ہے کہ قتل کی سزا ، اس کے حراہ (بغاوت و جنگ) کے شر کے دفعیہ کے لئے ہو نہ کہ کفر کی سزا کے لئے کیونکہ کفر کی سزا تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی ۔

پھر صاحبِ عنایہ نے نابینا مرد ، معذور مرد ، شیخ فانی کی مثالیں دے کر بتا دیا ہے کہ صرف عورتوں ہی میں نہیں ، مردوں میں بھی اگر ایسے کچھ لوگ ہوں جن سے حراہ (جنگ اور بغاوت) کا احتمال نہ ہو تو وہاں بھی قتل نہیں کیا جاتا جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ قتل ارتداد کی سزا نہیں ہے بلکہ حراہ یعنی جنگ اور بغاوت کی سزا ہے ۔

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں اعلام السنن میں یہ ایک روایت نقل فرمائی ہے ۔
 عن عبد الرحمن بن محمد بن عبد اللہ بن عبد القاری
 عن ابیہ عن عمرؓ انه قال لوفد قد موا علیہ
 من بنی ثور هل من مغرب خبر قالوا نعم اخذنا
 رجلا من العرب کفر بعد اسلامہ فقد مناہ فضر بنا
 عنقه قال هلا ادخلتموه جوف بیت فالقیتمہ
 الیہ کل یوم رغیفا ثلثۃ ایام واستتبجوه لعلہ
 یتوب او یراجع امر اللہ ۔ اللہم لما شہد و
 لما مروا و لما راض اذ بلغنی رواہ مالک فی الموطا

رزعلی ص ۵۱۶ والیوسف الامام فی الخراج (ص ۱۱۲)
 وهو مرسل ورواه عبد الرزاق عن معمر وابن
 ابی شیبہ عن ابن عیینة كلاهما عن محمد بن
 عبد الرحمن بن عبد القادر عن ابيه فعلى هذا هو
 متصل لان عبد الرحمن بن عبد سمع عمر الجوهري
ص ۴۳۳ ورواه البيهقي عن انس قال لما نزلنا
 على تستر وفيه فقد منا على عمر فقال يا انس
 ما فعل الستة الرهط من بكرين وائل الذين
 ارتدوا عن الاسلام فلحقوا بالمشرکین قال يا امير
 المؤمنين! قتلوا في المعركة فاسترحج قلت وهل
 كان سبيلهم الا القتل قال نعم كنت اعرض
 عليهم الاسلام فان ابرادعتهم السجن ذكره
 المحافظ في التلخيص (ص ۳۵۳) وسكت عنه فهو حسن
 او صحيح واسنده ابن حزم في المحلى (ص ۱۹۱)
 حدثنا عبد الله ابن ربيع نا عبد الله بن محمد
 بن عثمان نا على بن عبد العزيز نا الحجاج بن
 المنهال نا حماد بن سلمة نا داود وهو ابن
 ابی هند عن الشعبي عن انس بن مالك وصحة

(اعلام السنن ص ۴۳۴)

ترجمہ: عبد الرحمن بن محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری سے
 روایت ہے انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے حضرت عمرؓ

سے نقل کیا کہ بنو ثور کا جب وفد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ مغرب کے متعلق کوئی خبر ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں! ہم نے ایک عرب کے آدمی کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا تھا ہم نے اسے آگے بڑھایا اور اس کی گردن مار دی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے اسے کسی گھر کے اندر قید کیوں نہ کر دیا کہ تین دن تک روزانہ اس کی طرف ایک روٹی ڈال دیا کرتے اور اس سے توبہ کرانے کی کوشش کرتے شاید وہ توبہ کر لیتا یا اللہ کے حکم کی طرف مراجعت کر لیتا۔ اے اللہ! میں نے اس واقعہ میں موجود عقانہ میں نے اس کا حکم دیا اور جب یہ بات مجھ تک پہنچی نہ اس پر راضی ہوا۔ اسے امام مالکؒ نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔ (زیلعی ص ۱۵۹) اور امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج (صلۃ) میں اور وہ مرسل ہے اسی کو عبد الرزاق نے معمر اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے انہوں نے ابن عیینہؒ سے، دونوں نے محمد بن عبد الرحمن بن عبد قاری سے انہوں نے اپنے والد سے اور اس سند سے یہ متصل ہے کیونکہ عبد الرحمن بن عبد نے حضرت عمرؓ سے سنا ہے (المجہد النقی ص ۱۴) اور اس کو بیہقی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب تستر (ایک مقام ہے) پر اترے --- اسی میں ہے --- تو ہم حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا کہ بکر بن وائل کی ان چھ آدمیوں کی

جماعت کا کیا ہوا جو اسلام سے مرتد ہو کر مشرکین سے جملے تھے تو حضرت انسؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین ! وہ معرکہ میں قتل ہو گئے تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ تو میں نے کہا کہ کیا قتل کے سوا ان کی کوئی اور بھی سبیل تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ہاں ! میں تو ان پر اسلام پیش کرتا۔ اگر وہ انکار کر دیتے تو میں انہیں قید خانے میں بند کر دیتا۔ اسے حافظ بن العنقیص الجیر (ص ۳۵) میں ذکر کیا ہے اور اس سے سکوت فرمایا ہے۔ لہذا یہ حدیث حسن یا صحیح ہے۔ اور اسے سند کے ساتھ ابن حرم نے محلی (ص ۱۹۱) میں بیان کیا ہے کہ ہم سے عبد اللہ بن ربیع نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم سے عبد اللہ بن محمد بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ہم سے علی بن عبد العزیز نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حجاج بن منہال نے، کہ ہم سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی کہ ہمیں داؤد یعنی ابن ابی ہند نے شعبی سے خبر دی انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور اسی حدیث کو صحیح کہا ہے۔

یہ ایک ہی واقعہ ہے یا دو واقعے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک ہی واقعہ قرار دیا ہے۔ لیکن بظاہر یہ دو الگ الگ واقعے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک واقعہ عبد اللہ بن عبد قاری نے کسی ایک آدمی کا نقل کیا ہے اور دوسرا واقعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بکر بن وائل کے چھ آدمیوں کا

بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ایک ہی واقعہ ہو یا دو واقعے ہوں حضرت عمرؓ نے مرتد کو قتل کرنے کا انکار فرمایا ہے اور قید کرنے کا حکم بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

قلت استدل به بعض العلماء على ان المرتد
يستتاب امدا ولا يقتل ويودع السجن لما ورد
في رواية البيهقي من قوله فان ابوا اودعتهم
السجن ولا حجة له فيه فقد ورد في مرس
محمد ابن عبد الله القاري عند مالك تقييد الحبس
بثلاثة ايام والطرق يفسر بعضها بعضا فعليه
يحمل ما في رواية النس عند البيهقي وغيره من
امداعهم السجن بالاطلاق فان المطلق يحمل
على المقيد اذا كان مخرج الحديث واحدا ومواسيل
مالك موصولة محتج بها كما مر في المقدمة -

(اعلام السنن ۴۲۲/۱۳۲)

ترجمہ :- میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے بعض علماء نے
اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ ہی کرانے
کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسے
قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔ کیونکہ بیہقی کی روایت
میں یہ آگیا ہے کہ اگر وہ انکار کرتے تو میں انہیں قید خانے

میں ڈال دیتا۔ اور اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری کی روایت میں جو امام مالکؒ نے نقل فرمائی ہے تین دن تک قید میں ڈال دینے کی قید آگئی ہے اور حدیث کے طریقے ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتے ہیں تو بیہقی وغیرہ میں جو حضرت انسؓ کی روایت آئی ہے یعنی مطلقاً قید خانے میں ڈال دینے کی روایت تو اسے مقید روایت یعنی تین دن تک قید میں ڈالنے والی روایت پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ جب احادیث کا مخرج ایک ہی ہو اور امام مالکؒ کی مراسیل موصول ہوتی ہیں اور ان سے احتجاج کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ میری سمجھ میں یہ تقریر بالکل نہیں آئی۔ اول تو دوطرح کی روایتوں کو ایک واقعہ سے متعلق قرار دینا خلاف ظاہر ہے۔ کیونکہ محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری کی روایت میں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ عرب کے ایک آدمی کا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بنو نائل کے چھ آدمیوں کی جماعت کا واقعہ ہے جو ظاہر ہے کہ وہی واقعہ نہیں ہے جو محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری نے بیان کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی محل نظر ہے کہ چونکہ محمد بن عبد اللہ بن عبد قاری کی روایت میں تین دن تک قید خانے میں ڈال دینے کا بیان آگیا ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں مطلقاً قید خانے میں ڈال دینے کا بیان ہے۔ لہذا یہاں مطلق (حضرت

ہوں کیونکہ دونوں پر عمل ممکن ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد یا تنافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ کفارہ ظہار کے بعد اگر روزے رکھنا اور غلام آزاد کرنا بیوی کو بابتہ لگانے سے پہلے ضروری ہے اور کھانا کھلانے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ بیوی کو بابتہ لگانے سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد میں بھی اور اگر مطلق اور مقید کا ایک حادثہ میں یہ حال ہے تو اگر وہ دو حادثوں میں واقع ہوں تو بطریق اولیٰ اسی پر عمل ہوگا۔

جبکہ فقہائے حنفیہ کا مسلک ہی یہ نہیں ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ چنانچہ کفارہ ظہار میں اگر روزے رکھ کر کفارہ ادا کرے یا غلام آزاد کر کے کفارہ ادا کرے تو اسے بیوی کو بابتہ لگانے سے پہلے یہ کفارے ادا کرنے چاہئیں کیونکہ کفارہ کی آیت (۵۸/۳۳) میں ان دونوں کفاروں کے ساتھ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَبَاسَا کی قید لگی ہوئی ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے کفارہ میں (۵۸/۳۴) یہ قید لگی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ حکم مطلق ہے۔ لہذا اس کے خلاف حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ یہاں مطلق روایت کو مقید روایت پر محمول کر لیا جائے ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال امام مالکؒ کی روایت جو مرسل ہے وہ حضرت انسؓ کی روایت کا جو مسند ہے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت انسؓ کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیے۔ لہذا بعض اہل علم کا استدلال کرنا ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان بعض اہل علم

کا نام نہیں بتایا جنہوں نے یہ استدلال فرمایا ہے۔ لیکن اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا کہ سلف میں سے بعض اہل علم قتل مرتد کے قاتل نہیں ہیں۔ وہ اسی کے قاتل ہیں کہ مرتدین سے تو بہ کر لے کی کوشش کی جائے گی ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :-

قال الموفق فی المغنی واجمع اهل العلم علی وجوب قتل المرتد روی ذلک عن ابی بکر وعمر وعثمان وعلی ومعاذ وابی موسیٰ وابن عباس وعیرہم ولم ینکر ذلک فکان اجماعاً وقال النخعی ۛ لیستتاب ابد او هذا یفنی الی ان لا یقتل ابداً وهو مخالف للسنة والاجماع ائم ملخصاً ص ۶۲-۶۳ (اعلام السنن ص ۳۳۲)

ترجمہ :- موفّق نے المغنی میں لکھا ہے کہ اہل علم نے مرتد کے قتل پر اجماع کیا ہے چنانچہ حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، ابن عباسؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے اور اس کا انکار نہیں کیا گیا تو یہ اجماع ہو گیا اور امام ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے ہمیشہ تو بہ ہی کرائی جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مرتد کو کبھی بھی قتل نہیں کیا جاسکتا اور یہ قول سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

صاحب مغنی اور دیگر فقہاء کا یہ ارشاد کہ اس مسئلہ پر کہ مرتد کو قتل کر دینا واجب ہے اجماع ہو چکا ہے محل نظر ہے جبکہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ پہلے بعض اہل علم کا یہ قول نقل فرما چکے ہیں کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ کرانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ نیز خود صاحب مغنی نے امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ وہ بھی توبہ کرانے کے قائل ہیں، قتل کر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہاد الاستاذ ہیں۔ کیونکہ امام ابو حنیفہ امام حماد کے شاگرد ہیں اور امام حماد، ابراہیم نخعی کے شاگرد ہیں۔ تو امام نخعی جیسے امام اور فقیہ کے اس قول کے بعد اجماع کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جو حضرات قتل مرتد کے قائل ہیں وہ اس مرتد کے قتل کے قائل ہیں جو محارب بھی ہو۔ لیکن جو محارب نہ ہو اس کو قتل کرنے کے قائل تو خود فقہائے حنفیہ بھی نہیں ہیں چنانچہ ہم ہدایہ، فتح القدیر اور عنایہ کے تصریحات سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عورتوں کو، اندھوں کو، اپاہجوں کو، شیوخ فانی کو اگر وہ مرتد ہو جائیں خود فقہائے حنفیہ کے نزدیک بھی قتل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان سے بغاوت اور محاربت کا اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔ قتل مرتد کے سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت (بخاری) اور معاویہ بن جندہ کی روایت (طبرانی کبیر) سے نقل کی

جاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ
 مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَدَقُّوْهُ (جو اپنا دین بدل دے اسے قتل
 کر دو) تو اس حدیث سے قتل مرتد پر استدلال کرنا صحیح معلوم
 نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کا مآل تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنا
 دین تبدیل کر لے اسے قتل کر دینا چاہیے، جیسا کہ کفر و مشرک سے
 توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اسے بھی قتل کر دینا ضروری ہو۔ کیونکہ
 اپنا دین تو وہ بھی تبدیل کرتا ہے۔ جو یہودی یہودیت سے تائب
 ہو کر عیسائی ہو جائے اسے بھی قتل کر دو۔ کیونکہ وہ بھی اپنا دین
 تبدیل کر رہا ہے ظاہر ہے کہ حدیث نبوی کا یہ مقصد نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کا لفظ عربی میں بہت سے معنوں میں
 استعمال ہوتا ہے۔ ازاں جملہ غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت،
 آئین، قانون، نظم و نسق، فیصلہ، کھٹوس نتیجہ، جزاء و سزا،
 بدلہ کے معنوں میں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانبرداری کے
 معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (تاج العروس و محیط المحیط)

قرآن کریم میں بھی دین کا لفظ ان تمام معنوں میں استعمال
 ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں نظام معاشرہ، ضابطہ
 زندگی، بقا، قانون حکومت، آئین مملکت، نظم اجتماعی، عدل وغیرہ
 کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان سب
 کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے اور وہ ہے الدین۔ یہی ہمارا
 معاشرہ کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا
 قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے۔

لہذا جو فرد بھی ہمارے معاشرے کا نظام، ہماری زندگی کا مضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں بغاوت، وناہ کی اور فتنہ و فساد پھیلاتے اس کی سزا قتل ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے عین مطابق ہے۔

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَاَيْتَهُمْ فِي الْوَدْعِ فَسَادٌ اَنْ يَقُولُوا اَوْ يَصَلُّوا اَوْ تُقَطَّعَ رَاْسُهُمْ يَكْفُرُوْا اَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْنَ مِنَ الْوَدْعِ مَا ذَالِكُمْ لِمَنْ خَوِيَ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (۳۳)

ترجمہ: ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں صرف یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے۔ انہیں پھانسی دیدی جائے، ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں۔ انہیں سر زمین اسلام سے ملک سے کر دیا جائے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کو کئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

لہذا جو شخص اپنے دین کو اس معنی میں بدلنا چاہے یعنی اسلامی معاشری نظام، اسلامی مضابطہ زندگی، اسلامی قانون حکومت، اسلامی آئین مملکت کو بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلا کر بغاوت کا ارتکاب کرے اس کو قتل کر دینا

واجب ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب لینا اس لئے ضروری ہے کہ اسی طرح اس ارشاد نبوی کو (اگر یہ واقعی ارشاد نبوی ہے اور اس کا ارشاد نبوی ہونا ثابت ہو جائے) قرآن کریم کی تصریحات اور نصوص مرکبہ سے جن کو ہم شروع باب میں بیان کر چکے ہیں تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) اور حدیث کی باقی کتابوں میں ایسی واضح احادیث بھی ملتی ہیں جن میں صرف دین بدل دینے کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا بلکہ اسے محاربہ (بغاوت) کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس کے لئے کہیں حادب اللہ ورسولہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور کہیں المفارق للجماعة (دشمن سے جا ملنے) کے۔ یہ احادیث بھی متعدد صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں۔ ظاہر ہے ایک ہی موضوع سے متعلق روایات کو یکجا کر کے اور ان کے تمام الفاظ کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالنا چاہیے کیونکہ کوئی راوی کسی نکتہ کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی راوی سے کوئی دوسری تفصیل رہ جاتی ہے۔ روایات قرآن مجید کی طرح لفظاً لفظاً تو محفوظ ہیں نہیں اس لئے حقیقت تک رسائی کے لئے تمام روایات پر نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بہر حال اب وہ روایات ملاحظہ ہوں جن میں محاربہ کی شرط ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو قلابہ کی حدیث ہے:-

حدثنی سلمان ابو دجاء مولیٰ ابی قلابہ۔۔۔۔۔

فقال (عمر بن عبد العزیز) ما تقول یا عبد اللہ بن زید قلت ما علمت نفسا حل قتلها فی الاسلام الا دخل ذنی بعد احصان او قتل نفسا بغير نفس او حارب اللہ ورسوله صلی اللہ علیہ وسلم۔
(بخاری کتاب التفسیر باب المناجزات الذین یحاربون اللہ ورسوله)
مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی

ترجمہ: مجھ سے سلمان ابوہریرہ، ابو قتلابہ کے آزا کردہ غلام نے بیان کیا کہ ابو قتلابہ سے عمر بن عبد العزیز نے پوچھا کہ اے عبد اللہ بن زید تم کیا کہتے ہو تو میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ اسلام میں کسی جان کو قتل کرنا جائز ہو یا نہیں اس کے کہ کسی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو یا کسی جان کو بلا قصاص کے قتل کر دیا ہو یا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی ہو۔
نیز بخاری ہی میں حضرت ابو قتلابہ کی حدیث ہے کہ: حدثنی ابو قتلابہ (فی حدیث طویل) فواللہ ما قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احدا الا فی احدی ثلاث خصال۔ رجل قتل بجريرة نفسه فقتل، او رجل ذنی بعد احصان، او رجل حارب اللہ ورسوله وارثه من الاسلام۔

(بخاری کتاب الدیات، باب القصاصۃ ص ۳۸۲)

ترجمہ: مجھ سے ابو قتلابہ نے (ایک طویل حدیث میں) بیان

کیا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کیا، ایک تو آدمی جس نے اپنے ذاتی جرم سے کسی کو قتل کر دیا اور اس کے بدلے میں قتل کر دیا گیا یا کسی آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کر لیا یا کسی شخص نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا۔

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ،
عن عائشۃؓ قالت قال رسول اللہ ﷺ لا یحل دم امرئ مسلم یشہد ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ الا فی احدی ثلاث ، وجبل زفی بعد احصان فاند یرجع وجبل خرج محاربا باملئہ ورسولہ فاند یقتل او یصلب او ینفی او یقتل نضاً فیقتل بھما۔

المجاہد فی کتاب الحدود . باب الحكم فی من ارتد ص ۵۹۴
ترجمہ :- حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں جو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دیتا ہو مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں :- کسی آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔ یا کسی نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے خروج کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے گا

یا سول پر چڑھایا جائے گا یا ملک بدر کر دیا جائے گا یا کئی
نفس کو قتل کر دیا ہو تو اس کے بدلے میں قتل کر دیا
جائے گا۔

نسائی میں اسی حضرت عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-
رعن عائشہؓ ----- اور جل یخرج من الاسلام
فیجارب اللہ عزوجل ورسوله فیقتل او یصلب
لم یغنی عن الارض۔

نسائی کتاب المحاربة باب الصلب ص ۱۱۲ مطبوعہ مطبعہ سلفیہ لاہور
ترجمہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے -----
یا کوئی آدمی اسلام سے خارج (مرتد) ہو جائے اور اللہ
عزوجل اور اس کے رسول سے جنگ کرے تو اسے قتل
کیا جائے گا یا پھانسی دی جائے گی یا سبز زمین اسلام
سے ملک بدر کر دیا جائے گا۔

نیز صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت
ہے کہ :-

عن عبد اللہ (بن مسعودؓ) قال قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم لا یجل دم امرئ مسلم
یشہد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا
باحدی ثلث النفس بالنفس والثیب الزانی
والمفارق لدينه التارک للجماعة۔

(بخاری کتاب الديات باب قول اللہ ان النفس بالنفس ص ۱۱۲)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین وجہوں میں سے کسی وجہ میں۔ ایک تو طعن کے بدلے جان دوسرے شادی شدہ زنا کار اور تیسرے اپنے دین کو چھوڑ دینے اور جماعت سے الگ ہو جانے

والا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت مسلم کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات ص ۹۹ میں اور سنن ابوداؤد کتاب الحدود باب الحکم من ارتد میں ص ۹۸ اور جامع ترمذی ابواب الدیات باب ما جاء لا یحل دم امرئ مسلم ص ۲۲ میں بھی ہے۔

حارب اللہ ورسولہ کے ذیل میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جو تلوار سے جنگ کرتا ہو، زبان سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہو یا کوئی ایسی حرکت کرتا ہو جس کا مقصد اسلامی ریاست کی تخریب ہو مثلاً دوسروں کو جنگ پر اکسانا، مسجد ضرار بنانا یا اس کی تیاری میں دشمن کی مدد کرنا، جاسوسی کرنا وغیرہ۔

بحث غالباً نامکمل رہ جائے گی اگر اس سلسلے میں ان دلائل پر بحث نہ کی جائے جو ہمارے بعض علمائے کرام نے اس موضوع پر قرآن کریم سے پیش فرمائے ہیں۔

عرصہ دراز ہوا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے روزنامہ ہمدرد میں قتل مرتد کے خلاف مضامین لکھے تھے اور ثابت کیا تھا کہ قرآن نے قتل مرتد کا حکم کہیں نہیں دیا تو ہمارے محترم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کے جواب میں ایک کتابچہ تحریر فرمایا تھا جس میں مولانا عثمانیؒ نے قتل مرتد پر قرآن کی اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا تھا جو سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کی بد اعمالیوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے کہ :-

قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ مُوسَىٰ إِذْ يُقَوِّمُ بَيْنَهُ يَحْيَىٰ مَوْلَىٰ لَكَ مَرْيَمُ فَأَتَتْ بِهِ حَبْلًا وَمَیْمَنًا ۚ وَتُحْمَلُهُ حَمَلَتُ الْمَرْءِ ۚ فَاتَّخَذَ الْمَرْءُ بِهَا ذُرِّيَّتًا طَافَتْ فِي الْاَرْضِ يَافًى ۚ فَكَفَرْنَا بِهِ ۚ نَفِثُوا فِيهِ فَمَنْعُوهٗ ۚ فَاِذَا فَمِنْهَا عَلَاقٌ مُّذْمُومٌ ۚ
 فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۚ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ۗ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۷﴾
 ترجمہ :- اور یاد کرو! جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا ۔ اے میری قوم تم نے گو سالہ بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے توبہ کرو، پھر اپنی جانوں کو قتل کرو۔ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تو اللہ نے تم پر توبہ فرمائی (توبہ قبول کر لی) یقیناً وہ توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کا استدلال یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے گو سالہ پرستی کر کے کفر کا ارتکاب کیا تھا اور وہ مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا

اور فرمایا کہ جن لوگوں نے گو سالہ پرستی نہیں کی وہ ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے گو سالہ پرستی کی ہے۔ لہذا مرتد کی سزا قتل ہو گئی۔

حق تعالیٰ مجھے اور حضرت مولانا مرحوم کو معاف فرمائیں۔ مولانا نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ پہلے تو توبہ کریں اور پھر قتل کر دیئے جائیں۔ اسلام میں مرتد کے متعلق کوئی فقیہ بھی اس کا قتل نہیں ہے مگر مرتد پہلے توبہ بھی کر لے اور اس کے بعد اسے قتل بھی کر دیا جائے۔ پوری امت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر مرتد توبہ کرے تو ارتداد کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور پھر اس کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ نیز اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے لئے جو گو سالہ پرستی کے مرتکب ہوئے تھے توبہ کی یہی صودت تجویز فرمائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں اور آیت کا یہ ترجمہ ہے کہ ”تم اپنے خالق کے سامنے توبہ کرو۔ لہذا اپنے نفسوں کو قتل کرو“ توبہ کی یہ صورت کہ لوگ اپنی جانوں کو قتل کریں اسلام میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں توبہ کی صرف یہ صورت ہے کہ آدمی نادم ہو جائے اور آئندہ کلمے دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا عزم مصمم کر لے۔ اسلام میں توبہ کی یہ صورت نہیں ہے جو بنی اسرائیل کے لئے تھی۔

بنی اسرائیل کے لئے حق تعالیٰ نے جہاں اور بہت سے سخت

احکام نازل فرمائے تھے، انہی میں سے ایک حکم بھی تھا جو آج نافذ العمل نہیں ہے۔ لہذا اس سے قتل مرتد کا حکم نکالنا ناقابلِ فہم ہے۔

اسی سلسلے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ ”مرتد کی منرا اسلامی قانون میں“ جس میں انہوں نے ”قتل مرتد کا ثبوت قرآن سے“ کا عنوان قائم فرما کر سورہ توبہ کی آیت (۹/۱۱) اپنی دلیل میں پیش فرمائی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سلسلہ کی پوری آیتیں پیش کر دیں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کر سکیں کہ مولانا مرحوم کا استدلال کس قدر خلاف واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ يَنْ عَاهِدُ ثُمَّ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ وَإِنْ يَغُفَرُوا عَلَيْكُمْ
لَا يُرْتَبَرُوا فِيكُمْ إِلَّا وَلَا ذِمَّةٌ يُرْضَوُكُمْ
يَا فِرَاحِهِمْ وَتَابِي قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ
فَاسِقُونَ ○ اسْتَرَفَا يَا أَيُّهَا اللَّهُ ثَمَنًا قَلِيلًا فَضَدَّ
عَنْ سَبِيلِهِ ○ نَعَمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْلَمُونَ ○
لَا يَرْفَعُونَ فِي مَوْمِنٍ إِلَّا وَلَا ذِمَّةٌ ○ أُولَئِكَ
هُمُ الْمُعْتَدُونَ ○ قُلْ قَاتِلُوا أَقَامُوا الْقِتْلَةَ
فَاخُوا نَكْمٌ فِي الدِّينِ ○ وَنُفَعِلُ الْآيَةَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا
 فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَتِمِّمُوا الْكُفْرَ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ
 لَهُمْ لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ ۝ أَلَا تَقَاتِلُونَ قَوْمًا
 نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ
 وَهُمْ مَبَدَّوْكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ط أَنْتُمْ خَشِيتُمُوهُمْ
 قَالُوا أَهَ أَهَقُ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

(۱۳-۹)

ترجمہ :- یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا
 عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں
 جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ
 میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں
 ٹوڑا) تو (ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ
 تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے
 ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا
 ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔ ان مشرکوں
 کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ
 اگر آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لئے قرابت کا
 پاس کریں نہ کسی عہد و پیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں
 راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے
 خلاف ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو
 فاسق ہیں (یعنی راستبازی کے تمام طریقوں اور پابندیوں

سے باہر ہو چکے ہیں) ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں ایک بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالیں (یعنی ہوائے نفس کے تابع ہو گئے اور اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں کیا) پس اس کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے (افسوس ان پر) کیا ہی بُرا ہے جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں! کسی مؤمن کے لئے نہ تو قربت کا پاس کرتے ہیں نہ عہد و قرار کا۔ یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گزر گئے ہیں۔ بہر حال اگر یہ باز آئیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو (بھراں کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اٹھنا چاہیئے۔ وہ) تمہارے دینی بھائی ہو گئے ان لوگوں کے لئے جو جانے والے ہیں، ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اپنے عہد و پیمان جو خود کر چکے ہیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو بُرا بھلا کہیں تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی سوگند سوگند نہیں (اور تمہیں جنگ اس لئے کرنی چاہیئے) تاکہ یہ (علم و بد عہدی سے) باز آجائیں۔ (مسلمانو!) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کی قسمیں توڑ ڈالیں جنہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کئے اور پھر تمہارے برخلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ (اگر ڈرتے ہو تو تم مؤمن نہیں۔ کیونکہ اگر مؤمن ہو تو اللہ

اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمہارے دلوں

میں بسا ہوا۔

(تفسیر ترجمان القرآن مولانا آزاد مرحوم ص ۶۶۷۔)

ہم نے آیات مذکورہ بالا کا ترجمہ خود نہیں کیا بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ بات مشرکین کی ہو رہی ہے اور ابتداء اس فقرہ سے ہوئی ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ان مشرکین عرب میں تین طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ دوسرے وہ جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق حج کے موقع پر جب سارے مشرک قبائل کے نمائندے مکہ معظمہ میں جمع تھے اعلان کرایا گیا کہ ان لوگوں کو چار مہینے کی مہلت ہے وہ آزادی سے نقل و حمل کر سکتے ہیں اور امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن چار مہینے کے بعد مسلمان ان سے برسرِ جنگ ہوں گے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جن سے مسلمانوں کے معاہدے تھے اور انہوں نے کوئی عہد شکنی نہیں کی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ جب تک وہ اپنے معاہدوں پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ ان سے تمہاری کوئی جنگ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ بھی عہد شکنی کا ارتکاب کریں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے ان سرخنوں سے تمہیں جنگ کرنی چاہیے۔ انہی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہیں ان لوگوں سے جنگ کرنے میں کوئی چیز مانع ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں

جہنہوں نے اپنے معاہدوں کو توڑا ہے (واضح رہے کہ صلح حدیبیہ میں دس سال کے لئے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنو بکر مشرکین قریش کے حلیف تھے۔ بنو بکر نے دو سال بعد ہی بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی مگر بنو بکر نے انہیں وہاں بھی قتل کر دیا اور قریش مکہ نے عہد نامے کے خلاف بنو بکر کی امداد کی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۸ھ میں مکہ معظمہ پر لشکر کشی کرنی پڑی اور مکہ معظمہ فتح ہو گیا) اور اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکالا ہے اور جنگ میں انہوں نے ہی پہل کی ہے۔

سورہ توبہ کی ابتدائی تیس چالیس آیتیں انہیں مشرکین سے متعلق ہیں جس کا اعلان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حج کے موقع پر امیر الحج حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے کرایا تھا۔ اور یہ مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ تھا جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے:-

(مسلمانو! جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا)

معاہدہ کیا تھا، اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے

بری الذمہ ہونے کا ان کے لئے اعلان ہے کہ چار مہینے

تک ملک میں چلو پھرو (کوئی روک ٹوک نہیں) اس

کے بعد جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی۔ (۹-۴)

(ترجمان القرآن ص ۲۴۷ مولانا آزاد)

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ آیات مذکورہ بالا

کا تعلق مسئلہ ارتداد سے دور کا بھی نہیں ہے بلکہ یہ صراحتہ عرب کے مشرکین سے متعلق ہیں جنہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن مودودی صاحب اپنی کتاب ”مرتد کی سزا اسلامی قانون میں“ آیات (۱۱-۱۲) نقل فرما کر ان کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔

”پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبان طعن دلاز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید وہ اس طرح باز آجائیں۔“

یہ ترجمہ فرمانے کے بعد مودودی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :-

”یہ آیت سورۃ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ براءت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بد عہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی

ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کر لیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو اسلام قبول کر لیں۔ معاف کر دیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں۔ مدت مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو نہ ملک چھوڑا ہو، ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ توبہ کر کے ادا ئے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تہہ گار دینی بھاتی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی۔ بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنی ”اقرار اسلام سے پھر جانا“ متعین کر دیتا ہے۔ اور اس کے بعد فقط اتلوا اثمۃ الکفر کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ تخریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے“

(مرتد کی سزا اسلامی قانون میں ۹-۱۰)

آیت مذکورہ بالا میں یہ الفاظ آئے تھے وَإِنْ تَلَاَوْا اٰیٰتِنَا فَعِمِّنْ بَعْدِ عٰہِدِہٖمْ (اور اگر وہ معاہدہ کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں) مگر مودودی صاحب اس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے ”اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ

دیں: ”اس آیت کریمہ میں ”عہد“ سے مراد اگر قبول اسلام کا عہد ہے تو نَكَثُوا اَيْمَانَهُمْ سے کیا مراد ہوگا؟ مولانا گو یہ بھی بتانا چاہتے تھے کہ اقرار اسلام کا عہد کرنے کے بعد دائرۃ اسلام میں داخل ہونے کے لئے قسمیں کھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر قسمیں کھانا بھی ضروری ہے تو کتنی قسمیں کھانا ضروری ہیں؟ کیونکہ آیت کریمہ میں اَيْمَانَهُمْ جمع کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے) یہاں ایک قسم کو توڑنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ متعدد قسموں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار ہی دائرۃ اسلام میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد قسمیں کھانی بھی ضروری ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا کو اس کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا۔

اس کے بعد فَقَاتِلُوا اَیْمَةَ الْکُفْرِ کا فقرہ آیا ہے۔ اس میں فَقَاتِلُوا باب مفاعلت سے امر کا صیغہ ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا۔ لہذا قَاتِلُوا کے معنی تو یہ ہوں گے کہ ائمہ کفر بھی جنگ کریں گے اور مسلمان بھی جنگ کریں گے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ اس کے معنی ائمہ کفر کو قتل کر دینے کے تو نہیں ہیں۔ اس کے معنی تو باہمی جنگ کرنے کے ہیں۔ جنگ میں دونوں فریق ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ مرتدوں کو مسلمان قتل کریں گے اور مسلمانوں کو

مرتد قتل کریں گے۔ تو مودودی صاحب کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ مرتد تو ارتداد کے جرم میں قتل ہوں گے مگر مسلمانوں کا وہ کو نسا جرم ہو گا جس میں وہ قتل کئے جائیں گے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر طرفین کی طرف سے جنگ ہوگی تو یہ مرتدین تو محاربین بن گئے اور محاربین کو تو قتل کرنے کے ہم بھی قائل ہیں۔ زیر بحث تو وہ مرتدین ہیں جو محاربین نہیں ہیں۔ یہ آیت کریمہ بجائے مودودی صاحب کی دلیل بننے کے خود ہماری دلیل بنی جا رہی ہے۔

پھر بقول مولانا نہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی ” تو کیا جو لوگ محض تحریک ارتداد کے ہمنوا یا متبع ہوں۔ لیڈر نہ ہوں تو کیا ان کا ارتداد اس قابل ہے کہ اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اور ان کو بالکل معاف کر دیا جائے؟

اس کے بعد قرآن کریم نے ان سے جنگ کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ **لَا يَمَانُ لَهُمْ** (یعنی ان کے عہد و میثاق کا کوئی اعتبار نہیں)۔ اگر ان کا جرم صرف ارتداد ہی تھا تو قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے بے معنی اسی بات ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں حواۃ اسلام سے خارج ہونے کا اگر یہاں تذکرہ ہوتا تو قرآن کریم اس کے بجائے **لَا يَمَانُ لَهُمْ** فرماتا یعنی اب ان میں ایمان نہیں رہا۔ لیکن یہاں ایمان کا نہیں ایمان (وعدوں) کا ذکر ہے۔

آخر میں قرآن کریم نے اس جنگ کا مقصد یہ بتایا تھا کہ
لَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ (کہ شاید وہ اس طرح باز آجائیں) مولانا
کے استدلال سے یہ نظر آ رہا ہے کہ وہ جہاں لَا اِيْمَانَ لَكُمْ
اور لَا اِيْمَانَ لَكُمْ میں فرق نہیں فرما رہے ہیں۔ ایسے ہی
وہ فَقَاتِلُوا اور فَا قَاتِلُوا میں بھی کوئی فرق نہیں سمجھ رہے
لہذا اگر فَقَاتِلُوا کے یہ معنی لئے جائیں کہ ”مرتدین کو قتل
کردو“ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قتل کر دیتے جانے کے بعد
ان کے باز آ جانے کی توقع کے کیا معنی ہیں۔

پھر اس سے اگلی آیت میں دوبارہ وہی الفاظ آرہے ہیں۔
اَلَا تَقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْا اٰیْمَانَهُمْ (کیا تم ان لوگوں سے
جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دی ہیں)۔ اس میں
پھر وہی نَكَثُوْا اٰیْمَانَهُمْ کا لفظ رکھا ہوا ہے جس کے معنی
مودودی صاحب نے اقرار اسلام یا قبول اسلام کے کئے ہیں
لیکن اس کے فوراً بعد وَهَمُّوْا بِاٰخِرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهَمُّ
بَدُوِّ كُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بھی آ رہا ہے یعنی انہوں نے ہی تو رسول
کو اس کے وطن سے باہر کرنے کے منصوبے کئے تھے پھر انہوں
نے ہی تمہارے خلاف لڑائی میں پہل بھی کی تھی۔ یہاں مولانا
کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ مشرکین مکہ جنہوں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے باہر کرنے کی منصوبہ بندی
کی تھی اور جنہوں نے آپ سے جنگیں لڑنے میں پہل کی تھی۔ وہ بھی
(جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا ہے) مکہ کے مشرکین نہیں تھے۔ بلکہ

وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمان ہو جانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ کیونکہ مولانا نے مُلْکُتُوا اَیْمَانَہُمْ کا ترجمہ اس سے پچھلی آیات میں ”عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑنے“ یعنی مرتد ہو جانے سے فرمایا ہے ان الفاظ کا ترجمہ دونوں آیتوں میں وہی فرمانا چاہیے جو وہ ایک جگہ فرما چکے ہیں اور اگر وہ دونوں آیتوں میں اس لفظ کے ترجمہ میں فرق کرتے ہیں تو اس کی وجہ بھی بتانی چاہیے۔ اس آیت میں جن لوگوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا ہے انہی کے متعلق دوا و جرم بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور دوسرے یہ کہ انہوں نے تمہارے ساتھ لڑائیوں میں پہل کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جن کے متعلق قرآن کریم نے یہ تین جرائم شمار کرائے ہیں کیا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے یا شروع سے مشرک ہی تھے؟ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے وہ یہی ہے کہ یہ لوگ مشرکین مکہ تھے۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی کبھی مسلمان نہیں ہوتے تھے اگر مولانا کی تحقیق اس کے خلاف ہے تو مولانا کو اس تحقیق انیق کی پردہ کشائی بھی فرمادینی چاہیے تھی۔

(بَابُ الرَّجْمِ)

رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟ | اس کے متعلق ہم نے ایک مستقل کتاب اسی نام سے اکتوبر ۱۹۸۷ء

میں شائع کی ہے جس میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن کریم سے کسی طرح بھی رجم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہم نے اس میں سیر اور احادیث سے اسلام میں رجم کی تاریخ بیان کر کے بتایا ہے کہ زنا کے سلسلہ میں قرآن کریم میں سورۃ نور کی ایک ہی آیت میں سزا کا بیان آیا ہے۔ یعنی۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
مِائَةً جَلْدَةٍ

(۲۴)

ترجمہ: ہر زنا کار عورت اور ہر زنا کار مرد کو، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس آیت کریمہ میں الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَقَهائے حنفیہ کے اصول کے مطابق عام لفظ ہیں جو ہر زنا کار کو شامل ہیں۔ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ عورت ہو یا مرد۔ فدا ہو یا غلام۔ یہ الفاظ سب کو شامل ہیں۔ اور کلمہ عام فقہائے حنفیہ کے نزدیک قطعی ہوتا ہے جس کی تخصیص کسی غیر قطعی نص سے نہیں کی جاسکتی۔ جو احادیث رجم کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں وہ سب کی سب ظنی اور غیر قطعی ہیں ان کی وہ سے سہۃ نمود کی آیت کریمہ کو غیر شادی شدہ زانیوں کے لئے خاص نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد ادیب صالح تفسیر النصوص میں فرماتے ہیں کہ۔

وبناء علی هذا ، نقل الیہنا اجماعہ علی اجراء
 قوله تعالیٰ ”الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي“، ”السَّارِقُ
 وَالسَّارِقَةُ“، ”وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا“، ”وَذُرَّوْا مَا
 بَقِيَ مِنَ الرِّبَا“، ”وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ“، ”وَلَا
 تَقْتُلُوا الصَّيِّئَةَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ“ وقوله علیہ
 الصلوٰۃ والسلام، ”لا وصیۃ لوارث“، ”من القی
 السلاح فهو امن“ الی غیر ذلک مما
 لا یحصی علی العموم۔

(صفحہ ۶۳ تفسیر النصوص)

ترجمہ۔ اسی بنا پر فقہاء کا اجماع ہمارے سامنے

تقل کیا گیا ہے کہ آیات ذیل الزانیۃ والزانی ،
 السارق والسارقة - من قتل مظلوما - وذروا
 ما بقی من الربوا - لا تقتلوا انفسکم - ولا تقتلوا
 الصيد فانتم حرور - اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام
 کا ارشاد لا وصیۃ لوارث - من القی السلاح
 فهو امن - وغیرہ وغیرہ بے شمار آیات و احادیث ،
 سب کو عموم پر منطبق کیا جائے گا ۔

اس تصریح سے معلوم ہو گیا کہ تمام فقہاء کرام نے متفقہ
 طور پر الزانیۃ والزانی کو عام تسلیم کیا ہے بلکہ اس پر
 ان کا اجماع ہے ۔ اور عام کے متعلق حکم یہی ہے کہ وہ قطعی الثبوت
 اور قطعی الدلائل ہوتا ہے جس کی تخصیص ظنی دلائل سے نہیں
 کی جاسکتی ۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد امین صالح دمشقی آگے چل کر
 فرماتے ہیں کہ ۔

فالحنفیۃ لا یجیزون هذا التخصیص ، لان العام
 من الكتاب والسنة المتواترة قطعی فی ثبوته
 وفی دلالة ، والقطعی لا یصح تخصیصه بالظن
 قال عبد العزیز البخاری ، العام من الكتاب
 والسنة المتواترة لا یحتمل الخصوص ای لا یجوز
 تخصیصه بخبر الواحد والقیاس لانهما
 ظنیان فلا یجوز تخصیص القطعی بهما ، لان
 التخصیص بطریق المعارضة والظنی لا یعارض

القطعی - (تفسیر النصوص ص ۲۶۶)

ترجمہ :- تو حنفیہ اس تخصیص کو جائز نہیں رکھتے۔ کیونکہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کے عام کلمات اپنے ثبوت اور اپنی دلالت میں قطعی ہوتے ہیں اور دلیل قطعی کے ساتھ اس کی تخصیص صحیح نہیں ہو سکتی۔ امام عہد العزیز بخاریؒ کا ارشاد ہے کہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کا کلمہ عام خصوصیت کا احتمال ہی نہیں رکھتا۔ یعنی اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس سے جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ خبر واحد اور قیاس دونوں ظنی ہوتے ہیں تو ان دونوں کے ذریعہ سے قطعی کی تخصیص جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ تخصیص بطور معارضہ کے ہو سکتی ہے اور ظنی، قطعی کا معارض نہیں ہو سکتا۔

نیز علامہ محمد معروف دوالیبی فرماتے ہیں کہ :-

وقال الاحناف : ان العام قطعی فی دلالته ای انه یوجب الحكم قطعاً و یقیناً فیما تنولہ من الافراد۔ وقال بقول الاحناف والامام الشاطبی من المالیکیۃ واحتج الاحناف لذلك وقالوا : ان اللفظ متی وضع لمعنی کان ذلك المعنی عند اطلاقه واجبا۔ ای لانما وثابتاً بذلک اللفظ حتی یقوم الدلیل علی خلافہ۔ وقالوا منہ علی ذلك : ان "صیغۃ العموم"،

لما كانت موضوعة للدلالة على العموم، وهي فيه حقيقة. كان "معنى العموم" واجبا و ثابتا بها قطعاً حتى يقوم الدليل على خلافه۔
(المدخل الى علم الاصول الفقهية ۱۵۵-۱۵۶)

ترجمہ۔ فقہائے احناف نے کہا ہے کہ کلمہ عام اپنی دلالت میں قطعی ہوتا ہے یعنی وہ حکم کو قطعیت اور یقین کے ساتھ واجب کر دیتا ہے ان تمام افراد میں جن کو وہ شامل ہو۔ اور فقہائے احناف کے قول کے مطابق یہی مالکیہ میں سے امام شاطبیؒ نے بھی فرمایا ہے۔ اور احناف نے اس کے لئے دلیل قائم کی ہے اور کہا ہے کہ لفظ جب کسی معنی کے لئے وضع کیا جائے تو اس کو بولنے کے وقت وہ معنی اس کے لئے واجب یعنی اس لفظ کے ساتھ لازم اور ثابت ہوتے ہیں جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل ہی قائم نہ ہو جائے۔ اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے فرمایا ہے کہ عموم کا صیغہ جبکہ عموم پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے یہ معنی حقیقی ہیں تو عموم کے معنی اس کے ساتھ واجب اور ثابت ہوں گے حتیٰ کہ کوئی دلیل اس کے خلاف پر قائم ہو جائے۔

ہمارے فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کتاب اللہ کے عام کی تخصیص خبر واحد سے تو نہیں ہو سکتی لیکن خبر مشہور سے ہو سکتی ہے اور رحم کی احادیث خبر واحد نہیں

ہیں بلکہ خبر مشہور میں جس سے کتاب اللہ کے عام کو خاص کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے کتاب اللہ پر زیادتی بھی کی جاسکتی ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس اصول کی تائید نہیں کر سکتے کیونکہ خبر مشہور اپنی اصل کے اعتبار سے خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ خبر واحد سے بھی کمتر ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

والمشہور مالہ طرق محصورة باكثر من اثنين
وقد يبلغ حد التواتر، ای لم یفد بمجرد
العلم۔ وهو المستفیض علی دای جماعۃ من
ائمة الفقهاء، وقیل المستفیض یکون طرفیه
ووسطه سواء، والمشہور اعم من ذلک
وقد یطلق المشہور علی ما اشتهر علی
اللسنة مطلقا، ای وان لم یکن له اسناد
واحد۔ (من قفوالاثر)

(قواعد فی علوم الحدیث ص ۳۲)
ترجمہ: مشہور وہ حدیث ہے جس کی دو سے زیادہ
محدود سندیں ہوں اور تواتر کی حد تک نہ پہنچتی ہوں۔
یعنی محض اس سے علم کافی نہ حاصل نہیں ہو سکتا۔
ائمہ فقہاء کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق وہ
مستفیض (جس کی دو سندیں ہوں) ہی ہوتی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے طرفین اور درمیان برابر ہوں (یعنی جس کے ہر دو پہ میں دو زناوی ہوں) اور مشہور اس سے عام ہے اور کبھی مشہور کا اطلاق اس حدیث پر بھی کر دیا جاتا ہے جو لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہو گئی ہو، خواہ اس کی ایک سند بھی نہ ہو۔ (قفوا لاثراً ص ۴۷)

درس نظامی میں داخل اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار میں ہے:-

کالمشہور وهو ما کان من الاحاد فی الاصل
ای فی القرن الاول وهو قرن الصحابة ثم
انتشر حتی ینقله قوم لا یتوهم تواطؤهم
علی الکذب وهو القرن الثانی ومن بعدہم
یعنی قرن التابعین و تبع التابعین ولا اعتبار
للسهرة بعد ذلک فان عامة اخبار الاحاد
قد اشتهرت فی هذا الزمان فلم یبق
شیء منها احاداً وانہ یوجب علم طمانینہ
ای اطمینان یرجح الصدق فهو دون المتواتر
وفوق الواحد۔ (نور الانوار ص ۱۷۶-۱۷۷)

ترجمہ:- مثلاً مشہور اور وہ دراصل اخبار احاد ہی
میں سے ہوتی ہے یعنی قرن اول میں اور وہ صحابہؓ کا
عہد ہے۔ پھر وہ پھیل جاتی ہے حتیٰ کہ اسے ایک قوم نقل

کرنے لگتی ہے جن کے جھوٹ پر اتفاق کا وہم نہ کیا جاسکے
 یہ شہرت قرن دوم اور اس کے بعد حاصل ہوتی ہے یعنی
 تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں اور اس کے بعد
 کسی شہرت کا اعتبار نہیں کیونکہ اس زمانہ میں تو تمام
 احادیث ہی مشہور ہو چکی تھیں اور کوئی بھی حدیث تبع تابعین
 کے عہد کے بعد خبر واحد نہیں رہی۔ اس قسم کی احادیث
 سے علم طمانینت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرح کا اطمینان
 حاصل ہو جاتا ہے جو جہت صدق کو ترجیح دیدیتا ہے۔
 یہ خبر مشہور متواتر سے کم اور خبر واحد سے زیادہ ہوتی
 ہے۔

اسی کے حاشیہ پر محشی نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب
 نخبة الفكر اور شرح نخبة الفكر سے نقل کیا ہے کہ :-

وهو ما كان من الاحاد في الاصل اى كان رواية
 من الصحابة اقل من عدد التواتر واحدا كان
 طويلا او اكثر - وهو على راي الاصوليين
 واما على راي اهل الحديث فالسنة قسمان
 متواتر وهو ما يكون له اسانيد كثيرة - بالاحص
 عدد معين والعادة احالت تواتر هو على
 الكذب وخبر الواحد وهو ما لا يكون كذلك -

(حاشیہ نور الانوار ص ۶۷)

ترجمہ :- مشہور و دراصل اخبار آحاد ہی میں سے ہوتی

ہے یعنی اس کی صحابہ سے روایت عدد تو اتنے سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا راوی ایک ہی ہوتا ہے یا زیادہ مشہور حدیث کا وجود اہل اصول کی رائے پر ہے۔ لیکن اہل حدیث کی رائے کے مطابق سنت کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک تو متواتر یعنی جس کی سندیں بہت ہوں۔ عدد معین کے حصر کے بغیر کہ عادت ان سب کے جموٹ پر اتفاق کونا ممکن سمجھتی ہو۔ اور دوسرے خبر واحد۔ اور خبر واحد وہ ہے جو ایسی نہ ہو۔

ان تصریحات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ محدثین تو حدیث مشہور کا وجود ہی تسلیم نہیں فرماتے اور جو اہل اصول اور فقہاء حنفیہ مشہور حدیث کا وجود تسلیم فرما رہے ہیں وہ بھی اس کا اعتراف فرما رہے ہیں کہ حدیث مشہور دراصل خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تابعین یا تبع تابعین کے عہد میں پھیل جاتی ہے۔ کسی بات کا پھیل جانا اور زبان زد عوام ہو جانا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ موضوعات کی کتابوں میں آپ کو ہزاروں ایسی حدیثیں ملیں گی کہ وہ آج تک زبان زد عوام ہیں اور لوگ انہیں ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھتے ہوئے ہیں مگر وہ موضوع اور من گھڑت ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ بعض مرتبہ اس حدیث کو بھی مشہور شمار کر لیا جاتا ہے جو زبان زد عوام ہو گئی ہے اور اس کی ایک بھی سند نہیں ہے۔ یعنی وہ خبر واحد سے بھی گزری ہوئی ہے۔

اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا ایسی حدیثوں سے قرآن کے عام کی تخصیص اور کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہو سکتی ہے ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم اس کی تائید کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں رکھتے حضرات فقہائے حنفیہؒ شکر اللہ سعیم کی جانب ایسی غلط بات کی نسبت ہمارے نزدیک درست نہیں۔

بہر حال ہم نے اپنی کتاب ”رجم اصل ہے یا تعزیر؟“ میں ان تمام عنوانات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحت تک قرآن کریم میں زنا کی سزا کا حکم نازل نہیں ہوا تھا توورات کی متابعت میں چند مجرموں (مثلاً ماعز اسلمی، غامدیہ اور عیینہ) کو رجم فرمایا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سورۃ نور کی آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں، بہ سند اسحاق، خالد شیبانی کہ شیبانی نے کہا کہ میں نے عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو سنگسار فرمایا تھا۔ انہوں نے فرمایا، ”ہاں“ میں نے پوچھا کہ کیا ”سورۃ النور کے نازل ہونے سے پہلے یا نازل ہونے کے بعد؟“ آپ نے فرمایا — ”یہ بات مجھے معلوم نہیں۔“

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مفسرین نے مکی اور مدنی سورتوں کی حوالہ دہی کی تفسیر کی ہے وہ ہماری تمام بڑی بڑی تفسیروں میں مذکور ہے اس کے مطابق مدنی سورتوں

کی کل تعداد اکتیس ہے۔ ان کی ترتیب نزول میں اِذَا جَاءَ
نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ کا اٹھارھواں نمبر ہے۔ سورۃ النور کا
انیسواں نمبر ہے اور سورۃ الحج کا بیسواں نمبر ہے۔

(ملاحظہ ہو النظرات فی القرآن للشیخ محمد الغزالی ۲۵۵-۲۵۶)
طبع دوم مصر اور الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۶۳ ناشر دار الفکر
مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی)۔

حج متفقہ طور پر ۱۰ شعبہ میں فرض ہوا ہے۔ لہذا سورۃ الحج
۱۰ شعبہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ
جس میں بقول حضرت عمرؓ و حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے فتح مکہ کے بعد نازل
ہوئی ہے۔ فتح مکہ ۱۰ شعبہ میں ہوئی ہے۔ ان دونوں کے درمیان
میں سورۃ النور نازل ہوئی تھی۔ لہذا اس کی تاریخ نزول لامحالہ
۱۰ شعبہ کا آخر یا ۱۱ شعبہ ہونا چاہیے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کی حیات کا آخری عہد ہے۔ جب تک یہ بات پایہ ثبوت کو
نہ پہنچ جاتے کہ ۱۰ شعبہ میں سورۃ النور کی آیات نازل ہونے کے
بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے۔ اس وقت تک رجم کی سزا کو
اسلامی سزا قرار دے لینا صریحاً زیادتی ہے۔ کیونکہ رجم میں ایک
مسلمان کی جان لینے کا سوال ہے اور کسی ایسی دلیل سے جس میں
ذرا بھی شک و شبہ کیا جاسکے ایک مسلمان کی جان نہیں لی جاسکتی۔
ویسے بھی حدود شہادت سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ لہذا روایات
اور اخبار احاد سے ایک مسلمان کی جان سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قرآن کریم میں زنا سے متعلق جتنی آیات کریمہ ہیں ان سب سے رحم کے ثبوت کے بجائے جہم کی نفی ہی کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ تفصیل کے لئے اسی کتاب کا باب الزنا ملاحظہ ہو۔

آخر میں ہم اس باب کو علامہ محمد سلام مدکور، استاذ الشریعہ بطنیہ محققہ (القابوہ) کے ایک اقتباس پر ختم کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے دور کے محقق علماء کا اس مسئلہ میں نقطہ نظر کیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں :-

یہ سزا عزت و آبرو پر زنا کے ساتھ زیادتی کرنے پر دی جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کا

کوٹھن کی سزا

ارشاد ہے :-

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
مِائَةَ جَلْدَةٍ۔

(۲۴)
ترجمہ :- زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سٹو کوڑے مارو۔

خوارج کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آیت غیر شادی شدہ زانیوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور شادی شدہ زانیوں کی سزا سنگسار کرنا ہے حتیٰ کہ وہ مرجائیں۔ انہوں نے اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور قولی روایات سے استدلال کیا ہے۔ لیکن خوارج کی رائے یہ ہے کہ قرآنی نص عام ہے اور اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا سٹو کوڑے مارنا ہے اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انہوں نے اس پر ہر طرح کی دلیلوں سے استدلال لے لیا اور ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے کہ آیت وَاللَّا فِي يَاتَيْنِ الْفَاحِشَةِ

کیا ہے۔ جنہیں امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں جو کچھ پیش آیا وہ برسبیل سیاست اور از روئے تعزیم ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے عام شرعی حکم نہیں تھا۔

پھر اخبار آحاد سے اس جیسی حدود قائم نہیں کی جاسکتیں اور یہ کہنا کہ قرآن کریم میں رجم کا حکم نازل ہوا تھا لیکن وہ آیت منسوخ ہو گئی مگر اس کا حکم باقی ہے قطعاً محل نظر ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آیت جو بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے تو اس کی تلاوت منسوخ کر دی مگر ہم اس آیت کا حکم برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ (المدخل للفقہ الاسلامی لمحمد سلام مکرور ۷۳۶-۷۳۷)

تِسَاءُ مَكَّةَ (۵۴) [اور جو عورتیں تم میں سے فاحشہ کی مرتکب ہوں] سحاق (چٹی) کے لئے مخصوص ہے جو دو عورتوں کے درمیان رو نما ہوا اور آیت وَالَّذَانِ يَأْتِيَانِيَا مِنْكُمْ فَإِذَا فُهِمَا (۵۵) [اور جو دو مرد تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو انہیں اذیت دو] لواطت کے ساتھ مخصوص ہے جس میں دو مرد ملوث ہوتے ہیں۔ اور آیت الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي (۵۶) [زنا کار عورت اور زنا کار مرد] اس فعل زنا کے ساتھ مخصوص ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ان کے اشتراک سے رو نما ہو۔ اس طرح امام ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک عزت و آبرو سے متعلق سزا مکمل ہو جاتی ہے (دو تینوں صورتوں کا حکم واضح ہو جاتا ہے)۔ اس طرح یہ تینوں آیتیں محکم ہیں اور ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔